OSMANIA UNIVERSITY
Checked 1975
مجلّۂ عثمانیہ
سیّد علی محمد موسوی ام۔ اے (آخری)
مہتمم نایر
...ید افضل الدین خاں بی۔ اے (عثمانیہ)
سیّد محمد اشہد خاں بی۔ اے (عثمانیہ)

مجلہ عثمانیہ

(جلد ۱۵ شمارہ ۱ و ۲)

طلبہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مہتمم مُدیر

سید علی محمد موسوی ام۔اے (آخری)

مدیرین

سید فضل الدین خاں
بی۔اے (عثمانیہ)

سید محمد اشہد خاں رضوی
بی۔اے (عثمانیہ)

مطبوعہ

اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پرنٹرز حیدرآباد دکن

صدر

مولوی قاضی محمد حسین صاحب
ام۔اے۔ال ال۔بی (کنٹب)
نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ

مشیر حصہ اردو

ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ ام۔اے۔پی ایچ۔ڈی۔(لندن) پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

مشیر حصہ انگریزی

ڈی۔یس کرشنن صاحب ایم۔اے (آکسن) لکچرار انگریزی جامعہ عثمانیہ

خازن اعزازی

مولوی وحید الرحمن صاحب۔بی۔ایس سی۔پروفیسر طبعیات جامعہ عثمانیہ

معتمد

سید علی محمد موسوی ام۔اے (آخری) مہتمم مدیر و مدیر حصہ انگریزی

اراکین مجلس انتظامی

محمد عاقل علی خاں صاحب بی۔اے صدر انجمن اتحاد
سید افضل الدین خاں صاحب بی۔اے مدیر حصہ اردو
سید محمد اشہد خاں صاحب رضوی بی۔اے مدیر حصہ اردو
میر حامد علی صاحب بی۔ایس سی۔نائب مدیر حصہ انگریزی

مجلس مشاور

مولوی قاضی محمد حسین صاحب

ام۔ اے۔ ال ال بی (کنٹب)

نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ

مشیر حصۂ اردو

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ام۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ (لندن) پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

مشیر حصہ انگریزی

وی۔ ایس۔ کرشن صاحب ام۔ اے (آکسن) لکچرار انگریزی جامعہ عثمانیہ

خازن اعزازی

مولوی وحید الرحمٰن صاحب بی۔ ایس سی۔ پروفیسر طبیعیات جامعہ عثمانیہ

اطلاع

(۱) تمام مضامین نظم و نثر مدیرین متعلقہ کے نام دفتر مجلہ عثمانیہ کے پتہ پر روانہ کئے جائیں۔
(۲) خریداری اور دیگر امور کے لئے مہتمم مدیر مجلہ عثمانیہ سے مراسلت کی جائے۔
(۳) چندہ کی تمام رقمیں خازن اعزازی مجلہ عثمانیہ کے نام دفتر کے پتہ پر روانہ کی جائیں۔

چندہ

(۱) موجودہ طلباء جامعہ عثمانیہ سے .... للعہ
(۲) طلباء قدیم و اساتذہ جامعہ عثمانیہ سے .... صمہ
(۳) عام خریداروں سے .... لے
(۴) فی شمارہ .... عال

سالانہ اخراجات ڈاک حسب ذیل ہونگے اور بصورت منی آرڈر اخراجات ڈاک میں کمی ہوگی

۱۔ بذریعہ رجسٹری ایک روپیہ آٹھ آنے کلدار ۱۳؍ سکہ عثمانیہ۔
۲۔ بذریعہ سرٹیفکیٹ آف پوسٹنگ اور پہلے نمبر کی وی پی کے اخراجات ۱۴؍ کلدار ۲؍ سکہ عثمانیہ۔
۳۔ بذریعہ بک پوسٹ ۹ آنے کلدار ۶ آنے سکہ عثمانیہ

ارشاداتِ ہمایونی

حضرت بندگانِ عالی مدظلہ العالی

مشورۂ نیک برائے طلبائے عثمانیہ یونیورسٹی

در خیال ما برائے اینہا دوران حصولِ تعلیم حصہ در امورِ سیاسی مُلک گرفتن (یعنے در پالیٹکس) مُفید نہ باشد کہ ہرچہ نتائج آن در مماثلِ مُقدمات خواہ اندرون مُلک باشد یا بیرون بہ وقوع آمدہ اند و آن ہم از چشمِ ایشان پوشیدہ نیست بلکہ عالم آشکارا نظر بر آن این ہا را لازم کہ قبلِ اختیار کردن امرے برمالہٗ و ماعلیہ آن نظرِ غائر بہ دارند تا کہ پشیمانی غلط اقدام دامنگیر ایشان نہ شود!! آرے این ممکن است کہ بعد حصولِ تعلیم اگر این ہا خود را قابل ثابت کردہ در امورِ متذکرۂ صدر شرکت بہ کنند و آن ہم با حزم و احتیاط و ہم با فراست و دانشمندی کہ شیوۂ ہمہ عقلا و مُدبرینِ جہان است (یعنے ہلتھی پالیٹکس) مضائقہ نباشد بشرطیکہ ہر شئے اندرون حدودِ معینہ باشد و ہم اختیار کردہ بعد غور و خوض بسیار کہ واقعیٔ رہ نوردی در این کوچۂ پُرخار آسان نیست بلکہ خیلے دشوار و ہم ایشان باید دانست کہ بغیر آمدِ بہار صبا در چمن جلوہ خرامی نہ نماید و ہم بر طرف دیگر گلہائے نوع بہ نوع تبدیلِ لباس نہ کنند تا وقتیکہ لوازمۂ بساطِ گلزار بہ احسن الوجوہ مہیا نہ باشد ورنہ کسے خواہشمندِ نظارۂ منظرِ خوش نخواہد شد و این ہمہ اسباب از "فیضان قدرت" پیدا می شوند تا کہ آبیاری و شادابیٔ چمن مفقود نہ شود بلکہ بر جائے خود بر پایۂ استوار باقی ماند۔

طبع شدہ

در اخبار صبح دکن ششم ماہ ذیقعدہ سنہ ۱۳۶۰ ہجری

کلیہ مسلمہ دنیا

آنان کہ در دماغ خود مادۂ تکبر و نخوت می دارند یا جلب منفعت پیش نظر ایشان باشد یا خود را عادیٔ زندگیٔ عیش و عشرت ساختہ اند یا قلوب ایشان از خدمت بنی نوع انسان خالیست یا از جوہر ہمدردی و اعانت محروم۔ ہرگز در مقاصد خود کامیاب نمی شوند یا خود را برائے خدمت خلق اللہ اہل ثابت نمی کنند و اصل سبب ناکامیٔ این امور فقدان استقامت مذہب و ہم عقاید باشد و ہم قصور ہمت و جرأت در تکمیل امور دنیوی کہ حق و صداقت چہ چیز ہست ازان یک لخت آن ہا نا آشنا کہ نتیجہ اش بجز این چیزے دیگر نیست کہ در راہ ظلمت منزل مقصود را تلاش کنان سرگردان می باشند ازین سبب گفتہ اند کہ "آب حیوان" را بدست آوردن آسان نیست بجز رہنمائی خضر یا این آن در شہوار است کہ در قعر دریا بہ بطن صدف نشستہ است و تا وقتیکہ غواص جوہر شناوری نہ نماید آن در کفش نمی آید کہ بغیر زحمت نوالہ ہم در دہان نمی رسد۔

خلاصہ اینکہ انسان را باید کہ حتی الامکان اوصاف برگزیدہ در خود پیدا کردہ دعویٔ نشستن در صف صاحبان ضمیر و کردار بہ کند ورنہ بغیر این شرط دعویٔ او بلا تدلیل ہیچ وقعت نزد منصف مزاجان یا عقلائے جہان نمی دارد۔

بہ بہ چہ کلیۂ زرین است !!

طبع شدہ در اخبار نظام گزٹ یازدہم ذی قعدہ سنہ ۱۳۶۱ ہجری

مسئلہ علم و فضل

لاریب کہ این شیئے گران بہاست و صرف در حصۂ آن ہا (بہ حصۂ رسدی) می آید کہ فطرتاً برائے این "عطیۂ قدرت" مخلوق گشتہ اند و بہ طرفِ دیگر تکمیلِ ہمہ امورِ دینی باشند یا دُنیوی بر آن منحصر از این سبب گفتہ اند کہ انسان بغیرِ علم و فضل و ادراکِ ما فیہا از صفتِ انسانی متصف نمی شود (در صحیح مفہوم) و ہم خدا و رسول را نمی شناسد و آنچہ فرایض کہ بر دوشِ او عاید اند بجائی ایشان از او ناممکن تا وقتیکہ شعورِ نزاکتِ آن ہا بہ ذاتِ خود نمی دارد۔

خلاصہ اینکہ این آن شیئے کمیاب ہست کہ در حصولِ آن تگ و دو بسیار کردنیست تا آنکہ او در دامنِ مراد بہ افتد۔ دیگر از علم و فضل منصب یا منزلتِ انسان شناخت کردہ شود کہ او چہ پایہ درمیان ابنائے جنس یا بنی نوع انسان می دارد الحاصل ضرورتِ علم و فضل در این دُنیا از حد ضروریست خصوصاً ما می بینیم کہ حالاتِ عالم را چہ تغیّر دامن گیر شدہ است و ہم بہ چہ رنگ واقعاتِ گیتی قلابازیان می خورند کہ در این سیلاب صرف اقدامِ آن گروہ بر جادۂ استقامت می مانند کہ دل و دماغ ایشان از ضیائے علم و فضل منور ہست و ہم آن ہا مادۂ غور و فکر یا بالغ نظری در فن رائے زنی بر امورِ متنوعہ می دارند ورنہ ممکن نیست کہ از گرداب انتشار ایشان رہائی یابند کہ طوفانِ باد و باران بہ شدّ و مد نمودار شدہ است کہ کشتی بانی بہ پیشِ این موانعات خیلے دشوار می نماید لہٰذا ضرورت است کہ بہ عقل و تدبیر کار کردہ زورق را بہ ساحلِ سلامتی بہ رسانند و این خدمتِ مدبرین یا عقلائے جہان است۔

طبع شدہ در اخبار صبح دکن چہار دہم ذی قعدہ سنہ ۱۳۶۰ ہجری

فہرست مضامین مجلّہ عثمانیہ

جلد (۱۵) شمارہ (۱ و ۲)

اداریہ

مجلہ کا یہ شمارہ کچھ تاخیر سے شائع ہو رہا ہے آپ کو یقیناً شکایت ہوگی لیکن میں خود اس کا کم شاکی نہیں ہوں وجہ تاخیر ایک طرح مصرع بن گیا ہے جس پر ہر مدیر ایک نئی گرہ لگاتا ہے۔ اگر آپ مجلہ کے گذشتہ تمام شماروں کا جائزہ لیں تو اس ردیف کا ایک خاصہ دیوان بن جائیگا تشبیہات اور استعاروں سے قطع نظر حقیقت یہ ہے کہ تاخیر کی شکایت سب سے زیادہ ان لوگوں کو ہوتی جن کے کندھوں پر یہ گراں بار ذمہ داری ڈالدی جاتی ہے۔ اگر شکایت موقتی ہو تو اس کی وجہ بھی عارضی ہوتی ہے لیکن بنیادی خرابی کو کیا کیجئے ؟ "جائزہ وقت پر نہیں ملا" یہ آپ ہر اداریہ میں پڑھتے آئے ہوں گے۔ اگر میں اسی کو اساس قرار دوں تو غالباً آپ "عذر لنگ" سمجھیں لیکن واقعات پھر بھی واقعات ہیں۔ جائزہ ملا تو کالج بند ہو گیا پھر مضامین ملیں تو کیوں کر! طباعت کے انتظامات ہوں تو کس طرح! اور مجلہ وقت پر شائع ہو تو کیسے! آپ کیا منحصر ہے بلکہ انتظامی الجھنوں کا پردا وا کیجئے تو آپ کو ایک مستقل ڈرامہ نظر آئے گا۔ ان حالات میں غور کیجئے "شکایت کس کو ہونی چاہئے اور وجہ تاخیر کون بیان کرے !!!

مضامین کی اشاعت میں تنوع کا پورا خیال رکھا گیا ہے مختصر سے وقت اور چھٹیوں کے زمانے میں مختلف موضوعات پر جتنے عمدہ مضامین دستیاب ہو سکے تھے پیش کئے جا رہے ہیں۔ دوسری جامعات کا تو حال نہیں معلوم لیکن ہماری جامعہ کے لئے "چھٹیاں" ذہنی جمود کا موسم ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ طلبائے جدید کے ذہنی نقوش اس شمارہ میں اتنے اُجاگر آپ کو نظر نہیں آ رہے ہیں میں نے اپنی والی کوشش اُٹھا نہ رکھی "اعلانات" دعوت نامے تو ایک طرف شخصی اپیلیں بھی بیکار گئیں۔ پھر بھی جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے

مجھے یقین ہے کہ ان نقوش کی تائیدگی کچھ کم نہیں ہے۔

میری اور مجلہ عثمانیہ کی یہ بڑی سعادت ہے کہ محترم استاد ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کا مضمون "اصل مکتوبات نبوی بنام نجاشی" سے اس شمارہ کا افتتاح ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی جدید علمی تحقیقات سے نہ صرف طلبائے جامعہ عثمانیہ بلکہ سارا ہندوستان مستفید ہو رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا علمی ذوق ایک ذہنی عطیہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بلند پایہ علمی تحقیقی مقالے اس سے قبل بھی مجلہ عثمانیہ میں شائع ہوتے رہے ہیں لیکن اس مضمون کی نوعیت تاریخی ہے۔ اس کی اشاعت سے اسلامی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو رہا ہے۔ خدا کرے کہ ڈاکٹر صاحب کی ان علمی تحقیقات سے تمام برادران جامعہ مستفید ہوں۔

"علمیات" ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب کے مقالہ کا تیسرا حصہ ہے "جمالیات اور ادب" عبدالقیوم خاں صاحب باقی کے عمیق مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ علمی نقطہ نظر سے ان مضامین کی اہمیت آپ اسی وقت محسوس کریں گے جب کہ آپ ان کا بہ نظر عمیق مطالعہ فرمائیں۔ ہمارے برادر قدیم مسٹر اکبر وفاقانی کا ایک "حسن کار" مضمون "اجنٹہ کی عورت" کی اشاعت سے مجلہ کا یہ شمارہ مزین ہو رہا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ شعر کہنا آسان ہے لیکن سمجھنا مشکل یہ قول نہ صرف شاعری بلکہ فنون لطیفہ کی تمام اصناف پر صادق آتا ہے "حسن کاری" آسان ہے لیکن "حسن فہمی" مشکل اور اس کی تفہیم "مشکل تر" یہ کام صرف اہل نظر کا ہے بے مبالغہ نہیں ہے کہ وفاقانی صاحب عثمانیین میں ایک ہی "حسن فہم" ہیں۔

ہم وجد، ساز، اور بیکش کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اپنی طبع زاد نظمیں روانہ کیں۔ اس شمارہ میں تین افسانے شائع کئے جا رہے ہیں۔ "بھوت" رشید قریشی صاحب کا طبع زاد افسانہ ہے "آس" اور "تھرما میٹر" اردوائے ہوئے افسانے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ ان کی دلکشی طبعزاد افسانوں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔

مرزا ظفر الحسن کا " ڈرامہ " شریک اشاعت ہے۔ اس ڈرامے میں انسانی فطرت کے بعض خامیوں کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ مرزا ظفر الحسن کی کردار نگاری کا اندازہ آپ کو ان کا ڈرامہ پڑھنے کے بعد ہو سکے گا جذبات نگاری میں آپ کو اچھی مہارت اور طلبہ قدیم میں طرز نگارش کے میدان میں خاص مقام حاصل ہے۔

عثمانین کی جمعیت

"حیدرآباد بلند ہوگا اور عثمانیہ کے ہاتھوں بلند ہوگا" یہ اپنی ستائش نہیں ہے ایک حقیقت کا اظہار ہے اور وہ بھی ایک دیرینہ تجربہ کار کی زبان سے یہ ہمارا نصب العین ہے اور مسلک بھی۔ جامعہ کے اندر رہ کر ہم اپنے آپ کو اس مسلک کے لئے تیار کر رہے ہیں اور جو باہر جا چکے ہیں وہ اس مسلک کے لئے کام کر رہے ہیں۔ ان کام کرنیوالوں کی ایک چھوڑ دو دو تنظیمیں موجود ہیں جن حالات میں ان تنظیموں کی ابتدا ہوئی اور اب تک جو کچھ کام انھوں نے کیا اس پر اس وقت کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں ممکن ہے اُس وقت ان کی ابتدا بھی ٹھیک ہو اور ان کی خدمات بھی لیکن موجودہ حالات میں ہم عثمانین کی ایک عظیم الشان جمعیت کو جو میدان عمل میں قدم رکھ چکی ہے دو جماعتوں میں منقسم دیکھتے ہیں۔ اس تقسیم کی تاریخ سے ہمیں بحث نہیں لیکن واقعہ ہے کہ نہ صرف یہ جمعیت منقسم ہو چکی ہے بلکہ اس کی قوت بھی بٹ گئی ہے! اس انتشار کا سبب تلاش کرنا کچھ دشوار نہیں ہے "جماعتی سیاسیات" کے "کھلونے" نے دو اچھے خاصے ہوشیار اور بالغ نظر بھائیوں کو آپس میں ایک دوسرے سے گتھم گتھا کر رکھا ہے نتیجہ یہ ہے کہ اب نہ اس ہی مسلک یاد ہے اور نہ نصب العین معلوم ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ جماعتی سیاسیات کو شجر ممنوعہ سمجھا جائے۔ جو لوگ علمی زندگی میں داخل ہو چکے ہیں انھیں نہ اس سے روکا جا سکتا ہے اور نہ روکا جانا چاہیئے عثمانیین کی حقیقت سے جماعتی سیاسیات میں حصہ لینا نہ صرف ملکی سیاسیات کو گھناونا بنانا ہے بلکہ عثمانی شخصیت کو ختم کر دینا ہے۔ ہمارے سامنے جماعتی سیاسیات کے مسائل سے کہیں زیادہ اہم مسئلہ موجود ہے۔ جامعہ کی تعلیم ختم کر کے جو عثمانی عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے۔ اس کو یہ احساس بھی نہیں ہونے پاتا کہ وہ اس پر شوکت جمعیت کا ایک رکن ہے جس کے ہاتھوں "حیدرآباد بلند ہوگا"۔ زندگی کے صبر آزما منازل کو طے کرتے ہوئے وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس جمعیت کی طرف دیکھتا ہے لیکن اس کی نظریں مایوس لوٹ آتی ہیں۔

"حیدرآباد کب بلند ہوگا"؟ جب اس کی تعمیر عثمانیئن کے ہاتھوں ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے بڑے بھائیوں نے اس تعمیر میں عثمانیئن کو حصہ دلانے کی کتنی کوشش کی؟ عہدۂ ملازمین

معاشی مسئلہ ضرور ہیں لیکن عثمانیین کے لیئے وہ حیدرآباد کی بلندی کا ایک ذریعہ ہیں۔ کیا یہ وقت نہیں ہے کہ ہمارے بڑے بھائیوں کی یہ دو تنظیمیں جماعتی سیاسیات کے کھلونے کو توڑ پھوڑ کر عثمانیین کے معاشی مسئلہ کو حل کرنے اور اس کے ذریعہ ملک کے اس بلند ترین نصب العین کو حاصل کرنے کے لیئے ایک متحدہ محاذ تیار کریں۔ یہ متحدہ محاذ اور ہماری یہ جمعیت حیدرآباد کی تقدیر ہے۔

طلبہ کی مرکزیت اس سے کسی کو اختلاف نہیں ہوگا کہ "جماعتی شعور" ایک **قوت محرکہ** ہے اور علمی فضا میں اس کی سخت ضرورت ہے۔ جامعہ کی چار دیواری میں رہ کر ہم "کتاب خوان" تو بآسانی بن سکتے ہیں لیکن "صاحب کتاب" ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے! اقبال نے شاید اسی لیے "خداوندان مکتب" سے شکایت کی ہے لیکن ہمیں اپنے آپ سے شکایت ہے ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ علم نہ صرف جزو زین ہے بلکہ **جزو زندگی** بن جائے۔

کرم کتابی بن کر یوں زندہ رہنے کو تو ہم رہ سکتے ہیں لیکن جب تک ہم عثمانیین کی ایک "جمعیت" نہ بن جائیں "حیدرآباد کا بلند ہونا" ایک خواب ہے جو کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوگا۔ کرم کتابی سے ہم "صاحب کتاب" کیسے بن سکتے ہیں؟ بالفاظ دیگر وہ کون قوت محرکہ ہے جو علم کو ہماری زندگی میں پیوست کر دے؟

جماعتی شعور انسانی تجربات کا یہ جواب ہے اس شعور کو کس طرح مجسم کیا جائے؟ یہ ہم طلبا کے حل کرنے کا مسئلہ ہے کچھ دنوں قبل اس کی تجسیم عمل میں آچکی تھی اور یہ اب بھی موجود ہے۔ علمی مسئلہ تجسیم و تشکیل کا نہیں نشاط ثانیہ کا ہے سب جانتے ہیں کہ طلبا کے اسی تعلیمی شعور کو بیدار کرنے اور اس کو ترقی دینے کے لئے طلبا برادری کا ایک ادارہ آٹھ سال سے قائم اور کارگزار ہے۔ ضرورت ہے کہ اسی ادارہ کے ذریعہ ہم اپنی اجتماعی آواز کو علمی فضا میں موثر بنائیں۔

کلیہ جامعہ عثمانیہ اپنی خوش نصیبی پر جس قدر بھی ناز کرے کم ہے کہ اس کے فرزندان معنوی جہاں کہیں جاتے ہیں اپنے علمی ذوق و شوق اور فطری صلاحیتوں کا غیر معمولی ثبوت دیا کرتے ہیں۔ آپ کو زیر نظر

شمارہ میں محمد علی صاحب نیر کے دو قطعات نظر آئیں گے، جو ان کے ایک مختصر سے نوٹ کے ساتھ تاثرات کا اظہار کر رہے ہیں، مولوی احمد خاں صاحب بی اے (عثمانیہ) متعلم ال ال بی (آخری) (علیگ) سابق مہتمم مدیر مجلہ عثمانیہ اپنی ٹھوس قابلیت اور گوناگون علمی امتیازات کی وجہ عثمانی برادری کے لئے محتاج تعارف نہیں ہیں۔ آپ نے جامعہ کے وقار کو قائم رکھنے اور طلبہ برادری کی بہبود میں وہ سچی اور خاموش خدمت کی ہے جس پر یہ برادری بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ گو موجودہ دور میں پروپیگنڈے کے عارضی اثر سے انسان تولا نہیں جا سکتا البتہ صرف شمار سے مرتبہ پا سکتا ہے جس کے ذریعہ سے عارضی کامرانی بھی نصیب ہو جاتی ہے مگر اصلیت بھی بغیر رنگ لائے نہیں رہ سکتی۔

مولوی احمد خاں صاحب نے مسلم یونیورسٹی میں اپنی قابلیتوں اور صلاحیتوں کو کچھ اس طرح اجاگر کیا کہ وہاں کے واقعات اور ماحول کا اندازہ کرتے ہوئے حیرت ہوتی ہے۔ آپ نے نہ صرف بڑے بڑے تقریری مقابلے جیتے جو ہندوستان کا "صحیح معیار" سمجھے جاتے ہیں بلکہ مسلم یونیورسٹی کی کل ہند بین جماعتی مقابلوں میں نمائندگی کی یہی نہیں ہوا بلکہ بیرونی جامعات میں بھی بحیثیت نمائندہ آپ ہی کو منتخب کیا گیا۔ ہم موصوف کو ان کامیابیوں پر ان کی خدمت میں تحفہ مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

اس سال جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر ہماری مادر علمیہ کی جانب سے عالیجناب نواب مہدی یار جنگ بہادر اور ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی کو ڈاکٹریٹ کی امتیازی ڈگریاں دی گئیں۔ نواب مہدی یار جنگ بہادر (آکسن) اپنے دیرینہ تعلیمی تجربوں کا لحاظ کرتے ہوئے ہندوستان کے ایک اچھے ماہر تعلیم شمار ہوتے ہیں۔ آپ نے نہ صرف محکمہ تعلیمات میں گرانقدر خدمات انجام دیں بلکہ کچھ عرصہ تک آپ پرنسپل کلیہ جامعہ عثمانیہ کی خدمت پر بھی فائز رہے۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام سے آپ کو ہمیشہ گہری دلچسپی رہی ہے۔ ایک عرصہ سے نواب صاحب موصوف وزیر تعلیم اور معین امیر جامعہ ہیں مجلس اعلیٰ نے بجا طور پر آپ کو مستحق اعزاز سمجھکر تحریک کی اور اعزازی ٹیلسان دیا۔

ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی بی۔ اے (عثمانیہ) بی اے۔ آنرز (کیمبرج) پی۔ ایچ۔ ڈی (ہائیڈلبرگ)

پروفیسر ریاضیات جامعہ عثمانیہ ہماری مادر علمیہ کے پہلے سپوت ہیں جنھیں خود جامعہ نے اپنے انتہائی اعزاز سے نوازا ہندوستان کیا بلکہ دیگر اور ممالک میں بہت کم عالم ہونگے جن کی قابلیتیں اتنی کم عمری میں نمایاں ہوئی ہوں اور اس قدر غیر معمولی اعزاز و امتیازات کی مستحق تسلیم کی گئی ہوں حقیقت یہ ہے کہ اس قابل قدر سپوت پر جتنا ناز کیا جائے کم ہے اس فرزند نے اپنی مادر علمی کی بڑھتی ہوئی شہرت میں چار چاند لگا دیئے یورپ میں نام کمایا۔ اگرچہ یورپ میں بھی بعض جامعات نے انھیں ملازمت کا پیش کش کیا مگر انھیں اپنی مادر جامعہ کی خدمت مقصود تھی آج ڈاکٹر صاحب موصوف بین قومی شہرت کے مالک ہیں۔

عثمانیئن کے قلوب مسرتوں سے معمور ہیں کہ جامعہ نے انھیں اپنے انتہائی اعزاز سے سرفراز کیا ہم اس اعزاز کو شاندار اور امید افزا مستقبل کا پیش خیمہ سمجھتے ہیں اور ہم ان دونوں اصحاب کی خدمت میں پرخلوص ہدیہ مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

پروفیسر عبدالقادر سروری مادر علمیہ کی ان گنی چنی شخصیتوں میں سے ہیں جن پر جامعہ بجا طور پر فخر کر سکتی ہے آپ کی علمی و ادبی خدمات محتاج تعارف نہیں ہیں۔ زمانہ طالب علمی ہی سے آپ کو ادب کا شغف رہا اور "افسانہ" اور "شاعری" ایک زمانہ تک آپ کی قلمی کاوشوں کا مستقل عنوان بنے رہے۔ آپ نے موجودہ صدارت شعبہ اردو جامعہ میسور کے انتخاب میں محض اپنی ذاتی قابلیت اور ادبی خدمات کے نتائج سے کامیابی حاصل کی ہے ورنہ "دم چھلوں" کے اعتبار سے امیدواروں کی اکثریت "سب کچھ" تھی ہم اپنی برادری کی جانب سے ان کی اس نمایاں اور شاندار کامیابی پر دل سے ہدیہ تبریک پیش کرتے اور دعا کرتے ہیں کہ پروفیسر سروری کا دور صدارت اسی امتیاز کے ساتھ کامیاب رہے جس طرح دوسری جامعہ نے شدت سے آپ کی ضرورت محسوس کی ہے ہم یقین رکھتے ہیں آپ کا یہ ذوق برابر جاری رہیگا

ہماری برادری کے لئے یہ خبر انتہائی مسرت کا موجب ہوگی کہ ہمارے ایک اور ہونہار طالب علم

نواب رشید نواز جنگ بہادر کو بارگاہ سلطان العلوم سے ایرپائیگاہ کا غیر معمولی امتیاز عطا کیا گیا ہے
ہم موصوف کو اپنی برادری کی جانب سے دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

حادثات رنج و ملال سے کبھی مفر نہیں یہ حقیقت کس قدر دلخراش ہے کہ کل تک جس ہستی نے بیوں
موضوع پر قلم اٹھایا تھا آج اس کے ماتم کے لئے ہم کو قلم اٹھانا پڑ رہا ہے ہمیں انتہائی افسوس ہے
کہ پروفیسر مولوی جمیل الرحمن صاحب ام۔اے ہمیشہ کے لئے ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ پروفیسر
موصوف جامعہ کے ان اساتذہ میں ہیں جو اس کے قیام سے برابر اس کی خدمت کرتے چلے آتے ہیں
آپ تاریخ اسلام کے بہت بڑے عالم تھے اور خلق و مروت اور طلبار کے ساتھ مساویانہ سلوک
ان کی امتیازی شان تھی۔

پروفیسر جمیل گو اب ہمارے درمیان نہیں لیکن ان کے علمی کارنامے اور ہر دلعزیزی کے
نقش طلبار کے دلوں میں ہمیشہ یاد تازہ کرتے رہیں گے ہم بارگاہ رب العزت میں دست بدعا ہیں کہ
مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔

سید افضل الدین خاں بی۔اے (عثمانیہ)
مدیر حصہ اردو

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اصل مکتوب نبویؐ بنام نجاشی کی نئی دستیابی

مجلۂ عثمانیہ جلد (۹) شمارہ (۳ - ۴) ۱۳۵۵ھ ۱۹۳۶ء میں مضمون "مکتوبات نبویؐ کے دو اصول" کے آخر میں ایک اخباری اطلاع کا ذکر کیا گیا تھا کہ موجودہ نجاشی حبشہ نے مکتوب نبویؐ کی جو اپنے زمانے کے نجاشی کے نام آیا تھا، لوگوں کو زیارت کرائی۔ مگر کوئی تفصیلی اطلاع نہیں ملی تھی۔ اس کے بعد سے بڑے بڑے انقلاب رونما ہوئے۔ نجاشی کو لندن میں جا پناہ گزیں ہونا پڑا اور حبشہ پر اطالوی قبضہ ہوگیا۔ پھر موجودہ جنگ چھڑی۔ مگر خوش قسمتی سے اس اہم اور مبارک دستاویز کے متعلق کچھ اور معلومات حاصل ہوئے ہیں جو باعث دلچسپی ہونگے۔

(م ح ا)

۱۱ رمئی ۱۹۳۹ء کو جب میں نے جامعۂ اکسفرڈ میں "ابتدائے سنہ ہجری کے چند عربی کتباتِ مدینہ" پر ایک فانوسی لکچر دیا اور ان کتبات کے خط کا مقابلہ سابق میں دستیاب شدہ مکتوبات نبویؐ (بنام مقوقس و منذر) سے کیا تو پروفیسر مارگولیوث نے جلسے میں بیان کیا تھا کہ ایک اور مکتوب نبویؐ جو نجاشئ حبشہ کے نام بھیجا گیا تھا، دستیاب ہو گیا ہے اور اسکاٹ لینڈ کے ایک شخص کے پاس ہے۔ جلسے کے بعد میں نے پروفیسر مارگولیوث کے توسط سے اس شخص کو ایک خط بھیجا۔ کئی ماہ بعد مجھے اس کا جواب حیدرآباد میں ملا۔ خط نویسندہ مسٹر ڈنلاپ کا قیام ان دنوں شام میں تھا۔ جواب میں مکتوبِ مبارک کی ایک نقل جو ہاتھ سے کی گئی تھی منسلک تھی اور وعدہ تھا کہ اسکاٹ لینڈ واپسی پر مجھے فوٹو بھی بھیجا جائیگا نیز یہ کہ اس پر ایک مضمون

جلد لندن کے رسالہ جے آر۔اے ایس میں بھی چھپے گا۔ اتنے میں جنگ شروع ہوگئی لیکن اتنے حالات میں نے اسلامک کلچر حیدرآباد (اکتوبر ۱۹۳۹ء ص۴۲۹ کی تعلیق ۱) اور مصر میں شائع شدہ کتاب الوثائق السیاسیۃ (ص۲۴ تا ۲۵ کی تعلیق) میں شائع کرادئے۔

موعودہ مضمون جے آر۔اے ایس کے شمارۂ جنوری ۱۹۴۰ء میں چھپا لیکن یہ پرچہ وقت سے بہت دنوں بعد ہندوستان پہنچا۔ اس میں یہ مضمون ص۵۴ تا ۶۰ میں چھپا ہے اور مکتوب مبارک کے فوٹو کا بلاک بھی وہیں شائع ہوا ہے۔

اس مضمون کے ضروری اقتباسات کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے:۔

" یہ خط ایک جھلی پر لکھا ہوا ہے جو کوئی نو ۹ انچ چوڑی اور ساڑھے تیرہ انچ لمبی ہے۔ حروف مدوّر ہیں اور بڑے ہونے کے باعث پڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی ہے۔ سیاہی جو استعمال کی گئی ہے وہ خاکی (براؤن) ہے۔ یہ مضمون سترہ سطروں میں ہے جس کے آخر میں ایک گول مہر کا نشان ہے جس کا قطر ایک انچ کا ہے۔ اس کی عبارت نیچے سے یوں ہے " محمد رسول اللہ" اور ہر لفظ علاحدہ علاحدہ سطر میں ہے۔[1] اور خط میں یہ عبارت ہے:۔

سطر (۱) بسم اللہ الرحمن الرحیم

(۲) من محمد رسول اللہ الی النجا

(۳) شی عظیم الحبشۃ سلام علی من

(۴) اتّبع الھدی ۔ امّا بعدُ فانّی احمد الیـ

(۵) ـک اللہ الذی لا الٰہ الاّ ھو الملک

(۶) القدوس السلام المومن المھیمن

(۷) واشھد انّ عیسی بن مریم روح

(۸) اللہ وکلمتہ القاھا الی مریم البتو

[1] افسوس کہ جے آر اے ایس میں جو فوٹو چھپا ہے اس میں مہر بالکل مٹی ہوئی ہے۔

(۹) ل الطیبة الحصینة محملت بعیسی من ر
(۱۰) وحه ونفخه کما خلق آدم بیده و
(۱۱) انی ادعوك الی اللّٰه وحده لا شر
(۱۲) یک له والموالاة علی طاعته وان
(۱۳) تتبعنی وتوقن بالذی جاءنی فانی ر
(۱۴) سول اللّٰه . وانی ادعوك وجنو
(۱۵) دك الی اللّٰه عز وجل وقد بلغ
(۱۶) ت ونصحت فاقبلو نصیحتی والسلام
(۱۷) علی من اتبع الهدی کذا

کذا

نشان مہر (اللّٰہ رسول محمد)

یہ دستاویز اکتوبر ۱۹۳۸ء میں دمشق میں حاصل ہوئی۔ میں اسے انگلستان لے گیا۔ برٹش میوزیم میں مسٹر بل اور مسٹر فلٹن نے اسے دیکھا . . . پروفیسر مارگولیوث اور گلاسگو کے مسٹر رابسن وغیرہ عربی دانوں کے دیکھنے کے بعد میں نے اسے واپس لے جاکر دمشق میں اس کے مالک کو پہنچا دیا جو وہاں ایک خانگی شخص ہے۔ اصل تو نہیں البتہ اس کے فوٹو کو مختلف اوقات میں جامعہ بون (جرمنی) میں پروفیسر کالے اور پروفیسر ہیفننگ نے بھی دیکھا۔ سابق میں دستیاب شدہ مکتوب نبوی (بنام مقوقس) سے مقابلے پر عام مشابہت نظر آئی۔ خاص کر مہر دونوں پر یکساں معلوم ہوئی۔ خط مختلف تھا اور ظاہر ہے کہ یہ کاتب کے مختلف ہونے کا نتیجہ ہوگا . . . اس خط کا متن جو عربی تاریخوں میں ملتا ہے ان میں باہم خفیف سا فرق ہے۔ چنانچہ تاریخ طبری میں خط کی سطر ۳ میں النجاشی الاصحم ملک الحبشة ہے یعنی نام زائد ہے اور "عظیم" کی جگہ "ملک" کا لفظ ہے۔ نیز "سلام علی من اتبع الهدی" کی جگہ "سلم انت" ہے۔ اور "اما بعد" نہیں ہے۔ اور خاص

آخر میں طبری میں " وقد بعثتُ الیک ابن عمی جعفراً و نفراً معہ من المسلمین فاذا جاءک فاقرھم ودع التجبر " کا جملہ زائد ہے۔ باقی خط تقریباً یکساں ہے ... طبری کے برخلاف سیرۃ حلبیہ میں جو متن ہے وہ ہوبہو یکساں معلوم ہوتا ہے حتیٰ کہ اس میں " توقن بالذی جاءنی " بھی ہے ورنہ عام طور سے طبری اور دیگر مولف اس کی جگہ " تومن بالذی جاءنی " کی روایت کرتے ہیں۔ علم خطوط قدیمہ کے نقطۂ نظر سے برٹش میوزیم کے ماہروں کی رائے تھی کہ وہ اتنا قدیم نہیں معلوم ہوتا جتنا بیان کیا جاتا ہے ... جن جن لوگوں نے اصلی جعلی کو دیکھا ہے ان میں سے متعدد کی یہ رائے کہ اس جعلی کا جدید کے مقابل قدیم ہونا زیادہ قرین قیاس ہے۔ مسٹر حمید اللہ مؤلف کتاب فرانسیسی بر " سیاست خارجۂ اسلام بزمانۂ نبوی " کا خیال ہے کہ مکتوب نبویؐ کی اصل موجودہ نجاشی کے کتب خانے میں ہوگی [1]۔ موجودہ مالک کا بیان ہے کہ اس نے چند سال قبل یہ دستاویز حبش کے ایک پادری کے پاس سے حاصل کی۔ اس لئے یہ قرین قیاس ہے کہ سابق میں وہ شہنشاہ حبشہ کے کتب خانے میں رہی ہو۔ اور حالیہ (حبشی اطالوی) جنگ کے دوران میں وہ کسی طرح ایک پادری کے قبضے میں آئی جس نے بعد میں شام کا سفر کیا ... "

اس قدر حالات دینے کے بعد مسٹر ڈنلاپ نے اس مکتوب کے جعلی ہونے کی رائے ظاہر کی ہے اور اس کی دلیلیں مختصراً یہ ہیں:-

۱۔ پیغمبر اسلام نے خطوط بھیجے ہی نہیں۔ آپ اپنے کو عالمگیر نبی نہیں سمجھتے تھے بلکہ صرف عرب کی اصلاح چاہتے تھے۔ اصل میں بعد کے زمانے میں جب عیسائی مسلمان ہوئے اور انہوں نے بتایا کہ حضرت عیسیٰ نے تمام دنیا میں اپنے حواری تبلیغ کے لئے بھیجے تھے تو مسلمانوں نے بھی اپنے نبی کی عزت کسی سے گھٹی ہوئی نظر نہ آنے کے لئے یہ قصہ گھڑ لیا ہے۔

---

[1] میں نے یوں نہیں لکھا تھا بلکہ خط میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ اصل کا حبش کے کسی شخص سے حاصل کیا جانا بیان کیا جاتا ہے تو ممکن ہے کہ جلاوطنی کے زمانے میں خود نجاشی یا اس کے ساتھی یہ مکتوب اپنے ساتھ حبش سے لائے ہوں کیونکہ چند دن قبل اس کے حبش میں ہونے اور عام زیارت کرائے جانے کی خبر آئی تھی۔ (م ح ا)

۲ ۔ سابق میں مقوقس اور منذر بن ساوی کے نام کے جو اصل مکتوبات نبوی دستیاب ہوئے تھے ان کے متعلق نولڈکے اور شوالی نے اور شلائشر نے جعلی ہونے کی رائے دی تھی ۔

۳ ۔ برٹش میوزیم کے ماہرین نے موجودہ جھلی کو جعلی قرار دیا ۔

۴ ۔ سیرۃ ابن ہشام میں جہاں مکتوبات نبویہ کے بھیجے جانے کا ذکر ہے وہاں شروع میں ابن اسحاق کا نام نہیں ہے ـــــ (گویا یہ روایت ابن ہشام کی یا ان کے زمانے کی پیداوار ہے)

۵ ۔ قرآن مجید کے جو پرانے نسخے ملتے ہیں ان کے خط سے اس مکتوب کا خط کافی مختلف ہے ۔

۶ ۔ آج کل بہت سی چیزیں پرانی کہہ کر بیچی جا رہی ہیں مگر وہ جعلی چیزیں ہیں ۔

۷ ۔ اس خط کا متن جو عربی تاریخوں میں ہے اس میں اور جھلی کی عبارت میں خاصا فرق ہے ۔

یہ سات دلیلیں جن میں سے زیادہ تر صرف پرانی پادریانہ باتیں دہرائی گئی ہیں ، کسی سنجیدہ التفات کے قابل نہ تھیں ۔ صرف نوجوان ناظرین کے معلومات کے لئے ان کی کچھ تحلیل کردی جاتی ہے ۔

پہلی دلیل محض ایک بے تکا اعتراض ہے ۔ ما ارسلناك الا رحمةً للعالمين ـــ ما ارسلناك الا كافةً للناس ـــ هو الذى ارسل رسوله بالهدىٰ و دين الحق ليظهره على الدين كله ـــ وغیرہ قرآن مجید کی متعدد آیتیں بتاتی ہیں کہ رسول عربی عالمگیر نبی تھے ۔ یہ اور بات ہے کہ انسان ہونے کی وجہ سے اس عالم اسباب میں آپ نے اپنی تبلیغی زندگی صرف حجاز میں گزاری ہو ۔ اس کے برخلاف حضرت عیسیٰ کے متعلق خود انجیل میں واقعہ ہے کہ ایک عورت ان کے پاس ایمان لانے آئی تو انھوں نے اس کی بیعت لینے سے انکار فرمایا اور کہا کہ تو بنی اسرائیل (یہودیوں) سے نہیں ہے اور میں صرف بنی اسرائیل کی بھیڑوں کے لئے مبعوث ہوا ہوں ۔

اور امریکی پادریوں کی جدید تحقیقات یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کا حواریوں کو دنیا کے مختلف حصوں میں بھیجنا ایک من گھڑت قصہ ہے انہوں نے خود نہیں بھیجا تھا۔ بہرکیف یہ اعتراض اور الزامی جواب اس بحث سے کم متعلق ہیں۔ اگر ڈنلاپ صاحب خود اسے نہ چھیڑتے تو ہم بھی اس بحث میں نہ پڑتے۔ عہدِ نبوی میں مُؤتہ (فلسطین) پر حملہ کیا اس دعوے کا جواب نہیں ہے کہ آپ صرفِ عرب کے نبی تھے ؟!

دوسری دلیل اس کا تفصیلی جواب اپنے سابقہ مضمونوں میں دے چکا ہوں۔ دیکھو مجلۂ عثمانیہ (جلد ۹ شمارہ ۳۔۴۔ مکتوبات نبوی کے دو اصول) اور اسلامک کلچر (اکتوبر ۱۹۳۹ء ابتدائے سنہ ہجری کے چند عربی کتبات مدینہ) آخرالذکر زیادہ مفصل ہے۔ اب انھیں اعتراضات کو دہرا کر جوابات دینا تحصیل حاصل ہے۔ مختصراً وہ اعتراضات ناواقف اور جاہل لوگوں کے ہیں۔ یوں بھی دیگر خطوط جعلی ہوں تو یہ کیا ضروری ہے کہ موجودہ خط بھی جعلی ہی ہو۔

تیسری دلیل برٹش میوزیم کے دو ماہرین نے صرف اتنا کہا کہ جھلی اتنی پرانی نہیں معلوم ہوتی کہ عہدِ نبوی کی ہو۔ اس قسم کے تخمینی معاملات میں " ماہرین " میں جتنا کثیر اور مضحکہ خیز اختلاف ہوتا ہے وہ علم آثارِ قدیمہ سے ادنیٰ مس رکھنے والے بھی جانتے ہیں۔ ہم نے اصل جھلی کے دیکھنے کا موقع نہیں پایا۔ ممکن ہے بعض دوسرے ماہر دیکھیں تو اس جھلی اور اس کی تحریر کو اتنا ہی قدیم قرار دیں جتنا اس کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔

چوتھی دلیل اس ناواقفانہ اعتراض کا تفصیلی جواب میں نے رسالہ معارف اعظم گڑھ (جون ۱۹۳۵ء "آنحضرت کا خط قیصر روم کے نام") میں دیا ہے۔ مختصر یہ کہ عبارت کے شروع میں " قال ابن اسحاق " نہ کہنے سے کچھ ثابت نہیں ہوتا کیونکہ ایک تو دورانِ عبارت میں کئی جگہ ابن اسحاق کا ذکر ہے اور دوسرے ابن ہشام نے آخر میں بیان کیا ہے کہ فلاں فلاں مکتوبات نبویہ کا ذکر خاص میرا ہے —— جس کے معنے صاف یہ ہیں کہ باقی خطوط کا ذکر ابن اسحاق ہی کے حوالے سے ہے۔

پانچویں دلیل سے بھی کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ اول تو قرآن مجید کا خط خاص آرائش سے لکھا جانا چاہیے اور معمولی سرکاری مراسلے الگ دفتری خط میں۔ دوسرے مقابلہ تو ایسی تحریروں سے ہو جو مسلمہ طور سے عہد نبوی یا اس کے قریبی زمانے کی ہوں نہ کہ کئی صدی بعد کی تحریروں سے۔

چھٹی دلیل کو بچکانی اعتراض کہنا چاہیے۔ بازار میں تاجر بھاؤ بڑھانے کو کوئی چیز پرانی بتائے تو ہمیشہ اور سو فی صد صورتوں میں اس کا جھوٹ کہنا کیا ضروری ہے؟ ہم کو اپنی ذاتی رائے قائم کرنی چاہیے نہ کہ دودھ سے جل چکے ہوں تو چھاچ بھی پھونک کر ہی پئیں۔

ساتویں دلیل ہی البتہ ایک ایسی چیز ہے جو سنجیدہ توجہ کی مستحق ہے۔ ۱۹۳۴ء میں جب میں نے اپنا فرانسیسی مقالہ پیش کیا تھا تو اس میں (ص ۳۸ تعلیق ۵ میں) میں نے مکتوب نبوی بنام نجاشی کے اس متن پر جو طبری میں ہے، یہ رائے ظاہر کی تھی:-

> تمام اسلامی مورخ متفق ہیں کہ یہ خط ۶ھ میں بھیجا گیا۔ مگر اس کے بعض جملے مثلاً "میں تیرے پاس اپنے چچازاد بھائی جعفر کو بھیج رہا ہوں جس کے ہمراہ چند مسلمان بھی ہیں جب وہ تیرے پاس آئے تو ان کی مہمانداری کر..." ایسے ہیں جن سے اس گمان کی تائید ہوتی ہے کہ یہ خط آنحضرتؐ نے اپنے چچازاد بھائی کو ان کے ہجرت کرکے حبش جاتے وقت بطور تعارف (تقریباً ۶ سنہ قبل ہجرت میں) دیا ہوگا۔ بنا براں جو متن ہمارے سامنے ہے وہ اصل میں دو الگ الگ خطوں کی عبارتوں کا مرکب ہوگا۔ مکتوب ثانی بے شک ۶ھ میں بھیجا جا سکتا ہے تاکہ نجاشی کو اسلام لانے کی دعوت کی تبلیغ کرے۔ رہا وہ خط جس میں مہاجرین کے پہنچنے پر انکی مہمانداری کرنے کی خواہش کی گئی ہے ۶ھ کے اواخر میں کسی طرح نہیں لکھا جا سکتا کیونکہ مہاجرین کو حبشہ پہنچ کر تب کوئی پندرہ سال گزر چکے تھے اور اس وقت تو وہ وہاں سے مدینہ واپسی کی تیاری کر رہے تھے۔"

یہی خیال میں نے انجمن ترقی اردو کی شائع کردہ کتاب "حبش اور اطالیہ" کے باب "عرب اور حبشہ" میں ظاہر کیا تھا۔ موجودہ جھلی کی دریافت سے اس خیال کی پوری تائید ہو گئی اور اس میں حضرت جعفر طیار

سے کے تعارف وغیرہ کا کوئی ذکر ہی نہیں بلکہ خالص تبلیغی خط ہے ۔

رہا تاریخوں میں مندرج متن سے اختلاف، اس کی وجہ سب جانتے اور مانتے ہیں کہ " روایت باللفظ کی طرح " روایت بالمعنیٰ " کا بھی عربوں میں رواج رہا اور جتنا بھی اختلاف تاریخوں کے متن اور جعلی کے متن میں ملتا ہے، وہ صرف ایک ہی مفہوم کو دوسرے مترادف الفاظ میں ظاہر کرنے پر مشتمل ہے اور بس ۔ خاص چیز یہ قابل ذکر ہے کہ ایک تاریخ میں ایک جملہ روایت بالمعنیٰ کے باعث بدلا ہے تو دوسرے میں دوسرا اور بہ حیثیت مجموعی پورے خط کی اصلی عبارت تاریخوں میں کہیں نہ کہیں موجود ہے ۔ سیرۃ حلبیہ کا متن بہت زیادہ مطابق اصل ہے اور خود مسٹر ڈنلاپ نے تسلیم کیا ہے کہ اگر ابن الاثیر نے اپنی تاریخ میں ایک جگہ جو نامکمل اقتباس دیا ہے، اس کی جگہ پورا متن دیا ہوتا تو جعلی کی عبارت سے سوفی صد متفق ہوتا ۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ تاریخوں کے متن کا دستاویز کے مندرجات سے مختلف ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ کسی جعلساز نے کسی تاریخ کی عبارت نقل کر کے فرضی دستاویز نہیں تیار کی ہے ۔

یہ تو مسٹر ڈنلاپ کی اعتراضی دلیلوں کے جواب تھے ۔ مسٹر ڈنلاپ نے بعض اہم چیزوں کو نظر انداز کر دیا ہے ۔ چنانچہ :-

۱ ۔ موجودہ خط کی مہر سابق میں دستیاب شدہ مکتوبات پر کی مہر کے بالکل مطابق ہے اس کی اہمیت پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہے ۔ چونکہ سابقہ مکتوب اور موجودہ مکتوب کی تحریر مختلف ہے اس لئے اس کا بھی اب امکان نہ رہا کہ دونوں کو ایک ہی شخص کا جعل قرار دیا جائے ۔ ان دونوں کی دستیابی کے مقامات بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں ۔

۲ ۔ جعلی کی عبارت کا رسم الخط خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ چنانچہ " فاقبلوا " کی جگہ بغیر الف کے " فاقبلو " لکھا گیا ہے ۔ نیز " اتبع " کی جگہ (ت) کے دو شوشے " اسع " ہیں ۔ اگر مسٹر ڈنلاپ کی رائے کے مطابق اسے صرف ستر اسی سال قبل کی جعل سمجھیں تو ان خصوصیات کی توجیہ ناممکن ہے ۔ اس طرح کہ لکھنے کا رواج عہد نبوی میں رہا ہونا قرآن مجید

سے ثابت ہے اور حالیہ زمانے میں کوئی اسی طرح لکھے تو اسے غلطی سمجھا جاتا ہے۔ "فاقبلو" کی مماثل نظیریں قرآن مجید میں بکثرت ملیں گی۔ اور "اتتبع" کی بھی ایک۔ چنانچہ سورۂ ۵۱ آیت ۴۷ میں "والسماءَ بنینٰھا بأییدٍ" اب تک لکھا جاتا ہے حالانکہ "بأیدٍ" بالکل کافی تھا۔ (فلسطین کے ایک قدیم کتبے میں جو حال میں دستیاب ہوا ہے "آمین" کا لفظ دو شوشوں کے ساتھ "امس" لکھا گیا ہے۔ دیکھئے کانتی نو کی فرانسیسی کتاب "فہرست کتباتِ پالمیرا" مطبوعہ بیروت ۱۹۳۳ء صہ ۱۵) اور مکتوب نبوی بنام منذر کی اصل میں بھی "غیرہ" کا لفظ دو شوشوں سے "عسرہ" لکھا گیا ہے۔

۳۔ خط میں نقطے اور اعراب بالکل نہیں ہیں حالانکہ نقطوں وغیرہ کا رواج پہلی صدی ہجری ہی سے شروع ہو گیا تھا، جس کے معنے یہ ہیں کہ یہ جھلی نقطوں اور اعراب کی ایجاد سے قبل کی ہے۔

۴۔ الفاظ کے ٹکڑے کر کے آدھا لفظ ایک سطر میں اور باقی دوسری سطر میں لکھنا مثلاً ر/سول، الیر/ک، ر/وح، جنو/دك وغیرہ بھی صرف قدیم زمانے میں رائج تھا اور آج کل اس کا رواج نہیں ہے۔ مصر میں کچھ عرصہ قبل جو ۳۱ھ (یعنی حضرت عثمانؓ کے زمانے کا) کتبہ دستیاب ہوا تھا اس میں بھی یہی حال ہے۔ اور مقوقس اور منذر کے نام کے اصل مکتوبات نبویؐ میں بھی یہی چیز ملتی ہے۔ حضرت عثمان کی طرف منسوب مدینہ منورہ کے قرآن کے ایک صفحے کا جو فوٹو ترکی حکومت نے شائع کیا ہے اس میں بھی یہی کیفیت ہے۔

۵۔ "م" اور "ه" کے لکھنے کے طریقے بھی نہایت قدیم ہیں۔ میم سطر کے نیچے نہیں بلکہ اوپر ہے مثلاً محمد (محمد) اور "ه" کو ہم آج کل کی "ع" سے مشابہ پاتے ہیں مثلاً (أشھد) کو منذر کے خط میں اسے (سعد) لکھا ہے اور موجودہ نجاشی کے خط میں (سعد) اور مقوقس کے خط میں (المدی) کو (لمدی) جو

مختلف کاتبوں کی کشش کے فرق کو ظاہر کرتا ہے۔

۶۔ خط جس جگہ سے اور جن حالات میں دستیاب ہوا ہے وہ بھی ہر طرح کے شبہے سے بالا معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس کو وہیں ہونا بھی چاہئے تھا اور حبشی اطالوی جنگ کے مفلس مفروروں کا اسے لاکر کسی کے ہاتھ بیچ دینا ہر طرح معقول سمجھا جاسکتا ہے۔

غرض ہمارے خیال میں یہ وجوہ مکتوب زیر نظر کی اصلیت کی مخالفت سے زیادہ تائید میں ہماری رائے قائم کراتے ہیں۔

مسٹر ڈنلاپ کا آج کل قیام گلاسگو میں ہے۔ میں نے خط لکھ کر دریافت کیا ہے کہ دمشق کے مالک کا نام اور حیثیت کیا ہے۔ خدا معلوم موجودہ یاجوجی ماجوجی جنگ میں اس یادگار کا کیا حال ہوا ہے کیونکہ دمشق بھی اس کے نرغے میں آچکا ہے۔

محمد حمید اللہ

"آ"

جب رات کی گہری تاریکی خاموش فضا پر چھا جائے
جب خاک کے ذرے ذرے پر اک کالا ناگ سا لہرائے

جب ننھے ننھے تاروں کی آنکھوں میں نیند سما جائے
اک ہوش طلب بیہوشی سی پتے پتے پر چھا جائے

جب گردشِ پیہم سے تھک کر جنگل کی ہوائیں سو جائیں
پھولوں کی پریشاں نکہت سے بد مست فضائیں ہو جائیں

جب فکرِ حال و مستقبل مٹ جائے دماغِ ہستی سے
صہبائے فراموشی چھلکے دنیا پہ ایاغِ ہستی سے

جب ہستی کی ہر موجِ نفس مخمورِ شرابِ راحت ہو
پا بوسِ حسن، محبت ہو اور حسن نثارِ الفت ہو

جب ٹوٹ کے سیارہ کوئی، تاریکیوں میں گم ہو جائے
جب نبضِ حیاتِ خفتہ میں اک لرزش ہو کر کھو جائے

جب لیلائے شب کی زلفیں آ جائیں کمر تک بل کھا کر
کہسار کی چوٹی سے جھانکے وہ لالہ گوں بد مست قمر

یوں جیسے کوئی، دوشیزہ بد مست نگاہوں سے تاکے
یا انگڑائی لیکر اُٹھے رنگین گلوں کے بستر سے

جب ہلکی ہلکی کرنوں کا احساسِ خمارِ صہبائی
لے نیم شگفتہ کلیوں کی دوشیزہ فضا پر انگڑائی

جب چاند کے روشن چہرہ پر بادل کی زلف پریشاں ہو
جب دریا کے آئینے میں وہ پرتوِ انجم رقصاں ہو

فطرت کے حسیں نظاروں میں جب جذبِ نظر کے ساماں ہوں
جب حسن کی رنگین دنیا میں معصوم فرشتے خنداں ہوں

جب جگمگ جگمگ کرنے لگے پتی پتی ڈالی ڈالی
وہ روشن خواب بنے دنیا جو دیکھے جوگن متوالی

جب چاروں طرف خاموشی ہو، بے ہوشی ہو، بد مستی ہو
فطرت کی مکمل خاموشی، پیغامِ سکوں کا دیتی ہو

تو ایسے زریں لمحوں میں آ میری خیالی دنیا میں
رنگین تصور کی رنگین پرکیف وخماری دنیا میں

اک نغمۂ دلکش بنکر آ اور دل کی گہرائی میں اتر
احساس مسرت بن کے آ اور چھا جا میری ہستی پر

شمشیر نزاکت بن کر آ ، آئینۂ حیرت بن کر آ
تصویر شرارت بن کر آ ۔ آ ۔ دردِ محبت بن کر آ

تسکین کی دنیا بن کر آ ۔ یا درد کا عالم بن کر آ
یا عیشِ مجسم بن کر آ ۔ یا پیکرِ صد غم بن کر آ

پیمانِ رستی بن کر آ ۔ بھولی ہوئی ہستی بن کر آ
ادراک کی آنکھیں کھل جائیں ۔ وہ عالمِ مستی بن کے آ

آ ۔ اپنی زیست کا سرمایہ کردوں میں ترے قدموں پہ نثار
آنکھ کے آنسو ۔ دل کی سوزش ، ٹھنڈی آہیں ، صبر قرار

مرجاؤں فرطِ مسرت سے دل میرا اتنا شادان ہو
چہرہ سے عیاں ہو جوش طرب ہونٹوں پہ تبسم رقصاں ہو

پر نور ستاروں کے چہرے اس دم پژمردہ ہوتے ہوں
چاند ڈھلک رہا ہو بادل میں اور دنیا والے سوتے ہوں

صمد رضوی ساز بی ۔ اے ۔ ال ال ۔ بی (عثمانیہ)

علمیات

(۳)

کانٹ کی عقلیت

کانٹ (ایمانول) ۱۷۲۴ء تا ۱۸۰۴ء کو ھیوم کے ارتیابی نتائج نے گویا خوابِ غفلت سے چونکا دیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر ہیوم کا بیان صحیح ہو تو پھر ارتیاب، غارتگرِ متاعِ علم و ایمان، فلسفہ کی آخری منزل ہوگا! ہیوم ایک حد تک ضرور صحیح ہے، فلاطونی حقیقت کے خلاف، ذہنی تصورات وغیرہ کے خلاف ہیوم کا ساتھ دیا جا سکتا ہے، لیکن علم کی نفی کسی طرح درست نہیں، ہیوم نے علم کے سارے مسئلہ پر بحث نہیں کی۔ اب کانٹ اپنی شہرہ آفاق کتاب "انتقادِ عقلِ نظری Critique of Pure Reason میں (اشاعت ۱۷۸۱ء دوسری اشاعت ۱۷۸۷ء) علم کا ایک ایجابی نظریہ پیش کرنے اور ارتیابیت کو شکست دینے کی کوشش کرتا ہے، ڈیکارٹ اور لائبنز کی ادعائیت اختیار کر کے نہیں بلکہ علم کے سارے مسئلہ کو ایک نئی بنیاد پر قائم کر کے، لاک کی تجربیت جس کا اختتام ہیوم کی ارتیابیت میں ہوا تھا، اس میں اور ڈیکارٹ اور لائبنز کی عقلیت میں مصالحت پیدا کر کے گویا ایک درمیانی راہ اختیار کر کے۔ کانٹ کا نظریہ علم عقلیت اور تجربیت کی ایک خوشگوار آمیزش ہے۔

ہمیں علم کس چیز کا ہوتا ہے اور کس طرح ہوتا ہے؟ غائر تحلیل سے اور خاص الفاظ میں اس سوال کا جواب دیا جاتا ہے۔ کانٹ کہتا ہے کہ محض تصور علم نہیں۔ جب ایک سے زیادہ تصورات آپس میں ملائے جاتے ہیں تب علم حاصل ہوتا ہے۔ اسی عمل کو تصدیق، کہتے ہیں اور اسکی دو قسمیں ہیں۔

تحلیلی و ترکیبی۔ تحلیلی تصدیق میں محمول صرف اس چیز کی وضاحت کرتا ہے جو موضوع میں پہلے سے موجود ہوتی ہے مثلاً جب میں کہتا ہوں کہ جسم ممتد ہے، تو امتداد یا ممتد ہونا جسم (موضوع) کے متعلق کسی نئے علم کا اضافہ نہیں کرتا، ظاہر ہے کہ جسم میں امتداد کا تصور شامل ہے۔ مگر جب میں کہتا ہوں کہ تمام اجسام کثافت نوعی رکھتے ہیں، تو یہ ایک ترکیبی تصدیق ہے کیونکہ یہاں محمول موضوع میں کسی نئی چیز کا اضافہ کر رہا ہے، اس کی محض وضاحت نہیں کر رہا ہے۔

ترکیبی تصدیقات کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ عارضی اور ضروری۔ عارضی ترکیبی تصدیقات تجربہ سے ماخوذ ہوتی ہیں، وہ ہمیں اس امر سے آگاہ کرتی ہیں کہ فلاں شئی یہ خواص و کیفیات رکھتی ہے یا اس طرح عمل کرتی ہے، وہ یہ نہیں کہتیں کہ اس شئی کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس میں یہ خصوصیات و کیفیات ہوں اور وہ اس طرح پر عمل کرے۔ بالفاظ دیگر ان تصدیقات میں "وجوب ولزوم" نہیں پایا جاتا عقل ان کے تسلیم کرنے پر اس طرح مجبور نہیں جس طرح کہ ایک ریاضیاتی قضیہ کو ماننے پر وہ مجبور ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ان تصدیقات میں "کلیت" ہی نہیں پائی جاتی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ چونکہ اس صنف کی بعض اشیا بعض صفات رکھتی ہیں لہذا تمام ہی کی یہ صفات ہوتی ہیں۔ جو تصدیقات کہ کلیت اور وجوب ولزوم نہیں رکھتیں بالفاظ دیگر جو حصولی یا اکتسابی ہوتی ہیں وہ سائنٹفک یا حکیمانہ تصدیقات نہیں کہلاتیں۔ ان سے حقیقی علم نہیں حاصل ہوتا۔ حقیقی علم کا مرتبہ حاصل کرنے کے لئے ترکیبی تصدیق کو ضروری، ہونی چاہئے۔ اس کی ضد ناقابل تصور ہونی چاہئے، اور وہ کلی ہونی چاہئے یعنی اس میں کسی استثنا کی گنجائش نہ ہو۔ کلیت و وجوب کا مبدا و ماخذ حس یا ادراک نہیں بلکہ عقل ہے۔ ہمیں بغیر تجربہ کے بھی (اس معنی میں تجربہ سے قبل) اس امر کا علم ہوتا ہے کہ مثلث کے تین زاویے دو قائموں کے برابر ہونے چاہئے اور ہمیشہ ایسا ہی ہوگا۔ لہذا تصدیق اسی وقت حقیقی علم بخشتی ہے جب وہ حضوری یا اولی ہوتی ہے۔

اب ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ حقیقی علم مشتمل ہوتا "ترکیبی حضوری تصدیقات پر" Synthetic Judgment a prior تحلیلی تصدیقات ہمیشہ حضوری ہوتی ہیں، ہم بغیر تجربہ کے یہ جانتے ہیں کہ تمام

ممتد اشیاء ممتد ہوتی ہیں' ان تصدیقات کی بنیاد قوانین عینیت و تناقص پر ہوتی ہے۔ لیکن ان سے ہمارے علم میں اضافہ نہیں ہوتا۔ ترکیبی حصولی تصدیقات ہمارے علم میں اضافہ تو کرتی ہیں لیکن وہ یقینی نہیں ہوتیں' ان سے حاصل شدہ علم غیر یقینی مبہم اور ظنی ہوتا ہے۔ ہمیں علوم میں یقین مطلق کی ضرورت ہے اور ایسے یقین کا امکان صرف ترکیبی حضوری تصدیقات ہی میں پایا جاتا ہے۔

اس قسم کی تصدیقات کے وجود کے متعلق کانٹ ایک لمحہ کے لئے بھی شک نہیں کرتا وہ انہیں طبیعیات' ریاضیات بلکہ مابعد الطبیعیات میں بھی موجود پاتا ہے۔ دیکھو علماء طبیعیات و ریاضیات واقعات کے متعلق کیسی پیشین گوئی کرتے ہیں۔ انکی پیشین گویاں تجربہ پر تو مبنی نہیں ہوتیں کیونکہ محض تجربہ سے تو اس امر کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ جو چیز وقوع پذیر ہو چکی ہے وہ پھر ہوگی' نہ ہی قانون و ترتیب ہی کا کچھ اشارہ مل سکتا ہے۔ پیشین گوئی کا امکان کسی حضوری عنصر پر مبنی ہوتا ہے۔ لہذا کانٹ نہیں پوچھتا کہ کیا ترکیبی حضوری تصدیقات کا امکان ہے بلکہ وہ صرف یہ پوچھتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہیں۔ اس قسم کے علم کے شرائط کیا ہیں؟ کانٹ کہتا ہے کہ اس سوال کے جواب کے لئے ہمیں ملکۂ علم کا غور سے امتحان کرنا چاہئے اس کی قوتوں پر' اس کے وظائف و امکانات و تحدیدات پر غور کرنا چاہئے۔ علم ایک ذہن کو فرض کرتا ہے (عالم)' پھر ہم اس وقت تک سوچ نہیں سکتے جبتک کہ سوچنے کے لئے کوئی چیز نہ ہو (جس کو معلوم کہتے ہیں) اور ہمیں کوئی معروض فکر حاصل نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ حواس کے ذریعہ عطا نہیں ہوتا' بالفاظ دیگر جب تک کہ ذہن قبول کی قابلیت نہیں رکھتا یا حسیت نہیں رکھتا "حسیت" ہمیں اشیاء یا مدرکات (وجدانات یا جیسے بعض وقت کانٹ انکو تجربی وجدانات کہتا ہے) عطا کرتی ہے۔ فہم ان اشیاء کی فکر کرتی ہے' تعقل کرتی ہے یا سوچتی سمجھتی ہے۔ یہاں تعقلات پیدا ہوتے ہیں۔ علم بغیر حس یا ادراک اور فکر یا فہم کے ناممکن ہوگا۔ علم ان دونوں کو فرض کرتا ہے (یعنی حس و فہم دونوں کو)' گو یہ بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن وہ ایک دوسرے کی تتمیم کرتے ہیں۔ " مدرکات و تعقلات سے ہمارے علم کے عناصر کی تشکیل ہوتی ہے "۔ " مدرکات بغیر تعقلات کے اندھے ہوتے ہیں اور تعقلات بغیر مدرکات کے تہی "۔ عقل صرف اتنا ہی کرسکتی ہے کہ

حسیت سے اس کو جو مواد ملتا ہے اس کو پھیلاتی اور تکمیل دیتی ہے ۔ ممکن ہے کہ ان دونوں نکات کی جڑ ایک ہو، لیکن اس کا ہمیں علم نہیں ۔

اس بیان سے ظاہر ہے کہ تجربیت نے جس حد تک کہ علم کی حسی حیثیت پر زور دیا تھا بالکل حق بجانب تھی لیکن جب وہ ذہن یا عقل کی فعلیت کی اہمیت کو نظر انداز کرنے لگی (ہیوم کی اتیلافیت میں آکر) تو وہ غلط راستہ پر پڑی ۔ اسی طرح عقلیت علم کے عقلی عنصر پر زور دینے میں بالکل درست تھی لیکن معطیات حواس کی اہمیت کے جانچنے میں اس سے غلطی ہوئی ۔ علمیاتی نظریہ کا صحیح حل تجربیت و عقلیت پر تنقید اور پھر ان میں صحیح طور پر مصالحت و توازن کا پیدا کرنا ہے ۔ اسی ازدواج کے عمل کو کانٹ کی " انتقادیت " بجالاتی ہے ۔

کانٹ اس سوال کو کہ علم کس طرح ممکن ہے مزید دو سوالات میں تقسیم کرتا ہے، ادراک حواس کس طرح ممکن ہے اور فہم کس طرح ممکن ہے ۔ پہلے سوال کا جواب اس نے اپنی انتقاد عقل نظری کے پہلے حصہ میں دیا ہے جس کو وہ ماورای اجمالیات "Transcendental Aesthetic" کہتا ہے اور دوسرے کا جواب دوسرے حصہ میں جس کو وہ ماورائی منطق ("Transcendental Logic") کہتا ہے ۔

پہلے " ماورائی جمالیات " کو لو ۔ ملکہ حسیت یا ادراک حواس کے منطقی شرائط کیا ہیں ؟ ادراک کے لئے احساسات کی ضرورت ہے مثلاً رنگ و بو، آواز، سختی نرمی وغیرہ ۔ لیکن محض علم کو ہم علم نہیں کہہ سکتے ۔ حس تو شعور کی محض ایک کیفیت کا نام ہے، ایک ذہنی حالت ہے جو کسی شئی سے ہم میں پیدا ہوتی ہے ۔ جس کا تعین نہ مکاں و زماں میں ہونا چاہئے ، یعنی ہمیں اس کا اس طرح شعور ہونا چاہئے کہ وہ کوئی خارجی شئی ہے جو دوسری اشیاء کے ساتھ ہے، وہ ایسی شئی ہے جو دوسری شئی کے پہلے یا اس کے بعد یا اس کے ساتھ ہوتی ہے ۔ ہمارے تمام احساسات مکانی و زمانی ترتیب میں مرتب ہوتے ہیں ۔ لہٰذا ادراک دو چیزوں کو فرض کرتا ہے ۔ مواد (یعنی احساسات) اور صورت (یعنی مکان و زماں) ۔ احساسات (رنگ، آواز، وزن، بو) وہ مواد خام ہیں جن کو حسیت زماں و مکاں کی صورت میں ترتیب دیتی ہے اور اس طرح وہ مدرکات بنتے ہیں ۔ ذہن احساسات کو

صرف قبول ہی نہیں کرتا بلکہ اپنے وجدان کے ملکہ کی وجہ سے وہ ان کا ادراک کرتا ہے ۔ وہ اپنے سے خارج ' مکان وزماں کے سلسلے میں ' رنگ کو دیکھتا ' آواز کو سنتا ہے ۔ ذہن منفعل بھی ہے اور فعال بھی ۔ ذہن کا ملکہ "حسیت" زماں ومکاں کو حضوری طور پر ادراک کرنے کی قوت رکھتا ہے ' حقیقت یہ ہے کہ ذہن انسانی کی تشکیل ہی ایسی ہوئی ہے کہ وہ زماں ومکاں کا ادراک اس وقت وہی کرتا ہے جب معروضات موجود ہی نہیں ہوتے ' یعنی وہ نہ صرف اشیار کا مکان وزمان میں ادراک کرتا ہے بلکہ خود مکاں وزماں کا ۔ اس معنی کر کے ہم ادراکِ خالص کا ذکر کرسکتے ہیں ۔

جو صورتیں کہ احساسات کو مکاں وزماں میں ترتیب دیتی ہیں وہ خود احساسات نہیں ہوسکتیں وہ احساسات سے اس طرح ممیز ہیں کہ ان کے شعور کے وقت ذہن فاعل ہوتا ہے منفعل نہیں ہوتا ۔ علاوہ ازیں یہ دونوں حضوری ہیں اور احساسات اکتسابی یا حصولی ۔ جب مکاں وزماں محض احساسات نہیں اور جب ایک شئ خواہ وہ کچھ ہو ہمیشہ مکانی وزمانی ہوتی ہے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ شئی معلومہ محض احساسات ہی کا مجموعہ نہیں ہوتی ' جیسا کہ ہیوم نے خیال کیا تھا ' بلکہ وہ احساسات اور غیر حسی عناصر ' مکاں وزماں سے مرکب ہوتی ہے ۔

خلاصہ یہ کہ حقیقی علم جو ہمیں حاصل ہے ممکن نہ ہوتا اگر یہ چیزیں جمع نہ ہوتیں (۱) ذہن کے سامنے کسی چیز کا حاضر ہونا ضروری ہے

(۲) ذہن میں یہ قابلیت ہونی چاہیئے کہ وہ ارتسامات کو قبول کرسکے لیکن اگر ہم ارتسامات یا شعور کے تجربی کیفیات کو صرف قبول ہی کرتے تو ہم اپنے ہی ذہن کے دائرہ میں مقید ہوتے ہیں خارجی دنیا کا ادراک نہ ہوتا ۔ لہذا

۳) ہمارے احساسات کی مکاں وزماں میں ترتیب ہونی چاہیئے ' وہ خارج میں محول کئے جانے چاہیں چونکہ ذہن انسانی ادراک کے ان طریقوں کو رکھتا ہے اسی لئے خارجی دنیا کا بھی وجود ہوسکتا ہے جس کا ہم ادراک کرسکتے ہیں ۔

لیکن صرف یہ چیزیں بھی کافی نہیں ۔ محض غیر مربوط وغیر مرتب مدرکات علم نہیں ۔ اور محض اشیار کا

مکاں وزماں میں ادراک بھی علم نہیں بخشتا۔ محض آفتاب کا ادراک اور پھر گرم پتھر کا ادراک اس علم کے ساوی نہیں کہ آفتاب پتھر کو گرم کرتا ہے۔ جب میں ان دو تجربات کو ایک خاص طریقہ سے ذہن میں ترتیب دیتا ہوں تو اسی وقت میں یہ حکم لگا سکتا ہوں کہ آفتاب پتھر کے گرمی کی علت ہے اس سے معلوم ہوا کہ اشیا یا معروضات میں ترتیب و ربط پیدا ہونا چاہیئے، ان کا تعقل یا ان کی فکر کی جانی چاہیئے۔ علم یا تصدیق اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ایک ترکیب بخش اور ذی فکر ذہن نہ ہو، یعنی جب تک کہ فہم (Verstand) یا عقل نہ ہو۔ وجدان کا کام ادراک ہے، فہم کا کام تعقل، وہ تعقلات میں سوچتی ہے ہمیں اپنے مدرکات کو عقلی بنانا چاہیئے یعنی تعقلات کے تحت لے آنا چاہیئے اور تعقلات کو حسی بنانا چاہیئے ادراک میں کسی معروض کو ان کے حوالہ کرنا چاہیئے۔ فہم بذات خود کسی چیز کا ادراک یا وجدان نہیں کر سکتی اور حواس بذات خود کسی چیز کی فکر نہیں کر سکتے۔ علم کا امکان ان ہی دو کی وحدت سے ہوتا ہے۔ حسیت کے قوانین و قواعد کا علم جمالیات ہے اور فہم کے قواعد و قوانین کا علم منطق ہے۔

فہم تعقل کی، یا مدرکات کو مربوط کرنیکی مختلف صورتیں رکھتی ہے۔ ان کو ''تعقلات محض'' یا ''مقولات فہم'' کہا جاتا ہے، کیونکہ یہ حضوری ہوتے ہیں اور تجربہ سے ماخوذ و مکسوب نہیں۔ فہم اپنا اظہار تصدیق میں کرتی ہے، دراصل فہم تصدیق کا ایک ملکہ ہے۔ سوچنے کے معنی تصدیق قایم کرنے یا حکم لگانے کے ہیں۔ اسی لئے اس کے تعقل کے طریقے حکم لگانے کے طریقے ہوں گے اور حکم لگانے کے ان طریقوں کو دریافت کرنے کے لئے ہمیں تصدیقات کی تحصیل کرنی چاہیئے اور ان صورتوں کا امتحان کرنا چاہیئے جنہیں یہ ظاہر ہوتے ہیں۔ چونکہ عام منطق ہمارے لئے یہ کام کر چکی ہے لہذا ہم اس سے مدد لے سکتے ہیں۔ منطق میں تصدیقات کے اصطفاف سے ہمیں مقولات کی دریافت میں مدد مل سکتی ہے۔ کیونکہ یہاں تمام ممکنہ تصدیقات موجود ہوتے ہیں۔ منطق کا وہ حصہ جو اس مضمون سے بحث کرتا ہے ماورای تحلیل Transendental Aralytic کہلاتا ہے۔

تصدیقات کی بارہ قسموں سے کانٹ نے بارہ مقولات اخذ کئے ہیں:۔

۱۔ کمیت	۲۔ کیفیت	۳۔ اضافت	۴۔ جہت
وحدت	اثبات	جوہر و عرض	امکان و عدم امکان
کثرت	نفی	علت و معلول	وجود و عدم
کلیت	تحدید	انحصار و باہمی تعامل	وجوب و امکان

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں ذہن کی ان صورتوں کو اشیار پر منطبق کرنے کا کیا حق حاصل ہے۔ گو ان کا مبداء بالکل ذہنی ہے تاہم ان کا انطباق تجربہ پر کیا جاتا ہے' اسکی وجہ؟ ہمیں اس کا کیا حق حاصل ہے؟ کانٹ اس کے جواب میں کہتا ہے کہ ان کے بغیر عقلی تجربہ کا امکان ہی نہیں فہم تصدیق ہے یعنی مدرک اشیار کی کثیر تعداد کو شعور ذات کے تحت لے آنیکا عمل ہے۔ بغیر ایک ذی عقل ذہن کے جو خاص طریقوں (مکاں و زماں) سے ادراک کرتا ہے اور خاص طریقوں (مقولات) سے حکم لگاتا یا سوچتا ہے' یعنی جس کی تشکیل فطرۃً (ضروری طور پر) ایسی ہوئی ہے کہ ان ہی طریقوں سے ادراک کرتا اور حکم لگاتا ہے' تجربہ کے اشیار کا کلی و ضروری علم نہیں ہوسکتا۔ علم ان معروضات پر جو حواس کے عطا کردہ ہیں' اور جن کا مکانی و زمانی حیثیت سے ادراک ہوا ہے' تعقلاتِ فہم یا مقولات کا منطبق کرنا ہے۔ مقولات کی وجہ سے تجربہ ممکن ہوتا ہے اور یہی ان کو حق بجانب ثابت کرنیکے لئے کافی ہے۔

مثال کے طور پر ادراک کے ایک سادہ عمل کو لو جیسے پانی کے برف ہو جانے کا ادراک اور دیکھو کہ یہ بھی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ذہن دو حالتوں (سیال اور جامد) کا اس طرح ادراک کرتا ہے کہ وہ زماں میں مربوط ہیں اور فکر کی ایک ہی فعلیت میں متحد کردئے گئے ہیں۔ ہمارے تجربہ کی دنیا مقولات ہی کی وجہ سے ممکن ہوتی ہے۔ فطرت جس کا ہمیں ادراک ہوتا ہے ہماری ذہن کی صورتوں پر مبنی ہے' بالعکس نہیں' جیسا کہ تجربیہ کا دعویٰ تھا۔ کانٹ کی یہی مراد ہوتی ہے جب وہ یہ کہتا ہے کہ فہم فطرت پر اپنے قوانین کا انطباق کرتی ہے' یہی وہ "کوپرنیکی انقلاب ہے" جو وہ فلسفہ میں پیدا کرتا ہے

اب چونکہ ذہن فطرت پر اپنے قوانین کا انطباق کرتا ہے اس سے یہ لازم آتا ہے کہ

ہم فطرت کی کلی صورتوں کا حضوری طور پر علم رکھتے ہیں ۔ ہم جانتے ہیں کہ مدرک دنیا ہمیشہ خاص قابل فہم طریقوں سے مربوط ہوگی، ہمارے تجربات ہمیشہ مکانی و زمانی ہوں گے، اشیاء میں ہمیشہ جوہر و عرض کا علاقہ ہوگا، ان کا تجربہ ہمیشہ بحیثیت علت و معلول اور ایک دوسرے پر منحصر ہونیکے ہوگا ۔ لہٰذا عالم حواس پر مقولات کے انطباق میں ہم غلطی نہیں کر سکتے ۔ لیکن یہ خوب یاد رکھنا چاہئے کہ ان کا جائز استعمال واقعی یا ممکنہ تجربہ ہی کے دائرہ میں ہو سکتا ہے یعنی عالم مظاہر ہی میں، اس دائرہ کے ماوراء ان کا استعمال صائب نہ ہوگا ۔ ہم تجربہ سے ماوراء نہیں جا سکتے، یا ماوراء حواس اشیاء یا اشیاء کماہی، کا عقلی علم نہیں حاصل کر سکتے ۔ اس نظریہ سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ تجربہ کے مواد کا ہمیں حضوری علم نہیں ہو سکتا یعنی اس چیز کا کہ کس وقت کونسے خاص احساسات (رنگ، آواز، وزن وغیرہ) ہوں گے ہمیں کوئی اولی علم نہیں ہو سکتا ۔ جو کچھ کہ ہم کہہ سکتے ہیں وہ صرف اتنا ہے کہ خواہ یہ کچھ ہوں ذہن ان کو اپنے ضروری قوانین و قواعد ہی کی تحت مرتب و منظم کرے گا ۔

ہمیں ماوراء حواس اشیاء کا علم نہیں ہو سکتا یعنی ان اشیاء کا جو شعور سے مستقل و غیر محتاج طور پر پائے جاتے ہیں کوئی علم نہیں ہو سکتا ۔ ایسی اشیاء کو کانٹ "اشیاء کماہی" کہتا ہے ۔ علم میں ادراک شامل ہے اور اشیاء کماہی کا حواس کو کوئی ادراک نہیں لہٰذا ہمیں صرف مظاہر ہی کا علم ہوتا ہے ۔ اور نہ ہی عقل سے ان کا ادراک یا وجدان ہو سکتا ہے، ہم میں کوئی "عقلی وجدان" نہیں ہم گویا ذہن کی آنکھ سے اشیاء کا مشاہدہ نہیں کر سکتے ۔ عقل تفکری ملکہ ہے وجدانی نہیں ۔ اگر ہم ایسی شئی کماہی پر مقولات کا انطباق کریں تو ہم ان کو حق بجانب نہیں ثابت کر سکتے ۔ مثلاً ہم یہ نہیں ثابت کر سکتے کہ عقلی دنیا میں ہر شئی بحیثیت ایک جوہر ہی کے پائی جاتی ہے ۔ لیکن ہم ایسی شئی کماہی کے متعلق فکر تو کر سکتے ہیں، کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایسی شئی ہے جس پر ادراک حواس کے کوئی محمولات کا انطباق نہیں ہو سکتا، وہ مکاں میں پائی جاتی ہے نہ زماں میں، اس میں تغیر و زوال نہیں وغیرہ وغیرہ ۔ مگر اس پر کسی ایک مقولہ کا بھی انطباق نہیں ہو سکتا کیونکہ اس امر کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں کہ اسکے بالمقابل کسی شئی کا وجود بھی پایا جاتا ہے ۔ ہم کو یہ علم ہرگز نہ ہوتا کہ تصور جوہر کے بالمقابل کوئی شئی

پائی جاتی ہے اگر ادراک وہ مواد فراہم نہ کرتا جس پر اس مقولہ کا انطباق ہوا ہے ۔ لیکن شئی کماہی کے معاملہ میں ادراک ہماری بالکل مدد نہیں کرتا ۔

شئی کماہی کا تصور نا قابل علم ہے ۔ لیکن یہ تضاد نہیں کیونکہ ہم یہ دعوی تو نہیں کرسکتے کہ عالم مظاہر ہی ادراک کی ایک ممکنہ صورت ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ ہمیں محسوس اشیاء ہی کا حسی علم ہوسکتا ہے اشیاء کماہی کا نہیں، لیکن حواس کو یہ دعوی تو نہیں ہوسکتا کہ وہ ہر اس چیز کا علم رکھتے ہیں جس کو عقل سوچ سکتی ہے لہذا " شئی کماہی " کا تصور بحیثیت ایک ایسی شئی کے جس کا حواس کو علم نہیں ۔ (لیکن جس کو عقلی وجدان[1] میں جاننے کا امکان قابل ذکر باقی رہتا ہے) ایک تحدیدی تصور ہے ۔ وہ حواس سے کہتا ہے ۔ یہ تمھاری حد ہے، تم اس سے آگے نہیں جاسکتے تمھیں صرف مظاہر کا علم ہوسکتا ہے، اشیاء کماہی ' یا بطون، تمھارے حد علم سے ورے ہیں ۔

جس طرح مجھے اشیاء کماہی کا علم نہیں ہوسکتا بلکہ صرف اشیاء کما فی الظاہر کا ہوتا ہے اسی طرح مجھے اپنی ذات یا نفس کا بھی علم نہیں ہوسکتا ۔ مجھے اپنے وجود کا شعور ہے ۔ میں اپنی فعلیت و اختیار کا شعور رکھتا ہوں ۔ لیکن اپنا شعور اپنی ذات کا علم نہیں ۔ جاننے کے معنی ہیں ادراکات حاصل کرنیکے مجھے اپنی ذات یا ایغو کا ادراک نہیں، نہ ہی مجھے اپنی ذات کا عقلی وجدان ہے مجھے اپنی ذات ادراک کے آئینہ میں سے نظر آتی ہے یعنی صورت زمانی کے آئینہ میں سے، کیفیات کے ایک تسلسل کے طور پر ۔ گو مجھے اپنی ذات کا ادراک کے معنی میں علم نہیں، میں اس کو سوچ سکتا ہوں ۔ سچ تو یہ ہے کہ کانٹ کا سارا نظریہ علم ہی ایسے ایغو یا نفس کے ماننے پر منحصر ہے ۔ بغیر ایک شعور ذات رکھنے والے نفس کے وجود کے علم کا امکان ہی نہیں ہوسکتا، لیکن اس نفس کا علم ہمیں اس معنی میں نہیں کہ وہ براہ راست مدرک ہوسکے ۔

کانٹ کے نظریہ علم کا خاکہ مندرجۂ ذیل شکل سے ذہن نشین ہوسکتا ہے :۔

ماورای ایغو یا ذات	مقولات، مکان، زمان		کثرت عطا کردہ حواس یا احساسات	شئی کماہی
لاعلم	(حضوری)	نتیجہ	(حصولی)	لاعلم
		علم مظاہر		

[1] بقول اقبال ؎ زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ ۔ کسے خبر کہ جنوں بھی ہے قابل ادراک !

خلاصہ ۔ ایسی شئی جو ناقابل ادراک ہو اس کا کلی و ضروری علم نہیں حاصل ہوسکتا۔ لہٰذا ایسی مابعد الطبعیات جو تجربہ سے ماوراء لیجاتی ہو، یعنی اشیاء کماہی کی مابعد الطبعیات، وہ مابعد الطبعیات جو ایک غیر مظاہری حقیقی دنیا کا سچا علم عطا کرسکتی ہو ۔ آزادی ارادہ، خلود یا بقا بعد الموت اور خدا کا علم بخشتی ہو نہیں پائی جاتی، اس کا امکان ہی نہیں۔

لیکن عالم مظاہر کا ہمیں حضوری علم ہوسکتا ہے یعنی کلی وضروری علم۔ ریاضیات کے علم کا وجوب ولزوم زمان ومکان کی صورتوں کی وجہ سے ممکن ہے۔ اقلیدس حضوری ادراکِ مکان پر مبنی ہے اور ریاضی عدد کے تصور پر جو حضوری ادراک۔ زمان کا اظہار ہے۔ نیچرل سائنس مقولات پر مبنی ہے۔ یہاں ہم جوہر وعرض، علت ومعلول، تعامل وغیرہ کا ذکر کراتے ہیں۔ ہیوم اور دوسرے تجربیہ گم کردۂ راہ ہیں۔ ہمیں ریاضیات اور طبعیات میں کلی وضروری علم حاصل ہوتا ہے، لیکن یہ صرف مظاہر کا علم ہے، مظاہر کی صرف صورت وترتیب کا علم۔

اشیاء کماہی کا ہمیں علم نہیں ہیوم کا یہ کہنا صحیح تھا۔ لیکن اشیاء کماہی کا وجود ضروری ہے حقیقت میں انکا وجود ہونا ہی چاہئے ورنہ حس کی توجیہ نہیں ہوسکتی۔ مظاہر کے بالمقابل کوئی ایسی چیز ہونی چاہیئے جو اپنا ظہور کررہی ہو جو خارج از ذہن ہو، جو حواس پر اثر کرتی ہو اور علم کا مواد فراہم کرتی ہو۔ اس لئے کانٹ ایک لحظہ کے لئے بھی شئی کماہی کے وجود پر شک نہیں کرتا۔ انتقاد عقل نظری کی دوسری اشاعت میں "تردید تصوریت" کے عنوان کے تحت وہ اس کے وجود کو ثابت کرتا ہے۔ لیکن باوجود شدید اصرار کے کہ شئی کماہی کا وجود ہے اور وہ ہمارے احساسات کے مبدار کے طور پر پائی جاتی ہے، کانٹ اپنے نظام فکر کی ماہیت کی رو سے مجبور ہے کہ وہ اس کو غیر یقینی اور مبہم چھوڑ دے۔ وہ محض ایک تحدیدی تصور بن جاتی ہے، حسی علم کے بلند بانگ دعووں کے لئے ایک قسم کی روک جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ماوراء حواس کا حواس کے ذریعہ علم نہیں حاصل کرسکتے۔

اس طرح کانٹ عقلیت وتجربیت میں مصالحت اور توازن پیدا کرتا ہے۔

میر ولی الدین

نئی زندگی

بے فکر ہوں اب ہر غمِ ہستی ہے گوارا
قسمت سے ملا ہے مجھے جینے کا سہارا

کچھ خوف شبِ غم کی سیاہی کا نہیں ہے
روشن ہے سرِ شام جہاں تاب ستارا

ہمت نے دکھایا ہے مری کشتیِ دل کو
طوفان کی آغوش میں ساحل کا کنارا

پھر شعلہ بنا حسن کے دامن کی ہوا سے
بجھنے ہی کو تھا دل میں محبت کا شرارا

رکتی ہیں گل و سنبل و ریحاں پہ نگاہیں
پُر کیف ہے پھر گلشنِ ہستی کا نظارا

نغموں کا تلاطم ہے مرے سازِ سخن میں
درکار تھا مضرابِ محبت کا اشارا

بدمستِ مئے حال ہوں مڑ کر بھی نہ دیکھوں
اب عشرتِ ماضی نے پکارا تو پکارا

پہنچا ہے محبت کا سفینہ سرِ ساحل
کچھ کر نہ سکا وقت کے سیلاب کا دھارا

سکندر علی وجد

آس

موسم سرما کی پچھلی رات جبکہ سارا عالم میٹھی نیند سو رہا تھا ایک بڈھا دیہاتی شہر کی طرف نہایت شوق سے قدم بڑھائے چلا جا رہا تھا۔ سردی میں کافی شدت تھی اُس کا جسم ٹھٹھرا جا رہا تھا اُس کا پھٹا پرانا لباس اُسے سردی سے بچا نہ سکتا تھا مگر وہ اپنی دھن میں ان مصائب کی پرواہ کئے بغیر آگے بڑھ رہا تھا۔

فضا میں سکون تھا۔ کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے اور چڑیوں کے چہچہانے کے سوا اور کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ بظاہر اس وقت ایسے ضعیف العمر کمزور شخص کا شہر کی مسافت طے کرنا دشوار معلوم ہوتا تھا مگر خدا جانے کون قوت اُسے شہر کی طرف کشاں کشاں لئے جا رہی تھی۔ وہ اپنے عصا کے سہارے آہستہ آہستہ منزل مقصود کی طرف بڑھ رہا تھا۔

سڑک کے ایک طرف درختوں کی قطار تھی، دوسری طرف شہر کا باغِ عام۔ صبح ہو رہی تھی، برسات شروع ہوئی، اولے برسنے لگے۔ بڈھا پہلے ہی سے کمزور، اولوں کی مار نے اس کے نحیف جسم کو سخت اذیت پہنچائی۔ اُس کا سارا جسم زخموں سے چور تھا مگر اُس نے ہمت نہ ہاری ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بڑی سے بڑی مصیبت بھی اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتی ضعیف تھا، کمزور تھا، زخمی ہو چکا تھا مگر ہمت تھی اور نہ جانے کون چیز تھی جو اس کو ان تکالیف کا بھی احساس نہ کرنے دیتی تھی۔

باغِ عام کی دوسری نکڑ پر جدید طرز کی ایک خوبصورت عمارت تھی "ڈاک خانہ" عمارت کے

بورڈ پر کندہ تھا۔ عمارت کو دیکھ کر بڈھے کی آنکھیں دفور مسرت سے چمک اٹھیں۔ چہرے کی جھریوں میں تبسم کی لہریں دوڑنے لگیں۔ اس کی ہمت شکن مسافت کی یہی آخری منزل تھی۔ عمارت میں داخل ہونے کے بعد وہ بازو کی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ اندر چند آدمی ڈاک کھول رہے تھے۔ سردی اب بھی کافی تھی، وہ کانپ رہا تھا، لیکن محبت اور ایقان کی گرمی، سردی کے اثر کو زائل کر رہی تھی۔

منشی پتے پڑھ پڑھ کر خطوط مختلف ڈاکیوں کے حوالے کر رہا تھا۔ بڈھا منشی کی آواز پر کان لگائے بیٹھا تھا۔ یکایک توت "سائیں علی" اس کے کانوں میں آواز آئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اُس کے قدم رک نہ سکے فوراً اندر داخل ہوا۔ منشی سر جھکائے اپنے کام میں مصروف تھا بڈھے نے لجاجت سے پکارا "گوکل بابو"

'کون ؟' پوسٹ ماسٹر نے کہا ——

"کیا آپ نے سائیں علی کا نام نہیں پکارا" بڈھے نے عاجزانہ انداز میں دریافت کیا

" صاحب یہ دیوانہ ہے روزانہ ہمیں اسی طرح دق کیا کرتا ہے حالانکہ اس کا خط کبھی نہ آیا " منشی بڈھے کو نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا ——

بڈھا آہستہ سے اپنی بنچ کی طرف بڑھا جس پر وہ پانچ سال سے بیٹھنے کا عادی تھا۔ بڈھا "علی" کسی زمانہ میں ایک بہترین شکاری تھا جیسے جیسے وہ اپنے فن میں مہارت حاصل کرتا شکار کا شوق بھی ترقی کرتا جاتا۔ اس کی زندگی نہایت دلچسپ اور پرسکون تھی اُسے کسی سے عداوت تھی اور نہ کوئی اُس کا دشمن۔ دنیا میں سوائے اُس کی چہیتی لڑکی مریم کے اور کوئی نہ تھا۔ اس نے مریم کی شادی ایک سپاہی سے کردی۔ مریم اپنے شوہر کے ساتھ پنجاب چلی گئی جہاں اُس کا شوہر ملازم تھا۔ جدائی کے غم سے محبت کی دبی ہوئی چنگاریاں شعلہ بن کر بھڑک اٹھیں دوری کے خیال نے ہزاروں بجلیاں خرمن دل پر گرائیں۔ ایک ایک کرکے پورے پانچ سال گذر گئے خط کا انتظار کرتے کرتے آنکھیں سپید ہوگئیں۔ دل میں رہ رہ کر ہوک اٹھتی اور ایک چپ سی لگ گئی

حال دل آنکھوں سے عیاں تھا۔ خط ملنے کی اُمید اُسے ہر روز پچھلی رات ڈاکخانہ پہنچاتی لوٹتے وقت حسرتوں اور مایوسیوں کے سوا اس کا کوئی غمگسار نہ ہوتا۔ پے در پے مایوسیوں کے بعد بھی خط کی اُمید کبھی ٹوٹی اور نہ ڈاکخانہ کی آمد و رفت میں کچھ فرق آیا۔

علی کی قسمت میں ڈاکخانہ کے ملازمین کی بھی جھڑکیاں لکھی تھیں وہ بُرا بھلا سب کچھ خاموشی سے خط کی خاطر سُن لیتا۔ وہ بلا ناغہ سب سے پہلے دفتر پہنچتا اور سب کے بعد گھر لوٹتا۔ اتفاقاً ایک روز علی کو جاتے ہوئے دیکھ کر پوسٹ ماسٹر نے منشی سے دریافت کیا۔

"کیا یہ شخص دیوانہ ہے؟"

"کون صاحب؟ علی! جی ہاں، بیوقوف ہر روز آیا کرتا ہے اور کہتا ہے کیا میرا خط آیا"! "کس کو اتنی فرصت ہوگی کہ اسے خط لکھے۔

"اور کیا، صاحب، بڑا گنہگار ہے نہ جانے کون گناہ کئے ہیں جن کا یہ پھل ملا"

"دیوانے بھی عجیب مخلوق ہیں!"

"ہاں صاحب! ان کے کرتب عجیب دلچسپ اور انوکھے ہوتے ہیں حال ہی کی بات ہے ایک پاگل ہمارے محلہ میں دن رات مٹی کے گھروندے بناتا اور توڑتا، توڑتا اور بناتا یہی اس کا مشغلہ تھا۔"

پوسٹ ماسٹر بولا "ارے اس سے بھی زیادہ ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ ایک پاگل اپنے گال پر طمانچے مارتا اور خود بلبلا اُٹھتا کہ کسی نے اُسے مارا!!!"

چند دنوں سے علی کو کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ قیاس آرائیاں ہوئیں لیکن کوئی بھی اصل حقیقت تک نہ پہونچا۔ آخر کار ایک مرتبہ پھر علی ڈاکخانہ میں نظر آیا۔ حالت بالکل بدلی ہوئی تھی سخت بیمار تھا سانس مشکل سے لے سکتا تھا۔ جسم پر گوشت کا نام نہ تھا ہڈیاں ہی ہڈیاں تھیں۔ اس کے قلب میں اب بھی وہی تڑپ تھی۔ وہ خلاف معمول پوسٹ ماسٹر کے پاس پہنچا

"ماسٹر صاحب کیا میری پیاری مریم کا خط آیا؟"

پوسٹ ماسٹر نے کوئی جواب نہ دیا۔

"صاحب خدارا ذرا ادھر دیکھئے" م ... م ... م میں علی ہوں" بڈھے نے کہا۔

"جانتا ہوں" پوسٹ ماسٹر نے نہایت کرخت لہجہ میں کہا۔

"حضور ..... شاید میں ... پھر یہاں کبھی نہ آسکوں۔ مریم کا نام لکھیئے وہ میری لڑکی ہے وہ مجھے ضرور خط لکھے گی۔ خط آنے پر برائے خدا مجھ تک پہنچا دیجئے۔"

"بدتمیز یہاں سے فوراً نکل جا" صاحب نے کڑک کر کہا۔

علی کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ ساری امیدیں ٹوٹ چکی تھیں مگر خط کا اب بھی انتظار تھا منشی کو دیکھ کر علی رک گیا۔ اور نہایت محبت سے پکارا۔

"بھیّا؟"

"کیا ہے" منشی نے جواب دیا۔

منشی کو ایک زنگ آلود ڈبہ دیتے ہوئے علی نے کہا اس میں پانچ اشرفیاں ہیں یہی میری زندگی کی کمائی ہے میں بخوشی اس کو آپ کی نذر کرتا ہوں۔ مگر میرا ایک کام کردو۔ کردوگے بھیّا؟

"کیا؟" منشی نے نرم ہوکر پوچھا۔

"خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہو کہ میرا خط آنے پر مجھ تک پہنچا دوگے"

"کہاں"

"میری قبر پر!"

"کیا !!"

ہاں ہاں بھیّا! آج میری زندگی کا آخری دن ہے — آخری دن — اب میں اور جی نہیں سکتا۔ منشی نے اشرفیاں لے لیں اور خط پہنچانے کا وعدہ کیا۔ علی کو پھر کسی نے نہیں دیکھا۔

پوسٹ ماسٹر کی لڑکی کسی اور شہر میں بیمار ہوگئی۔ پوسٹ ماسٹر کو بیٹی کے خط کا سخت

انتظار تھا۔ ڈاک آنے پر اس نے سارے خطوط دیکھے۔ حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے ایک خط پر "سائیس علی" کا نام دیکھا۔ دولت کا خمار سر سے اتر گیا۔ اس کو اب احساس ہوا کہ یہی وہ خط تھا جس کا انتظار علی نے ایک زمانہ تک کیا۔ اس نے منشی کو آواز دی اور تاکیداً حکم دیا کہ فوراً وہ علی کو حاضر کرے۔

پوسٹ ماسٹر کو اپنا خط نہ ملا رات بےچینی سے گذاری جدائی کا مفہوم آج سمجھ میں آیا اور علی کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ ۳ بجتے ہی دفتر پہنچا کیونکہ علی ہمیشہ ۸ بجے صبح آیا کرتا تھا کہ خط دے کر اس کی زندگی کا ارمان اپنے ہاتھوں پورا کرے۔

دفتر پہنچکر بےچینی سے علی کا انتظار کرتا رہا کسی کی آہٹ پاکر اٹھ کھڑا ہوا اور نہایت محبت سے کہا آؤ آؤ بھائی علی آؤ تمھاری مریم کا خط آیا ہے۔ نظریں اٹھائیں معلوم ہوا کہ آنے والا علی نہیں منشی ہے۔

"علی کہاں ہے منشی جی! کیا تم ساتھ نہیں لائے؟

"نہیں صاحب"

"کیوں!"

"اب وہ وہاں ہے جہاں سے کوئی طاقت اس کو آپ کے پاس نہیں لاسکتی"

پوسٹ ماسٹر کا دل بھر آیا آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ہاتھ سے خط گر پڑا۔ جب ذرا سکون ہوا تو پوسٹ ماسٹر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"منشی جی تم نے علی کو نہیں سمجھا۔ سمجھتے بھی کیونکر! اس کو وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو کسی کا باپ ہو اور اس کی چہیتی اولاد اس کی آنکھوں سے دور!!

دنیا کے کاروبار اسی طرح چلتے رہے مریم کا خط علی کی قبر پہ ہے اور وہ اب سکون کی نیند سو رہا ہے۔

سید احمد محی الدین متعلم بی۔ اے (آخری)

حسیات

صبا جاکر یہ کہہ دینا کسی سے کوئی اُکتا گیا ہے زندگی سے

اُلٹ دو پھر بساطِ زندگانی نگاہِ ناز کی جادو گری سے

زمانہ ہوگیا دشمن ہمارا ہوا حاصل یہ اُن کی دوستی سے

شبِ غم آگ لگ جاتی ہے دل میں مہ و انجم کی ٹھنڈی روشنی سے

کرم ہے یہ ترا اے دردِ اُلفت کیا آگاہ مجھ کو زندگی سے

فریبِ التفاتِ خاص دے کر نگاہیں پھیرتے ہو بے رخی سے

مقدر ہی میں تھی خسروؔ تباہی
شکایت کیجئے اب کیا کسی سے

امیر احمد خسروؔ متعلم بی۔اے (عثمانیہ)

جمالیات اور ادب

(تقریر اُردو کانفرنس بزم اُردو جامعہ عثمانیہ)

یہ موضوع جتنا نیا ہے اسی قدر وسیع بھی ہے۔ تھوڑے سے وقت میں اس کا سمجھانا ممکن نہیں اس لئے یہاں صرف دو چار اہم امور پر بحث کی جائے گی۔

یہ موضوع میں نے دو وجوہ سے منتخب کیا ہے۔ ایک تو اس لئے کہ ادب کے سمجھنے کا ایک جدید فلسفہ پیدا ہو چکا ہے اور اس سے استفادہ کرنا موجودہ زمانے کے ادیب کے لئے ضروری ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں ادب کو ایک بہت سستی چیز سمجھ کر اس پر ہر شخص دست درازی کی فکر کر رہا ہے، اور اس پر غیر ذمہ دارانہ تنقید کرنے کی جرأت کر رہا ہے۔ حالانکہ اصولاً ادب کی تخلیق اور تنقید، ایک "صلائے عام" تو نہیں کہ یاران نکتہ دان کے سوائے ہر فرد بشر اپنے بس کی بات سمجھ لے۔

سب جانتے ہیں کہ ادب ایک حسن کارانہ تخلیق ہے، زندگی کی ایک تصویر ہے جس میں ہزاروں زندگیاں موجود رہتی ہیں۔ یہ ایک تہذیب خیال، ایک لطافت نفس، ایک الہامی سیاست اور ایک ذہنی اشتراکیت ہے۔ یہ حقیقت کی تلاش، سچائی کی روح، اور اسے سلیقے کے ساتھ پیش کرنے کی ایک صلاحیت ہے۔ ہر شخص ادب کے ذریعے حسن و کمال کا احساس رکھتا ہے، اس کی لطافت اور کیف سے بہرہ اندوز ہوتا ہے، لیکن اسے سمجھ نہیں سکتا۔ سائنس اور دیگر دماغی اور طبعی علوم سے دلچسپی رکھنے والے لوگ، ادب، اس کی ماہیت اور قدر و قیمت کو سمجھے بغیر یہ کہہ دیتے ہیں کہ دنیا کو سیاست کی ضرورت ہے، سائنس کی ضرورت ہے ادب کی ضرورت نہیں۔ اگر ایسا

نہ کہیں تب بھی ادب اور اس کے فلسفہ جمال کو ایک ذہنی عشرت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ علمی دنیا میں ہنوز یہ طریقہ رائج ہے کہ محض افادی امور اور ضمنی تعلقات کی خرابیوں پر نظر ڈال کے اصل شئے پر حرف زنی کی جائے۔ جب علمی دنیا کا یہ حال ہے تو ظاہر ہے کہ ادب کے عام خوشہ چینیوں کی فہم و ادراک کا کیا حال ہوگا ؟ ہمیں فن جمالیات کا ممنون ہونا چاہئے کہ ہم اس کی بدولت ادب کو یعنی اپنی دماغی اور روحانی زندگی، اس کی قوت عمل اور اثر کو سمجھنے، اور سمجھ کر محسوس کرنے، اور محسوس کر کے، اس کی تخلیق کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔

ہیگل جمالیات کی تشریح جامع الفاظ میں کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

" جمالیات کا مقصد حسن و جمال کی وسیع سلطنت کی تحقیقات کرنا ہے۔ اس لئے اس میں عمومی حیثیت سے آرٹ کا فلسفہ اور خصوصی حیثیت سے ہر فن لطیف پر بحث ہوتی ہے۔"

ادب کے متعلق ایک عام خیال یہ ہے کہ اس کا تعلق آرٹ اور فنون لطیفہ سے ہے میں اب یہ محسوس کرنے لگا ہوں کہ اس دہوکا دینے والی اصطلاح کو ادب کے لئے استعمال نہیں کرنا چاہئے۔ لیکن پھر یہ خیال ہوتا ہے کہ ترقی پسند ادیبوں کا سیلاب اگر اسے فن لطیف نہیں تو موقع پا کر فن کثیف بنا ہی دے گا، اس لئے لطافت کی شرط اس پر عائد رکھنی ضروری ہے۔ ادب کو چاہئے کہ وہ اپنی لطافت قایم رکھے۔ لیکن جدید رجحانات کے اعتبار سے ادب ہماری تلخ زندگیوں میں اتنا دخیل ہو گیا ہے کہ اس کے متعلق یہ کہنا پڑتا ہے۔ "تلخ تر او نکو تر است" اور اس لئے ادب کو فن لطیف کی بجائے " سوز حیات " کے نام سے یاد کریں تو بیجا نہ ہوگا۔

ادب ایک حسن کا راز عمل ہے۔ اس کی تخلیق کے دو حصے ہیں۔ ایک جذبہ اور احساس، دوسرے انکا اظہار۔ پیکر ادب کی روح احساس، اور اس کا جسم (Expression) یا (Representation) ہے۔ فن جمالیات کی رو سے ہم یہ بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ ادب کی تخلیق میں جذبات انسانی کی روح رواں کیا ہے ؟ اس کی تحریکات کونسی ہیں ؟ اُن کا اثر کیا ہے اور یہ جذبات کن خوبصورت سانچوں میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ہمارے مشرقی اہل فکر و نظر کی

ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ مسئلے کو عقل کی روشنی سے زیادہ دل اور احساس کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ اس لئے جہاں مغرب میں کوئی مسئلہ اصول تحقیق کی زد میں آتا ہے، وہاں مشرقی مفکر اس میں ڈوب کر اپنے اوپر ایک پر اسرار بیخودی سی طاری کرلیتا ہے۔ بعض حالتوں میں یہ بیخودی انسانی جذبۂ شعور و ادراک پر مضر اثر ڈالتی ہے۔ اس لئے جمالیات کی روشنی میں ہم عرفان قلب و نظر کو بھی جس کے متعلق حافظ کا یہ مصرع موزوں ہے۔ "کہ کس نکشود و نکشاید ز حکمت ایں معما را" ایک متصوفانہ فلسفے کی آنکھوں سے دیکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان حالات میں ہم جمالیات کے اہم موضوعات کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں —

جذبہ حسن اور مسرت سے بحث ہوتی ہے جس کا تعلق مادی دنیا سے بھی ہے اور روحانی دنیا سے بھی۔ اس طرح جمالیات میں مذہب فلسفہ، نفسیات اور آرٹ کی علمی تحقیقات مشترک ہو جاتی ہیں۔

جب ہم جمالیاتی نقطۂ نظر سے ادب پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس کی تخلیق میں کئی تحریکات کارفرما نظر آتی ہیں۔ میں ان میں سے تین اہم تحریکات کا ذکر کروں گا۔

(۱) Intution یعنی وجدان (۲) تخیل Imagination (۳) Emotion اور Feeling یعنی جذبہ اور تاثر

یہ تحریکات نثری ادب میں اتنی شدید نہیں ہوتیں جتنی کہ شاعری میں ہوتی ہیں۔ میں اپنی تقریر کا موضوع نثر سے زیادہ نظم رکھوں گا۔

اس منزل پر پہلا سوال تو یہی پیدا ہوتا ہے کہ حسن کیا ہے؟ اس کا جواب دینا نہ صرف مشکل ہے بلکہ اس کی تشریح کے لئے ایک ضخیم جلد چاہئے۔ میں یہاں دو چار مفکرین کی رائے اور اپنے تبصرے پر اکتفا کروں گا۔ جملہ نفسیات داں، فلسفی اور ماہر جمالیات اس امر پر متفق ہیں کہ حسن کسی شئے کی کوئی خاص صفت نہیں ہے، بلکہ وہ کسی شئے اور انسان کے احساس کے درمیان ایک ہمدردانہ اور والہانہ تعلق ہے۔ جو شئے کسی انسان کے دائرہ احساس میں آجاتی ہے،

اس میں حسن پیدا ہو جاتا ہے۔ مفکرین کہتے ہیں کہ بعض حیثیتوں سے حسن کار فطرت کے حسن میں اضافہ کرتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس اضافے میں اس کا احساس بھی شامل ہوتا ہے قلب فطرت کا احساس معلوم کرنے کے لئے حضرت احمد جام زندہ پیل جیسی شخصیت کی ضرورت ہے جنہوں نے لافانی الفاظ میں کہا تھا۔

"کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است"

ہیگل حسن کو ایک تمثال۔ Idea قرار دیتا ہے، اور اس کو Abstract (مادی) اور Concrete (غیر مادی) میں تقسیم کرتے ہوئے کہتا ہے کہ حسن ابتدأ ایک تمثال Idea ہوتا ہے۔ جب اس کی داخلی نوعیت ختم ہو کر یہ خارج ہونے، لطیف تر بننے، کسی چیز کا نمائندہ ہونے، یا ہم صورت بننے کی حالت میں آتا ہے تو یہ ایک ہم آہنگ اور تکمیل شدہ شئے بن جانا اور اپنے تعلقات کی کاملیت حاصل کر لیتا ہے۔ کانٹ کہتا ہے کہ حسن کی جب تک تصدیق نہ ہو حُسن حُسن نہیں رہتا۔ اور یہ تصدیق انسان کا ذوق اور قوت فیصلہ کرتی ہے۔ قوت فیصلا ایک پُل ہے جو انسان کی اندرونی دنیا اور بیرونی دنیا کو ملاتا ہے

شوپنھار کے نقطۂ نظر سے حُسن ایک مشیت ایزدی ہے۔ جس چیز میں یہ حیثیت زیادہ ہم آہنگ، کامل اور احساس پذیر نظر آئے وہ چیز حسین ہے۔

نطشے کے قول کے مطابق اس حُسن کا تصور کرنا مشکل ہے جو خارجی اور مادی اشیاء پر اثر انداز نہ ہو۔

ہماری مشرقی شاعری کا موضوع اوّل حسن و عشق ہے، ہمارے نقطۂ نظر سے حسن خالق ازل کا ایک پرتو، اس کی ایک صفت ہے۔ اور انسان اس صفت کا مظہر کامل ہے۔ حضرت خواجہ اجمیری* فرماتے ہیں

؎ اندریں صورت من حسن و حجابے دیدم ہمچو خورشید کہ در آب زلالے دیدم

* بعض مفکرین کا خیال ہے کہ "دیوان معین" جو حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے منسوب ہے وہ در اصل آپ کا نہیں بلکہ آپ کے ہم عصر ایک اور صوفی بزرگ کا ہے جو معین تخلص فرماتے تھے۔

حُسن کے ساتھ ربط اور روحانی تعلق کو عموماً عشق سے تعبیر کیا جاتا ہے مگر میرے نزدیک عشق کی صحیح اور اعلیٰ ترین تعریف اقبالؒ نے کی ہے جو رومیؒ کے تصور عشق پر مبنی ہے۔ وہ یہ کہ عشق معرفت الٰہی اور علم یزدانی کی آخری منزل ہے۔ اب آئیے ہم تحریکات ادب کے تین اہم عناصر وجدان، تخیل اور جذبہ پر غور کریں۔

اطالیہ کا مشہور مفکر کروچے کہتا ہے کہ جملہ حسن کاری ایک قسم کا وجدان (Intution) ہے۔ اور یہ وجدان جب کسی انسان کو حاصل ہو جاتا ہے تو اس کا خیال احساس، جذبہ اور اثر۔ وجدانی بن جاتے ہیں۔ اس لئے وہ جذبہ کے اظہار یعنی Form اور Expression کو بھی وجدان قرار دیتا ہے۔

وجدان کیا ہے؟ اسے معلوم کرنے کے لئے ہمیں جمالیات کے دو اہم نظریوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ ان میں ایک "تھیوڈور لپس" (Theodore Lipps) کا نظریہ "ان فیلنگ" یا امپتھی Empathy ہے۔ یہ نظریہ کہتا ہے کہ حسن کار (ادیب یا شاعر) میں کائنات کے ہر مظہر اور مسئلے میں ڈوبنے، اس کی روح اور کیف معلوم کرنے کی ایک خاص صلاحیت ہوتی ہے۔ یہ جذبہ جسے علامہ اقبال کہیں "سوز و ساز" اور کہیں "ذوق جستجو" سے تعبیر کرتے ہیں حسن کار کا ایک ذہنی ورثہ، ایک دماغی دولت اور روحانی فیض و عطا ہوتا ہے۔ عام نظروں سے ہٹ کر ادیب ورڈسورتھ کی زبان میں کہتا ہے کہ ہر شئے ہر مسئلہ

Flashes upon that inward eye which is the bliss of Solitude

آئیے دو چار شاعروں کی زبان سے بھی "عمیق النظری" اور مسائل حیات کی نسبت کچھ سن لیجئے تاکہ نظریہ " ان فیلنگ " کی نوعیت معلوم ہو جائے۔

اقبال فرماتے ہیں۔

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں ۔ غلغلہ ہائے الاماں، بتکدۂ صفات میں
حور و فرشتہ ہیں اسیر میرے تخیلات میں میری نگاہ سے خلل، تیری تجلیات میں

گاہ مری نگاہ تیز، چیر گئی دلِ وجود گاہ اُلجھ کے رہ گئی میری توہمات میں

غالبؔ کی نظر اس شاندار "عمیق النظری" میں زیادہ شوخ اور زیادہ شاعرانہ واقع ہوئی ہے۔ اس کا مشہور شعر ہے۔

دیدہ در آنکہ تا نہد دل بہ شمار دلبری در رگِ سنگ بنگرد، رقص بتان آذری

سعدیؒ فرماتے ہیں۔

برگِ درختان سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

میرؔ کہتے ہیں۔

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

اصغرؔ کا شعر ہے۔

سُنا ہوں بڑے غور سے افسانۂ ہستی کچھ خواب ہے، کچھ اصل ہے، کچھ طرز ادا ہے

ان نغموں میں خیال کی لطافت کے ساتھ ساتھ، سوچنے کی بات یہ ہے کہ موٹی موٹی تحقیقاتی جلدوں سے زیادہ ہماری روح کو تڑپا دینے والا اثر اور مسخر کرنے والی قوت کہاں سے آئی؟ مشرقی ادب اور شعر میں یہ عمیق النظری مادی اشیاء سے زیادہ، تصورات، حقائق اور فکر و نظر کی پر اسرار فضاؤں میں "طائر شوق" بنکر گھومتی ہے۔ مشرقی شاعر، معشوق کے تصور، نالہ فراق، جمال یزدانی اور وسوسۂ شیطانی، ان کو بھی اسی طرح اپنی عمیق النظری کی جولانگاہ بناتا ہے جس طرح مغربی شاعر مناظر قدرت اور زندگی کے بدیہی تماشوں سے متاثر ہوتا ہے۔ مشرق اور مغرب کی روح اور دماغ کا یہ فرق مدتوں سے چلا آرہا ہے۔ جو لوگ مشرقی ادب کو مغرب کی عینک سے دیکھیں انہیں اس دماغی اور روحانی فرق اور اس سے پیدا ہونیوالے اثر کو اچھی طرح محسوس کر لینا چاہیئے۔ جوشؔ کا قطعہ ہے

بوندیوں کا سلسلہ ہے اور ہلکے ابر سے پڑ رہی ہیں اسطرح سبزی پہ کرنیں گاہ گاہ
وقت گریہ جسطرح مکتوب غم لکھتے ہوئے آنسوؤں سے چھن کے آتی ہے سر کاغذ نگاہ۔ (نقش و نگار)

یہ جدید ذوق جمال کا ایک نمونہ ہے جس میں حقیقت پرستی اور رومان، مغرب اور مشرق ہاتھ ملائے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں ہم قدیم جرمن مفکر سائی سانگ (Zeissang) کے خوبصورت نظریہ Golden Section کو پیش کریں گے جسے Fechner اور Vernon Lee جیسے مفکرین نے آگے بڑھایا۔ اس نظریہ میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ ہر حسن کار (خواہ وہ شاعر ہو مصور ہو، موسیقی دان ہو، مجسمہ ساز ہو، معمار ہو یا کچھ اور) اپنی نظر، احساس اور تخیل میں ہمیشہ ایک قسم کا (Pattern) یعنی نقش دیکھنے، تصور کرنے اور بنانے کی پر اسرار صلاحیت رکھتا ہے۔ ساری کائنات اس کی نظر میں رنگ، خط، تناسب، توازن، نور اور ظلمت خیر و شر کا ایک نقش نظر آتی ہے جسے وہ مشکل کرنے اور انہیں نمود کا ایک قالب عطا کرنے کی کوشش کرتا ہے حسن کار کی آنکھیں ایک کیمرہ، اور اس کا دل و دماغ، روح اور قلب، مصور بن جاتا ہے جس کی وجہ سے جو چیز اس کے مشاہدے یا تصور میں آتی ہے، پر کیف نقش، تصویر، اور مرقع بن کر آتی ہے، مثلاً شیکسپیر نے دنیا کو ناٹک گھر کی تصویر دیکھ کر یہ لافانی الفاظ کہے تھے ——— ایک منظر تمثیل ہے یہ گیتی دوار All the world is a Stage

حسن کاری عمیق النظری اور نقش تصوران دونوں قوتوں میں ایک قسم کا مشترک کیف، مسرت اور بیخودی شامل رہتی ہے۔ ان کی جب نمود ہوتی ہے تو ان پرستی اور لطافت کا ایک غلاف سا چڑھا ہوا ہوتا ہے۔ ان تینوں صفتوں کو وجدان کا مظاہرہ کہئے۔ اس وجدان کی وجہ سے ادب دیگر علوم و فنون سے الگ ہو جاتا ہے۔

اب آئیے تخیل پر غور کریں۔ اس کے لئے میں کولرج (Coleridge) کی مشہور کتاب On Imagination سے ایک جامع تعریف پیش کروں گا۔ یاد رہے کہ میں خشک مفکرین سے زیادہ شاعر یا عمل کے فلسفۂ جمال کو دقیع سمجھتا ہوں کیونکہ بقول غالب۔

بینم از گدازِ دل در جگر آتشے چو سیل   غالب اگر دم سخن، رہ بہ ضمیر من بری

شاعر دل کی آگ اور زحمت شعر گوئی کو محسوس کرتا اور اس سے واقف ہوتا ہے۔
کولرج کہتا ہے۔

"وہ جمع کرنے والی اور سحر انگیز قوت جس کو ہم نے کامل طور پر قوت متخیلہ سے موسوم کیا ہے' متضاد اور مخالف قوتوں کو ہم آہنگ بناتی ہے۔ ان کو متوازن بنانے میں اس کا اظہار ہوتا ہے۔ قدیم اور مانوس چیزوں میں تازگی اور نیرنگی کا احساس اسی سے پیدا ہوتا ہے یہ عام جذبے سے زیادہ ایک کیفیت ہوتی ہے اور اس میں زیادہ تنظیم پائی جاتی ہے۔ یہ ہمیشہ جاگنے والی قوت فیصلہ اور ایک مستقل خود اعتمادی اور خود گیری ہے۔ اس میں جوش اور احساس رہتا ہے جو بہت پُر اثر' اور کبھی بہت عمیق اور کامل ہوتا ہے۔ یہ ایک مترنم خوشی کا احساس ہے' جس میں کثرت کو پُر اثر وحدت بنانے کی قوت رہتی ہے۔ یہ محدود اور منتشر خیالات کو ایک محیط اور مادی خیال اور احساس میں مبدل کرتی ہے۔" اس قدیم تعریف کو ڈاکٹر رچرڈس جیسے جدید نقاد کی تائید حاصل ہے۔ اس کی روشنی میں ہم تخیل کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ وہ ایک ممتاز فکری عمل ہے جو شعور رکھتا ہے اور تخلیق کرتا ہے۔"

ہسپانی زبان میں بچے کو Criatura کہتے ہیں جو لفظ Creare بہ معنی to Generate سے ماخوذ ہے۔ اس میں خالق و مخلوق دونوں کا بہ یک وقت تصور شامل ہے۔ میرے خیال میں جمالیاتی نقطۂ نظر سے ادب کی تخلیق کو بھی ایک معصوم Criatura کہنا چاہئے۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے انسان کا ذہن یادہائے ماضی (Past Memories) حسیات (Sensation) اور تصورات (Conceptions) کا ایک چھاپہ خانہ ہوتا ہے۔ اس کا ذہن غیر محسوس طریقے سے تصورات' گزشتہ یادوں' اور حسیات کے ارتسامات کو قبول کرتا ہے اور قوت تخیل انہیں زندہ رکھتی اور شکل کرتی ہے۔ حسن کار کا تخیل ایک قسم کا Aesthetic impulse یعنی ایک جمالیاتی ہیجان اور تحریک ہوتی ہے جس کی بلند پروازی اور تیزی سے وہ حسن کی تخلیق کرتا ہے۔ یہی تخیل ہے جو ادیب کو بقول افلاطون "فطرت کا مقلد*" بنا دیتا ہے۔ تخیل ہی احساس پیدا کرنے کی ایک ہلکی سی قوت

* یہاں تقلید کے معنی نمایندگی اور تخلیق دونوں کے ہیں۔

بھی ہوتی ہے ۔ گو مشاہدہ اور تجربہ، احساس اور جذبے اس کے حقیقی محرک ہیں یہی وجہ ہے کہ شیکپیر نے شعر کی تعریف میں وہ جامع الفاظ کہے جس کا ادب میں مشکل ہی سے جواب مل سکتا ہے ۔

"The Poets eye in its fine frenzyrolling

Doth Glance from heaven to earth. from earth to haven "

اقبال نے اسی جذبے کے ساتھ تخیل اور نظر کی تعریف کی اور فرمایا ۔

می شود پردۂ چشم پر کاہے گاہے دیدہ ام ہر دو جہاں را بہ نگاہے گاہے

وجدان اور تخیل کو سمجھ لینے کے بعد اب ہم جذبے کی طرف آتے ہیں جو ادب کا تیسرا امتیاز عنصر ہے ۔

سائنس کی دنیا میں انکشاف اور تجربے کی حد تک جذبہ کام کرے اور قوت عمل کو قائم رکھے تو اچھا ہے، ورنہ اگر نتائج عمل میں جذبہ آجائے، تو ساری تحقیق فنا ہوجاتی ہے ۔ اس کے برعکس ادب کی پیداوار میں ہر قدم پر جذبے کی آگ سلگتی ہوئی رہنی چاہئے، ورنہ بیجان الفاظ معنی کی لاش بن کر رہ جاتے ہیں ۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے جذبہ پیدا ہونے کی چار منزلیں ہیں، ایک بیرونی تحریک، دوسری تاثر، تیسرے ردِعمل، چوتھے احساس ۔ مثلاً آپ نے اندھیرے میں کوئی پرچھائیں دیکھی، یہ بیرونی تحریک ہے، آپ کے اعصاب میں ایک حسّی تحریک ہوئی، یہ ہیجان ہے ۔ اس کی اطلاع دماغ کو ہوئی، دماغ نے فوراً چیخ مارنے، منہ چھپانے یا بھاگ جانے کا حکم دیا ۔ یہ ردِعمل ہوا ۔ اس کے آغاز سے بعد تک آپ کے دل و دماغ پر ایک کیفیت طاری رہی، یہ احساس ہے ۔ اگر اس قسم کے کئی احساسات ہوں، تو گذشتہ یادگاروں کے ساتھ مل کر یہ جذبہ بن جاتی ہیں ۔

ادب میں جذبے کو سمجھنے کے لئے ان چار منزلوں کو ذہن نشین کرنا ضروری ہے ۔ ورنہ بغیر بیرونی تحریک، ہیجان اور ردّعمل کے عام طور پر لوگ، ہر دماغی جنبش، اور تصور اور یاد کو جذبے سے تعبیر کرتے ہیں ۔ جمالیات یہ بتاتا ہے کہ حسن کار کا یہ جذبہ تڑپ رکھتا ہے اور اظہار چاہتا ہے۔ علم حیوانات

اس کی تائید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ خوشی اور غم کے اظہار کا جذبہ حیوانوں سے انسانوں کو ورثے میں ملا ہے۔ اس احساس اور اظہار کی تکمیل میں ادب کو چند خاص راستوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ راستہ کا ہر واقعہ، زندگی کی ہر لہر، اور آسمان کا ہر نظارہ، شاعر کے لئے بیرونی تحریک کا باعث نہیں ہوتا، اگر ہوتا ہے تو شاعر ہر ایک کو اپنے ذوق کی چھنی میں چھانتا اور صرف اس کے جمال، لطافت، کیف اور اثر کو چن لیتا اور باقی حصہ پھینک دیتا ہے۔ جب یہ لطافتیں اظہار کی سرحدوں تک پہنچتی ہیں تو ذوق پکار کر کہتا ہے، خبردار، ان لطافتوں کو کثیف قالبوں میں نہ پھنساؤ"۔ اسی لئے ان کے اظہار کا ذریعہ شعر، رنگ، خط، سنگ مرمر، رقص، اور سریلی آواز جیسے لطیف سانچے ہوتے ہیں۔ اگر شفق کی رنگینی کو ڈانبر کے چھینٹوں سے دکھانا چاہو تو ممکن نہیں۔ جب اظہار کا سانچہ ادب میں بجانا ہے تو اسے ہم اپنی اصطلاحوں میں افسانہ، ڈرامہ، غزل، مثنوی اور رباعی کہتے ہیں۔ اس لطیف مجموعے کی طرف اقبال اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

حق اگر سوزے ندارد حکمت است شعر می گردد چو سوز از دل گرفت

اظہار اور سانچے میں جو ایک حد تک خیال کا عکس اور مظہر ہوتا اور مادی اشیاء مثل خط، رنگ، آواز مٹی اور لفظ سے تعلق رکھتا ہے کئی اور جمالیاتی خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ خوبیاں ظرف اور مظروف خیال اور سانچے، احساس اور اظہار میں مشترک ہوتی ہیں۔ جمالیات کی اصطلاح میں انہیں ترنم توازن لے، ترتیب، ہم آہنگی اور تناسب کہتے ہیں۔ اس مختصر تقریر میں ان کی شرح کرتے ہوئے بحث کو آگے بڑھانا ممکن نہیں اس لئے میں جمالیات اور ادب کے باہمی تعلق کو تین اہم صفات وجدان، تخیل اور جذبات کے ساتھ وابستہ دکھاتے ہوئے رخصت ہوتا ہوں۔ ادب، جمالیات کی دوربین سے اس طرح رنگین اور واضح نظر آتا ہے جیسے رصدگاہ میں بیٹھ کر دوربین کے ذریعہ دیکھنے سے چاند، تاروں کی لطافتیں، ہماری آنکھوں کے قریب آجاتی ہیں۔ اس وقت بے اختیار ہماری زبان سے نکلتا ہے۔ اللّٰہُ جَمِیْلٌ وَیُحِبُّ الْجَمَالُ

محمد عبدالقیوم خان باقی

عبادت

سانیٹ

وہ کنول جیسی سراپا حسن کی تصویر ہے
شورش دنیا کی حد سے دور تر اس کا وجود
فکر فردا سے ہمیشہ بے خبر اس کا وجود
وہ مجسم ناز شمع طور کی تنویر ہے

زلف شانے پر پڑی رہتی ہے بل کھاتی ہوئی
چشم پر حسرت پہ ہے اشک مسلسل کی نقاب
جیسے بارش کے دھندلکے میں ہو گردوں پر سحاب
حسن کی رنگینیوں میں ہے بہار آئی ہوئی

خشک ہونٹوں پر نہیں اقرار الفت کا نشان
سرخ لب خوف محبت سے ہیں دانتوں میں دبے
مرمریں گردن حسین نیلی رگوں کے تار سے
حسن کی بدمستیوں میں نغمۂ الفت نہاں
گرچہ اس کی یاد سے دم بھر مجھے فرصت نہیں
لیکن اس کے پاؤں تک چھونے کی بھی ہمت نہیں

(ماخوذ)

عزیز احمد (عثمانیہ)

افسانہ کیا ہے؟

افسانہ ایک مستقل صنف ادب ہے۔ دنیا کی ہر زبان کے ادب میں اس کا وجود قدیم سے ہی افسانہ منظوم کی شکل میں ملتا ہے۔ اس کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی انسانی تخیل کی تاریخ ہوسکتی ہے۔ افسانہ کیا ہے؟ کب سے ہے؟ اور کیوں وجود میں آیا؟ یہ سوالات عموماً ہر متعلم ادب کے پیش نظر رہتے ہیں۔ یہ سوالات اگر زمانہ قدیم کے داستان کہنے اور لکھنے والوں سے یا داستان سننے اور پڑھنے والوں سے کئے جاتے تو وہ شائد سوائے اس کے کوئی جواب نہ دے سکتے کہ افسانہ ایک قصہ ہوتا ہے' یہ ہمیشہ سے موجود ہے اور اس سے جی بہلتا ہے۔ اگر یہ سوال الف لیلہ کے بنیادی کردار شہرزاد سے کیا جاتا تو وہ یہی کہتی کہ' میں نہیں جانتی کہ افسانہ کیا ہے اور کب سے ہے — مجھے تو موت کی گھڑی کو ٹالتے رہنا ہے۔ شہریار سے اگر پوچھا جاتا کہ وہ شہرزاد کی کہانیوں میں اس قدر کیوں کھو گیا کہ اس کو اپنا عہد بھی یاد نہ رہا تو وہ بھی اس کا جواب شاید یہی دیتا کہ اس کو ان کہانیوں میں دلچسپی اور شہرزاد کی طرز ادا میں ایک دل نشین گھلاوٹ ہے اور اس سے اس کو ایک عجیب کیف محسوس ہوتا ہے۔

موجودہ زمانے میں بھی جو لوگ داستان امیر حمزہ' بوستان خیال' یا الف لیلہ پڑھتے ہیں' وہ بھی اسی احساس اور کیف کے زیر اثر پڑھتے ہیں' جس نے الف لیلہ کے شہریار کو متاثر کیا تھا داستان گوئی کا یہ مقصد صرف مشرق ہی کے لئے مختص نہیں ہے بلکہ مغرب میں بھی اب سے بہت پہلے کم و بیش ایسے ہی مقاصد کے لئے داستان سرائی آغاز کی گئی تھی۔ چاسر کی " کنٹر بری کی داستانیں" ((Conterbury Tales))' شاہ آتھر کے کارناموں کے قصے' الیڈ آڈ لیسی وغیرہ سب

اسی قبیل کی داستانیں ہیں۔ اور ان کا مقصد بھی تقریباً یہی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح انسانوں کی ایک بڑی تعداد کی تخئیل کے لئے سامان عشرت بہم پہنچاتے ہیں۔ لیکن زندگی کے اقدار ہر زمانے میں بدلتے رہے ہیں۔ ہمارے کھانے، پینے، سوچنے اور محسوس کرنے کے سارے طریقے بدل گئے ہیں، ہمارے اجداد کا جن باتوں میں جی لگتا تھا، اب وہ باتیں ہم کو زیادہ دیر تک متوجہ نہیں رکھ سکتیں جو مشاغل ان کا دل لبھا سکتے تھے، آج ہم کو بے کیف اور غیر اصلی معلوم ہوتے ہیں۔ ادب کی منزل اب کوئی موہوم اور نامعلوم منزل نہیں رہی ہے، اس کا مقصد اب تخئیل کی عشرت بہم پہنچانا نہیں رہا ہے، ہم تخلیق محض کے اس معصوم دور سے گزر چکے ہیں، آج ہر چیز کی علت، ہر بات کی منطق، اور ہر فعل کی نفسیات ہمارے پیش نظر رہتی ہے۔ یہ تجزیہ اور تنقید کا دور ہے۔ آج کوئی ایسی بات ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہوتی اور ہماری توجہ کو جذب نہیں کرتی جس کا تجزیہ نہ ہو سکے اور جس پر تنقید کی جا سکے۔ ادب کو بھی کسی نہ کسی طرح اسی میزان منطق پر پورا اترنا ہے۔ افسانوں کے جدید رجحانات اسی بنیاد پر قائم ہو رہے ہیں۔ ان کی غایت معین، ان کی منزل ایک معلوم منزل ہے جس کے راستوں کے پیچ و خم اور نشیب و فراز سے افسانہ نگار پوری پوری آگہی رکھتا ہے اور افسانہ خوان اس سے آگہی نہیں رکھتا تو مانوس ضرور ہے۔

افسانہ کیا ہے

افسانہ کی بنیاد چند واقعات پر ہوتی ہے۔ ان واقعات کی ترتیب کو ماجرا یا پلاٹ کہتے ہیں، اس میں جو واردات اور حالات بیان کئے جاتے ہیں ان میں بے شمار ذہنوں کی توجہات کو جذب کر لینے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ جو ماجرا افسانہ کے لئے منتخب کیا جائے اس میں عوام کے لئے کوئی اجنبیت نہ ہو۔ عوام میں یہ اُنس اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب افسانہ میں زمانہ، ماحول اور معاشرت کے سارے اعتقادات اور ذہنی رجحانات کو شامل کر لیا جائے اور اس طرح افسانوی تخئیل اور عوام کی زندگی کے تخئیل میں ایک طرح کا ربط اور ہم آہنگی قائم ہو جائے۔ شاہ آتھر کی مہمات، رستم کے دیوؤں کے ساتھ مقابلے۔ الف لیلہ کے جن اور پریوں کے قصّے عوام کو اس لئے محبوب اور مرغوب تھے کہ ان کے

اپنے اعتقادات اور میلانات کی عکس کشی ان قصوں میں ہوا کرتی تھی۔ ان خلاف قیاس کارناموں سے قطع نظر افسانہ نگار جو ماحول اور کردار پیش کرتا تھا، اس میں عوام خود اپنی تصویریں دیکھتے تھے زمانے کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اقوام کا مزاج نفسی بھی بدلتا رہتا ہے، یہ قدیم افسانے اسی مزاج نفسی کا پتہ دیتے ہیں جو ان کی پیداوار کے زمانے میں نوع انسانی پر مسلط تھا، مافوق الفطر حالات، بہادری کے قصے، عیش و عشرت کی متحیر کردینے والی تفصیلات، یہ سب افسانوں کے ذریعہ کسی نہ کسی مخصوص ماحول کے معاشرتی اور ذہنی رجحان کا پتہ دیتے ہیں "یہ قصے اپنے اپنے زمانے کے لئے محیر العقول ہوں تو ہوں لیکن بعید از قیاس نہیں تھے، یہ اس وقت کی یادگار ہیں جب انسان بہت معصوم تھا اور کسی بات پر یقین لاتے اسے دیر نہیں لگتی تھی[ہ]"۔

انتخاب واقعات افسانہ نگار کا سب سے اہم مرحلہ ہوتا ہے۔ بہت سے ایسے واقعات ہیں جو بظاہر نہایت معمولی اور غیر اہم معلوم ہوتے ہیں لیکن در اصل یہی زندگی کی بہت سی کروٹوں کا سبب اور اہم انقلابات کی بنیاد ہوتے ہیں۔ اور اکثر اوقات ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جو کچھ ہوا وہ کیوں ہوا۔ ایسے ہی واقعات و حالات کو با کمال فن کار عوام کے سامنے بے نقاب کردیتے ہیں۔ بقول ہڈسن، شاعر کی طرح افسانہ نگار میں بھی ایک انکشافی قوت[ے] (Revealing Power) ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ماہر فن کار دوسروں کے تجربوں کو اس طرز سے بیان کرتا ہے کہ اس کی اپنی سرگزشت معلوم ہو۔ وہ اپنی سرگزشت کو اس طرح بیان کرسکتا ہے کہ دوسرے اس کو اپنی روداد سمجھیں اور جو نہ اس پر گزری ہو اور نہ دوسروں پر اس کو کچھ اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ ہر شخص اس کو آپ بیتی سمجھتا ہے۔

افسانوں کے افراد اور اُن کے کردار

افسانہ کا ہر واقعہ کسی نہ کسی فرد سے متعلق ہوتا ہے، کسی واقعے کے گزرنے کے ساتھ ہی دماغ یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ واقعہ کس کے ساتھ گزرا۔ جدید افسانوں میں واقعہ سے زیادہ وہ شخصیت اہم ہوتی جارہی ہے

ہ "افسانہ" مجنوں گورکھپوری صفحہ (۸)

ے An Introduction to the Study of Literature Hudson.

جس سے واقعہ متعلق ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ادبیات میں خارجی حالات سے زیادہ اہم داخلی واردات قرار دی جارہی ہے۔ افسانہ بتدریج داخلی ہوتا جارہا ہے اور انسان کی شخصیت واقعات پر چھاتی جارہی ہے۔ پرانی داستانوں میں ایک شخص معرکے جیت کر رستم بنجاتا تھا۔ یہ خارجی واقعات اس کی شخصیت بناتے تھے لیکن آج کل کا افسانہ نویس ان نفسیاتی محرکات پر غور کرتا ہے جو رستم کے لئے اُن معرکوں میں شریک ہونیکا باعث ہوئے۔ قدیم افسانہ نگار اصل افسانہ اس کو سمجھتا تھا کہ وہ یہ بتائے کہ آتھر نے کیا کیا مصیبتیں برداشت کیں، کیا کیا معرکے سر کئے اور اپنی محبوبہ سے شادی کی ——— اور پھر اس محبوبہ نے لانسلاٹ پر عاشق ہوکر بادشاہ سے دغا کی ——— لیکن اب اصل افسانہ Guenevere ——— گونیور کی دغا کے بعد سے شروع ہوتا ہے، کہ بیوفائی کر کے وہ کس ہیجان اور انتشار میں مبتلا رہی اور کس طرح آخر وقت تک اس کی زندگی ایک کرب مسلسل بن کر رہ گئی۔ اسی طرح حاتم طائی کے کارنامے ہمارے لئے اب اتنے دلچسپ ثابت نہیں ہوتے جتنا یہ سوال کہ حاتم طائی نے آخر یہ سب کیوں کیا۔ وہ کیا محرکات تھیں جنھوں نے اس کو مجبور کیا تھا کہ خواہ مخواہ دوسروں کی بلائیں اپنے سر لے کر مارا مارا پھرے اور اپنی جان جوکھوں میں ڈال دے۔

موجودہ زمانے میں انسان کا کردار ہی سب کچھ ہے۔ یہ بات قطعی اور یقینی ہے کہ ایک ہی واقعہ کا مختلف طبائع پر اثر مختلف ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ طبائع روز بروز واقعات سے زیادہ اہم اور قابلِ لحاظ ہوتی جارہی ہیں۔ شکسپیر کے نقاد اس کی عظمت کے ثبوت میں اسکی کردار نگاری کی قوت کو پیش کرتے ہیں۔ اگر اتھیلو کی جگہ ہملٹ اور ہملٹ کی جگہ اتھیلو ہوتے تو یہ تمثیلیں المیہ نہیں بن سکتی تھیں۔ میکبتھ (Macbeth) اور بیانکو (Banquo) دونوں بیک وقت اور ایک ہی مقام پر جادوگرنیوں سے ملتے ہیں، لیکن ان کی پیش گوئی کا اثر جس طرح میکبتھ قبول کرتا ہے وہ بیانکو نہیں کرتا۔ یہ در اصل کردار اور طبائع کا اختلاف ہے۔ جدید افسانہ میں اس کی بڑی اہمیت ہے، اس فرق کے اصل محرکات کی تشریح کا نام تجزیہ نفسی ہے۔

جدید افسانے میں یہ نفسیاتی تجزیہ افسانہ کے کردار کو عام انسانوں سے علیحدہ تو نہیں لیکن اُس کو ایک منفرد حیثیت ضرور بخش دیتا ہے ۔ افراد افسانہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسی ماحول کے ہوں اور ہر شخص ان کو اپنی شخصیت سے قریب محسوس کرے یا اس کو ایسی شخصیت سمجھے جس سے اُس کو زندگی میں کبھی نہ کبھی سابقہ ضرور پڑا ہے یا پڑنے والا ہے ۔ سٹیونسن نے میرڈیتھ کے Egoist خود پرست کی کردار نگاری کی مثال دیتے ہوئے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ جب یہ ناول چھپ کر شائع ہوا، جس کسی نے بھی اُس کو پڑھا یہ سمجھا کہ وہ خود افسانے کا مرکزی کردار ولوبی Willoughby ہے، ایک نوجوان تو غصہ میں میرڈیتھ کے پاس پہونچا اور کہنے لگا کہ تم نے "ولوبی" کے پردے میں دراصل میری تصویر کھینچی ہے اور اس طرح مجھے رسوا اور بدنام کردیا ہے۔ کردار نگاری کی یہ مکمل اور کامیاب ترین مثال ہے ۔ افسانے کے ایسے ہی کردار دنیائے ادب میں بقائے دوام حاصل کر لیتے ہیں ۔ ان کی کردار نگاری میں فن کار ایسی مہارت سے کام لیتا ہے کہ ایک خاص طرز کا کردار تعمیر کرنے کے لئے وہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بھی نظر انداز نہیں کرتا، اور جب وہ اس میں کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر وہ اس کے ہی افسانے کا کردار نہیں رہتا بلکہ ایک خاص طرزِ زندگی اور نقطۂ فکر کا مستقل اشارہ یا استعارہ Symbol بن جاتا ہے جس سے ہم کو زندگی میں کہیں نہ کہیں اور کبھی نہ کبھی دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ اُردو میں ایسے مکمل کردار تو موجود نہیں ہیں لیکن سجاد حسین کا حاجی بغلول اور سرشار کا خدائی فوجدار ڈان کوبکزوٹ Don Quxet کی یاد دلاتے ہیں ۔ نذیر احمد، مرزا رسوا، اور پریم چند کے ہاں بھی بعض مستقل کردار ہیں ۔ گو یہ کردار اتنے مکمل نہیں ہیں کہ ان کو ایک طرز قرار دیا جاسکے، لیکن ان بزرگوں نے اُردو افسانے کو جو کچھ دیا ہے اس کو تاریخ ادبِ اُردو کا متعلم فراموش نہیں کرسکتا ۔

افسانہ نگار کا نقطۂ فکر واقعات اور کردار کے بعد افسانہ کا تیسرا عنصر جس سے افسانہ مرتب ہوتا ہے وہ فسانہ نگار کا اپنا نقطۂ خیال ہے ۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر حیاتِ انسانی، افسانہ کا معیّن موضوع ہو چکی ہے ۔ افسانہ نگار جس زندگی کو پیش کرتا ہے

اس کے متعلق اس کی اپنی رائے ضرور ہوتی ہے ۔ زندگی سے متعلق اس کے جو کچھ خیالات اور تاثرات ہیں ان کا عکس لازمی طور پر اس کے افسانے میں نظر آتا ہے ۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ افسانہ نگار خاص اہتمام اور مقصد سے اپنا نقطۂ خیال افسانے میں پیش کرے ۔ افسانے میں مصنف کا نقطۂ خیال پڑھنے والے کے دل و دماغ پر مسلط نہیں کردیا جاتا بلکہ واقعات کی ترتیب، کردار کی نفسیاتی تحلیل، اور دوسرے افسانوی محاکات مل ملاکر غیر شعوری طور پر پڑھنے والے کے دل میں اپنا گھر کرلیتے ہیں اور وہ یہ محسوس نہیں کرنے پاتا کہ کسی خاص نظریہ یا خیال کو اس پر مسلط کرنے کی کوئی کوشش کی گئی ہے ۔ نظریات کی اسی دلنشینی کی خصوصیت کو ادب کی زبان میں افسانے کا بے غرض و غایت ہوتے ہوئے بھی غایتی ہونا کہا جاتا ہے ۔ اردو زبان میں غایتی افسانوں کی ابتدا کم و بیش پچاس برس پہلے ہوتی ہے جب مولوی نذیر احمد نے اصلاح معاشرت کی غرض سے قصے لکھے ۔ لیکن ان قصوں کا غایتی میلان دنیا کے دوسرے شاہکاروں کی طرح چھپا ہوا نہیں ہے، پڑھنے والا بہت جلد محسوس کرنے لگتا ہے کہ مصنف کسی خاص نقطۂ خیال کی تبلیغ کرنی چاہتا ہے، گو ان کے شگفتہ طرزِ تحریر کی وجہ سے ان کی تبلیغ گراں نہیں گزرتی ۔ پریم چند کے ہاں یہ غایتی میلان (Purpose Bias) چھپا ہوا ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ دلنشین بھی ہوتا ہے ۔ اس پر تفصیل سے بحث آئندہ موقع پر کی جائے گی ۔

اسلوب واقعات، کردار اور نقطۂ خیال کے بعد افسانے کا چوتھا اہم عنصر اسلوب ہے، اسلوب میں زبان، اثر آفرینی، طنز، ظرافت، غرض تحریر کی ساری خصوصیات شامل ہیں ۔

افسانہ کی کامیابی کا بڑا راز اسلوب کی شگفتگی اور پختگی میں مضمر ہوتا ہے، نہایت ہی مرتب واقعات مکمل کردار نگاری اور بہترین نقطۂ خیال کی پیش کشی کے باوجود اگر پیرایۂ اظہار مناسب نہ ہو تو افسانے کی قیمت گھٹ جاتی ہے ۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ "نذیر احمد کے اصلاحی افسانوں کی سب سے بڑی اہمیت یہی ہے کہ ان کا اسلوب[1] نہایت شگفتہ اور دلپذیر ہوتا ہے اور اسی وجہ سے ہم ان کے پیغام کی کہنگی اور بے کیفی کو آج بھی مشکل سے محسوس کرتے ہیں" نذیر احمد کا اسلوب قصے کی کیفیات سے

[1] افسانہ مجنوں گورکھپوری

بہت زیادہ ہم آہنگ ہوتا ہے، ان کے ہاں سوز و گداز اور طنز و ظرافت سب موجود ہیں"۔

دنیا کے ہر بڑے افسانہ نگار میں چاہے افسانہ نگاری کی دوسری خصوصیات موجود ہوں یا نہ ہوں وہ صاحبِ طرز ضرور ہوتا ہے۔ اُردو میں اور بھی ایسے صاحبِ طرز افسانہ نگار موجود ہیں جو اپنے اسلوبِ نگارش سے اُردو ادب میں ممتاز اور رفیع مقام کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔ موقع پر تفصیل سے ان کے اسالیب پر بحث کی جائے گی۔

غایت یہاں تک تو اس سوال کا جواب تھا کہ افسانہ در اصل کیا ہے اور اس کو کیا ہونا چاہئے اب دوسرا سوال پیش نظر ہوتا ہے کہ افسانے کا مقصد کیا ہے اور اس کی ضرورت کیوں ہوئی۔ اس سوال کے جواب میں مختلف نقاطِ نظر پیش کئے جاتے رہے ہیں۔ ان میں سے دو ایک پر یہاں بحث کی جائے گی۔ نقادوں کی ایک جماعت کا خیال ہے کہ ہم واقعات کی سنگینی کی تاب نہ لا کر فنونِ لطیفہ کے ذریعہ اپنے لئے ایک تخیلی حصار پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک واقعی دنیا سے گریز ہی فنونِ لطیفہ کی اصل غایت ہے، فنونِ لطیفہ کا یہ تصور عہدِ قدیم کے فنون پر پورا اترتا ہو تو اترتا ہو، لیکن آج تصورات بدل گئے ہیں، وہ دن گئے کہ تلخیوں کو چھپانے کے لئے افسانے اور شعر کی نقاب ہم زندگی پر ڈال دیا کرتے تھے، اب زندگی کی تلخ حقیقتوں کو پوری صداقت اور واقعیت کے ساتھ پیش کرنا ہی ہر آرٹ کا مقصد بن گیا ہے، ہم جس قدر زیادہ ان تلخ اور سنگین حقیقتوں سے واقف ہوتے جاتے ہیں ہم میں زندگی کی تاب اور شدائد سے دوچار ہونے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ فنونِ لطیفہ کا کام جہاں ہم میں تابِ زندگی اور حوصلۂ مقاومت پیدا کرنا ہے وہیں ہمارے تخیل اور احساس میں تمکین اور رفعت پیدا کرنا بھی ہے۔

Sublimation.

انسان کو قدم قدم پر احساس ہوتا ہے کہ اس کی زندگی میں کسی نہ کسی چیز کی کمی ضرور ہے، وہ خود ناقص ہے، اس کی زندگی ناقص ہے، اس کے خارج اور باطن میں بہت سی خامیاں ہیں۔ یعنی انسان کی زندگی اس کے تخیل پر پوری نہیں اُترتی۔ زندگی کی تکمیل اور نصب العین کی

تسکین کی آرزو ہمیشہ اس کے دل میں موجزن رہتی ہے ۔

افسانہ ہمارے فطری جذبات و میلانات کو ایسے گہرے رنگ میں پیش کرتا ہے کہ ہم اس میں صاف پڑھ لیتے ہیں کہ یہ میلانات اگر اپنی حدِ تکمیل تک پہنچ جاتے تو کیا صورت اختیار کرتے ۔ افسانہ ہر چیز کو اس کی منطقی انتہا تک پہنچا دیتا ہے جو اس کی تخئیلی انتہا بھی ہوتی ہے ۔

افسانے کی تخیلی غایت روز بروز اہمیت حاصل کرتی جا رہی ہے، دورِ جدید کے افسانوں میں عموماً کسی نہ کسی نصب العین کو پیش نظر رکھا جاتا ہے آج ہر زبان میں ایسے افسانے بے شمار ملتے ہیں جن میں تمدن اور ہیئت اجتماعی، کوئی نہ کوئی تصور پیش کیا جاتا ہے ۔ افسانے سے وہ کام لیا جا رہا ہے جو نہ شاعری سے لیا جا سکا نہ مقالہ نگاری سے ۔ افسانہ براہِ راست ہماری زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے ۔ کبھی اس میں ہم کو اپنے رجحانات کی تصویر نظر آتی ہے اور کبھی ہم اس کے خاکے پر اپنے میلانات کو ڈھالنے لگتے ہیں ۔

افسانے کی ہیئت ترکیبی اور اس کے غایت کا یہ ایک مختصر خاکہ تھا، دنیا کی ہر زبان میں افسانے ان ہی خاکوں سے بن رہے ہیں، اردو زبان بھی اس عالمی اثر سے بے نیاز نہیں رہ سکتی جو قوموں اور جماعتوں کے رجحانات بدل رہا ہے، بنا رہا ہے، اور مٹا رہا ہے ۔

محمد عمر مہاجر ایم ۔ اے (عثمانیہ)

"ٹیگور کی یاد میں جس نے جدید تہذیب کے طلسم میں مشرق کے
حسن کو نکھارا ـــــ اپنے آنسوؤں کو ان اشعار کی ساتھ مادر جامعہ
کی خدمت میں پیش کرتا ہوں"۔

صدائے گردش ایام لے کے آیا ہوں
تجلی سحر و شام لے کے آیا ہوں

جو پل رہا ہے مری مضطرب امنگوں میں
حیات نو کا وہ پیغام لے کے آیا ہوں

جو بجلیوں کی جوانی سے لائے روحِ شراب
میں تیری بزم میں وہ جام لے کے آیا ہوں

جو بال و پر کا سہارا نہ لے وہ اک پرواز
جو ٹوٹنے کو ہے وہ دام لے کے آیا ہوں

جو اضطراب سے پایا ہے زندگانی نے
ان آنسوؤں میں وہ انعام لیکے آیا ہوں

ترے دیار کے شانے ہلا سکوں شائد
ترے شباب کا میں نام لے کے آیا ہوں

(میکش)

محبت کا فرشتہ

بانسری کی لے پہ جیسے جاگتے تاروں کا ناچ — سردیوں کی کپکپی کو چوم لے جس طرح آنچ
چاندنی کی کروٹیں جیسے اندھیری رات میں — جیسے ندی کی روانی آخری برسات میں
جیسے لہریں چھیڑ دیں، دھیمے سُروں میں جل ترنگ — جیسے کلیوں میں سما جائے بہاروں کی امنگ
بن کی خاموشی میں جیسے مست کوئل کی پکار — آسماں کی چھت پہ جیسے ابر کے نقش و نگار
جیسے کہساروں کے ماتھے پر شفق کی دھاریاں — جیسے تتلی کی حسیں پرواز میں گل کاریاں
صبح کے سینے پہ تھرکے جیسے سورج کا جمال — رات کے خوابوں میں جاگیں جیسے دلھن کے خیال
کالے کالے آسماں میں جیسے بجلی کی لکیر — جیسے زنجیروں سے کھیلے قید خانے میں اسیر
جیسے نغمہ ہونٹ پر مطرب کے آکر گنگنائے — جیسے، آنسو، مسکراہٹ کی جلو میں تھرتھرائے
جیسے سُوکھی پتیوں کی گود میں تازہ گلاب — جیسے نورس پھول کے ہونٹوں پہ شبنم کی شراب
جیسے ریگستان میں اک گنگناتی جوئبار — جیسے آنکھوں میں کسی بچھڑے ہوئے کا انتظار
جیسے ساون کی گھٹا، قوس قزح کو چوم لے — جیسے بجلی، سُن کے تاروں کی کہانی جھوم لے
جیسے آندھی کے جگر پر پھول کی پتی کا وار — جس طرح طوفان کے دامن میں مانجھی کا قرار
جو تخیل سے بھی آگے بڑھ کے دیکھے وہ نگاہ — قلب گیتی میں جو بن کر داغ رہ جائے وہ آہ

نرم و نازک چھاؤں جیسے دوپہر کی دھوپ میں
اک "محبت کا فرشتہ" آدمی کے روپ میں

نغموں کی زندگی

جس کو اپنے پاس پا کر گنگنائیں آبشار — جس کو ہنستا دیکھ کر دنیا میں لہرائے بہار

آنسوؤں میں جس کے ڈھلنے کے لئے آئیں نجوم
جس کی ہر آواز پر رنگینیوں کا ہو ہجوم

جس سے جھرنے زندگی کا گیت گانا سیکھ جائیں
گا کے دھیمے سر میں تاروں کو بلانا سیکھ جائیں

جس کی آنکھوں سے ملے فطرت کے نظاروں کو رنگ
جس کی آہوں میں پلے نورس بہاروں کی ترنگ

جس کی دنیا خواب کی دنیا سے بھی رنگین تر
ڈھونڈتا پھرتا ہو جسکی آرزوؤں کو اثر

جس کے چہرے پر سحر کا نور ہوتا ہو نثار
جس کے کاکل کیلئے پھولوں میں آجائے نکھار

جس کا سورج مغربی چوٹی پہ دکھلائے نمود
جو دلِ مشرق سے نکلے بن کے رازِ ہست و بود

جس کے نغموں میں محبت بن کے آئے زندگی
جس کے سجدوں میں بلندی سیکھ جائے بندگی

شام دینے آئے جس کی فکر کو نورِ حیات
صبح جس کے واسطے پیدا کرے اک کائنات

جس کو محوِ فکر پاکر لفظ بن جائے خیال
جس کے چرنوں کی پرستش کیلئے آئے کمال

جس کی انسانی محبت، دیوتاؤں کا پیام
جس کی پروازِ تخیل میں فرشتوں کا خرام

حسن میں گم ہو کے جو دے عشق کو نذرِ حیات
جو بنائے دل کو رنگیں دھڑکنوں کی کائنات

جس کے آگے حسن چہرے سے الٹ ڈالے نقاب
جس کے احساسات کو خود عشق دے اپنا شباب

جس کو چھو کر مسکرا اٹھیں خزاں آمادہ پھول
جو محبت کو بنا دے زندگانی کا اصول

دل کی گہرائی میں جو روشن کرے شمعِ یقین
اس زمیں کو جو بنائے دیوتاؤں کی زمین

آنسوؤں کا ہار

وہ نہیں محفل کی ساری زندگانی ہے اداس
لٹ گئی لے دے کے جو کچھ رہ گئی تھی دل میں آس

لے گئی جانے کہاں اس کو محبت کی تلاش
آنسوؤں میں بہ رہا ہے پھر دلوں کا ارتعاش

سوگ میں ڈوبی ہوئی ہے گردشِ لیل و نہار
پھر وطن پہنے ہوئے ہے خون کے اشکوں کا ہار

اقبال

تھا ابھی بچھڑے ہوئے اقبال کا اک تازہ داغ
دل کی بستی میں بجھا اک اور نورانی چراغ
ایک نے بخشا تھا میرے حوصلوں کو سوز و ساز
ایک نے کھولے تھے مجھ پر کائناتِ دل کے راز
ایک نے آواز دی تھی جرأت پرواز کو
ایک نے چھیڑا تھا بیٹھی لَے میں دل کے ساز کو
ایک تھا جھرنے کا نغمہ، ایک جوشِ آبشار
ایک آہنگ سکوں تھا اک پیامِ اضطرار

کارواں گم کردہ منزل دور سیر کارواں
پھر یقیں گھٹتا چلا ہے، بڑھ رہا ہے پھر گماں
موت نے جاگی ہوئی آواز ہم سے چھین لی
حوصلوں کی جرأتِ پرواز ہم سے چھین لی
آج دونوں کی ضرورت ہے وطن کی خاک کو
آرزوئیں چاہئیں اس سینۂ صد چاک کو

انسانیت کی آبرو

اس زمانے میں کہ ہے بے بس پہ یہ دنیا حرام
کٹ رہا ہے وہم آزادی پہ احساسِ غلام
خون کے چھینٹوں سے رنگیں ہو رہی ہے زندگی
موت کی ہڑبونگ میں بھی سو رہی ہے زندگی
جاہلوں کی تیرہ بختی، عقلمندوں کا شعور
ایک گہری بے حسی ہے ایک لاحاصل غرور
چیخ مزدوروں کی اور سرمایہ داروں کا سرود
دُود پر شعلہ ہے لرزاں اور ہے شعلہ پہ دُود
ہو رہا ہے حل لہو انسان کا فولاد میں
مر رہی ہے ہر نمو، آغوشِ استبداد میں
بج رہے ہیں محفلِ ہستی میں بربادی کے ڈھول
بک رہا ہے بے گناہوں کا لہو پانی کے مول
ٹھوکریں کھاتی ہوئی پھرتی ہے آوازِ ضمیر
بن رہا ہے پاپ سے تکمیلِ ہستی کا خمیر
ایک بھوکی چیل کی مانند بے رونق سماج
لے رہی ہے نزع کے ماروں سے سانسوں کا خراج

کتنے دل ٹوٹے پڑے ہیں سینۂ خاشاک میں
کتنے جوہر ہو رہے ہیں دفن قلب خاک میں

اونچے اونچے پرچموں کی مسکراتی چھاؤں میں
کتنی زنجیریں ہیں گریاں پیتوں کے پاؤں میں

ہیں خلا میں شعلہ افگن کتنی آوازیں مہیب
کتنی آہوں کا دھواں ہے آسمانوں کے قریب

خون میں لتھڑی ہوی ہے ہر مقدس آرزو
تیغ کے دھاروں پہ ہے انسانیت کی آبرو

سرنگوں ہے انتہا اور ابتدا ہے خود سری
زندگی ہے صرف چند الفاظ کی بازی گری

آدمیت پر ہے طاری اک تباہی کا خمار
ہے مسافر اک دوراہے پر مگر راہیں ہزار

ہچکیوں میں زندگانی کا شکستہ ساز ہے
یہ شکست زندگی کی آخری آواز ہے

وقت کا فرمان

جھونک دی ہے نسل انسانی ہوس نے آگ میں
قہقہہ ابلیس کا ہے نازیت کے راگ میں

وقت کی آواز جن کے دل کا کرتی ہے طواف
اٹھ کھڑے ہوتے ہیں وہ باطل ارادوں کے خلاف

امن و نسل آدمیت کے نگہباں دم بہ دم
سر کٹا کر چومتے ہیں امن کے نقش قدم

جن کی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں حقایق کا جمال
جاگتا ہے ان کے دل میں آج ہی کل کا خیال

وقت کا فرمان جب ہوتا ہے ٹل سکتا نہیں
حرص جس کو لے کے اٹھے وہ سنبھل سکتا نہیں

ٹوٹتے جاتے ہیں پیہم نازیت کے پیچ و خم
کھل رہا ہے رفتہ رفتہ بند مٹھی کا بھرم

دھجیاں ہو کر رہے گا آمریت کا لباس
پی کے انسانی لہو بجھ جائے گی دنیا کی پیاس

ایک تصور

شائد ان شعلوں سے دنیا کو ملے تازہ حیات
شائد ایسی کشمکش سے امن پائے کائنات

زندگی کے زرد چہرے پر ہے برسوں کی تھکن
شائد ان تاریک لمحوں سے نکل آئے کرن

شائد اس طوفان میں تکمیل پا جائے سکون
شائد اس ٹھوکر سے آنکھیں کھول دے اندھا جنون

شائد اس سیلاب میں بہ جائے دنیائے کہن
شائد ان سوکھے ہوئے کانٹوں پہ ابھرے پھولبن

شائد ان بھٹکی ہوئی روحوں کا سوزِ ناتمام
حوصلوں کی گمرہی میں دیکھ لے اپنا مقام

رینگتے سایوں کی کروٹ منجمد سانسوں کا راگ
وقت کی دیوانگی کا چھین لے شائد سہاگ

کھوکھلا دل، نیم مردہ زندگی، خالی دماغ
شائد ان پرچھائیوں ہی سے سلگ جائے چراغ

فطرتِ معصوم سے دنیا کا یہ سنگین سلوک
شائد انسانی ہوس سے چھین لے صدیوں کی بھوک

خار و خس کے ساتھ شائد بجلیوں کی یہ نباہ
زندگی کی جھریوں سے نوچ لے داغِ سیاہ

شائد ان پگ ڈنڈیوں میں کھلے اک شاہ راہ
شائد اس اندھے کنوئیں میں غرق ہو جائیں گناہ°

اس گمرہی سے ہو شائد ایک صبحِ نو طلوع
شائد اس انجام سے اک اور دنیا ہو شروع

۱۹۶۱

امن کا پیغام بر

کاش ایسے میں کہیں دنیا کو آ جائے نظر
شاعرِ حسن و محبت، امن کا پیغام بر

شانتی کا اک نیا سندیش دے سنسار کو
اپنے جادو سے دبا دے خون کے منجدھار کو

بانسری کی لے سے نبضوں میں دوڑا دے لہو
حسن کو دے پھر تجلی، عشق کو پھر آرزو

اُڑ نہ جائے باغ کے مسلے ہوئے پھولوں کا رنگ
ڈال دے سینے میں ان کے اپنے نغموں سے امنگ

ہو نہ جائے راکھ جل کر یہ دیارِ خار و خس
ڈال دے بجلی سے لے کر اس کے سینے میں نفس

کل کا یہ جاگا ہوا پھر ہو نہ جائے محوِ خواب
لے کے طوفانوں سے اس کو بخش دے اک اضطراب

چلتی پھرتی میتوں کو زندگانی بخش دے
زندگانی کیا، حیاتِ جاودانی بخش دے

دہر ہے بے چین اس کے گیت سننے کیلئے
ظلمتوں میں نور کی کرنوں کو چھننے کیلئے

میکش

موجودہ تہذیب میں سائنس کا حصہ

آج جبکہ گوئرنگ کے قول کے مطابق فاشست قوتیں مکھن کے بجائے صرف توپیں تیار کر کے انسانی تہذیب کو تباہ کرنے پر آمادہ ہیں۔ سائنس اور سماج کے تعلقات کی نوعیت کا جاننا بہت ضروری ہے۔ وہ لوگ جو سماجی حالات سے واقف ہوتے ہیں لیکن سائنس کی تاریخ اور بنیادی اصولوں سے ناواقف رہتے ہیں موجودہ نظام کی ساری برائیوں کا الزام سائنس کے سر تھوپتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ سائنس دان جو سماجی حالات کی نوعیت نہیں جانتے سائنس کو ان الزامات سے بری سمجھتے ہیں اور اسے تجربہ خانہ کے شیشہ کی پری تصور کرتے ہیں۔ ایسی پری جو باہر کی دنیا پر نگاہ نہیں ڈالتی۔ اول الذکر اپنے بیان کے ثبوت میں جنگ کی تباہ کاریوں اور بے روزگاری کی دشواریوں کی مثال پیش کرتے ہیں اور آخر الذکر مہتاب کے انجن، بجلی اور لاسلکی کی برکتوں کی مثالیں ان دونوں دعوں میں سچائی ضرور ہے لیکن نامکمل۔ سچ تو یہ ہے کہ ان دنوں اکثر خود غرض حکومتیں اپنے ذاتی نفع کی خاطر سائنس کو اپنا آلہ کار بنائے ہوئے ہیں اور سائنس کے اس تاجرانہ استعمال سے انسانی تہذیب و تمدن بڑے خطرہ میں ہے۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ بغیر سائنس کی مدد کے نہ تو ہماری سماج مادی اور روحانی ترقی کے زینے طے کرسکتی ہے اور نہ تہذیب کی برکتیں عام ہوسکتی ہیں۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ سائنس مختلف معلومات کا ایک خشک مجموعہ ہے۔ اور سائنس دان ان معلومات کی وجہ سے فطرت پر قابو پانے کی ایک ناقابل بیان قدرت رکھتا ہے۔ لیکن بعض لوگ سائنس میں اس سے کچھ زیادہ

پاتے ہیں۔ ان کے نزدیک سائنس کائنات کو سمجھنے اور اس کی اصلی حقیقت پانے کی ایک مسلسل کوشش ہے۔ معلومات کا وہ مجموعہ جسے سائنس کہا جاتا ہے اپنی وسعت اور اپنی تفصیل میں سائنس دانوں کی کوشش سے برابر بڑھ رہا ہے۔ ان دو خیالوں کے برخلاف ایک معمولی سائنس دان جسے زیادہ غور و فکر کی فرصت نہیں ہے۔ سمجھتا ہے کہ سائنس اس کے تجربہ خانہ میں روز کی مشغولیت کا نام ہے۔ جس میں مختلف چیزوں کی خاصیتوں کی چھان بین اور ان کے نئے نئے مقدمات کی مدد سے تشریح کرنے کی کوشش دوش بدوش چلتی ہے اس کے علاوہ وہ دولتمند ہیں جو سائنس دانوں کا خرچ برداشت کرتے ہیں ان کے نزدیک سائنس چیزوں کی لاگت کم کرنے اور پیدائش بڑھانے کا ایک نیا طریقہ ہے جو کسی قدر مشتبہ ضرور ہے مگر اکثر کثیر منافع کا باعث ہوتا ہے ان کے نزدیک گویا سائنس بھی ایک بازاری چیز ہے جس کا سود مند اور زیاں کار ہونا حالات پر مبنی ہے۔ ان تمام نظریوں میں کچھ نہ کچھ حقیقت ہے گویا ایک ہی چیز مختلف زاویوں سے دیکھی جارہی ہے مگر کسی ایک زاویہ کا منظر اس کی اصلی حقیقت کا مظہر نہیں ہے۔ اگر ہم سائنس کی ہر حیثیت کو سمجھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اسے زیادہ وسیع نقطۂ نظر سے انسانی تہذیب کی تاریخ کے پس منظر میں دیکھنا پڑیگا جس میں سائنس انسان کے ایک کارنامہ کی شکل میں دکھائی دیگی ایسا کارنامہ جو گزشتہ چند صدیوں میں انسان کی اجتماعی زندگی میں بڑی بڑی تبدیلیوں کا ذمہ دار رہا ہے۔

جدید سائنس کی ابتدا ان سیاسی اقتصادی اور صنعتی طاقتوں کی وجہ سے ہوئی جو سولہویں صدی میں مغربی یورپ میں کارفرما تھیں۔ انھیں ابتدائی کوششوں کی وجہ سے سائنس کی ضرورت پڑی مگر ایک دفعہ جب سائنس نے قدم جمالئے تو اس نے صنعتی طاقتوں کی مدد کی اور بعد میں انکو ہدایت کرنے لگی ساری انیسویں صدی میں عام طور پر سائنس انسانی ترقی اور بہبودی کا آلہ کار سمجھی جاتی تھی مگر ہمارے زمانہ کی نت نئی دقتوں نے یہ خیال کسی قدر بدل دیا ہے۔ آج کل سائنس کے خلاف ایک خاص ردعمل ہے اس ردِعمل کے ماتحت سائنس اور اُس کے تمام متعلقات کو مسترد کردینے کی کوشش کی جارہی ہے اور انسان کو وحشیانہ دور کی سادہ زندگی کی طرف واپس لے جایا جارہا ہے۔

ہندوستان بھی ان دنوں اس خطرہ کی زد میں ہے انسان اب اس درجہ سائینس کا غلام ہے کہ سائینس کے بالکل ختم ہو جانے کا امکان تو کم ہے البتہ یہ ڈر ضرور ہے کہ سائینس کی ترقی اور تحقیقات کو جو مدد اس ملک میں ملنا چاہیئے وہ نہ مل سکے گی ۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا سائینس ترقی کے آلہ کار کی حیثیت سے ناکام رہی ۔ اگر ایسا نہیں ہے تو بظاہر ایسا کیوں معلوم ہوتا ہے ۔ صنعتی حیثیت سے سائینس نے وہ سب کچھ کر دکھایا جو اس سے امید کی جاتی تھی ۔ آج انسان سائینس کی بدولت اپنی تمام مادی ضرورتیں پوری کر سکتا ہے اور اپنی بہت سی تکلیفوں کو کم کر سکتا ہے بات تو یوں ہے کہ سائینس انسان کی بھلائی کے لئے کر تو سب کچھ کر سکتی ہے مگر کرے کون ۔ سائینس دان اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہیں اور ان کے پاس نہ اتنی سمجھ ہے نہ اتنی طاقت کہ وہ سائینس کو انسانی بھلائی کے کاموں میں لگا سکیں دنیا کی تاریخ میں کبھی اتنے دماغ ایک ساتھ سائینس کی ترقی کے لئے کوشاں نہیں رہے اور نہ کبھی اتنے تھوڑے عرصہ میں اتنی زبردست ترقی ہوئی ہے لیکن یہی ظاہری ترقی عام آدمیوں اور اکثر سائینس دانوں سے موجودہ سائینس کی اصلی کمزوری اور انتشار کو پوشیدہ رکھتی ہے ۔ گزشتہ ترقیوں کے مقابلہ میں موجودہ ترقیاں زیادہ ہیں ۔ مگر اس زمانہ کی سہولتوں اور ضرورتوں کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہیں صرف سائینس دان ہی دیکھ سکتا ہے اور وہ بھی اگر وہ دیکھنے کی تکلیف گوارا کرے کہ کس حد تک سائینس کی ترقی پر جو کوشش کی جا رہی ہے تنظیم کے نقص کی وجہ سے ضائع ہو رہی ہے اور کتنی ترقی جس کی ضرورت تھی اور جس کا امکان بھی تھا روپیہ اور ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہو سکتی ۔ اور کتنی ترقی جو ہو چکی ہے یا تو انسانی بھلائی کے لئے استعمال ہی نہیں ہوئی یا ناقص اور نامکمل طور پر استعمال ہوتی ہے ۔

ایک عام سائینس دان شاید یہ کہے کہ یہ سب غلط ہے ۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے اپنے محدود دائرے میں کس طرح مختلف دلچسپ سوال آہستہ آہستہ حل ہو رہے ہیں ۔ گو روپیہ کی کمی اور اپنے کام میں دنیائے سائینس اور اس کے صحیح داد نہ پانے کی وجہ سے کسی قدر پریشان

ضرور ہے مگر اپنے کام میں اس کی مشغولیت اور باہری باتوں کے خیال کی تلخی عام طور پر اسے اس بات کا اندازہ کرنے سے روکتی ہے کہ وہ کس قدر وقت ضائع کر رہا ہے ۔ یہ ایک سائنس دان کا خلوص اور اپنے کام میں اپنی ساری طاقت کو صرف کر دینے کی عادت ہے یہ اس کی وہ کمزوری ہے جو اسے غلام بنا دیتی ہے ۔ اس کو وکیلوں اور دوسرے پیشہ وروں کے خلاف خود اپنی اہمیت کا اندازہ نہیں ہے ۔ سرکاری اعداد کے مطابق صنعتی سائنس کی تحقیقات آٹھ سو فیصد منافع لاتی ہے مگر شاید آپ کو یقین نہ آئے کہ بڑے سے بڑے ترقی یافتہ جمہوری ملک میں بھی سائنس کی تحقیقات کے لئے روپیہ کی سخت کمی ہے ۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ سائنس کیا کر سکتی ہے ۔ اس کا جواب صرف یہ سوال ہے کہ "آپ سائنس سے کیا چاہتے ہیں" انسانی سوسائٹی سائنس سے وہ پاتی ہے جو وہ یا اُس کا حکمران گروہ چاہتا ہے ۔ سائنس کے خلاف جو بے اطمینانی اور نفرت عام طور سے پائی جاتی ہے وہ اس ردِ عمل کا نتیجہ ہے جو موجودہ نظام کے ہاتھوں سائنس کے غلط اور مفاد انسانی کے خلاف استعمال سے پیدا ہوتا ہے ۔ آج کل سائنس کو صنعت کے اجارہ دار صرف ان مقاصد کے واسطے استعمال کرتے ہیں جن سے ان کو کثیر تر منافع حاصل ہو آج کل کیمیاوی اور طبیعاتی سائنس کی تحقیقات حیاتی اور اجتماعی سائنسوں کی تحقیقات کے مقابلہ میں زیادہ نفع بخش ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ علم کیمیا کے ماہروں کی تعداد دوسرے تمام سائنس دانوں کی مجموعی تعداد سے زیادہ ہے ۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کیمیاوی سائنس کی تحقیقات اجتماعی طور پر انسان کے لئے اور تمام سائنسوں کی تحقیقات سے زیادہ کار آمد ہے بلکہ اس زمانہ میں سائنس کے کسی شعبہ کی اہمیت کا دار و مدار اس منافع کی مقدار پر ہے جو وہ صنعتوں کو دلا سکتا ہے ۔ اگر سائنس صرف چند لوگوں کے منافع بڑھانے ہی کے کام آسکتی ہے تو غالباً وہ اس لائق نہیں ہے کہ اس کے برقرار رکھنے اور اسے ترقی دینے کے لئے کوئی خاص کوشش یا قربانی کی جائے ۔

مختصر یہ ہے کہ وہ اثرات جو سائنس کی پوری ترقی کیلئے مضر ہیں ۔ موجودہ نظام کا لازمی نتیجہ

ہیں اور انہیں اس سے الگ نہیں کیا جا سکتا جب تک فاشسٹ حکومتیں قائم ہیں سائینس کی پوری ترقی اور انسانی بہبودی کے لئے اس کا صحیح استعمال ناممکن ہے۔ خطرہ ہے کہ فاشسٹ نظام تباہی سے پہلے اپنے ساتھ سائینس کو بھی نہ لے ڈوبے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح جرمنی جیسے فاشسٹ ملکوں میں سائینس دانوں اور سائینس کے مختلف نظریوں کو صرف اس بنا پر ختم کر دیا جاتا ہے کہ وہ ان کے ظالمانہ نظریہ زندگی کے خلاف ہیں۔ پچھلے دور میں وسطی اور مشرقی یورپ میں جہاں فاشسٹ سلطنتیں قائم ہیں سائینس نے بہت سا نقصان اٹھایا ہے۔ اسپین میں جنرل فرانکو کے عروج نے سائینس کی ترقی کو بالکل روک دیا ہے۔ یہ تو شاید نہ ہو سکے کہ ان فاشسٹ ممالک میں سائینس کا بالکل وجود نہ رہے مگر وہاں اسے کافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ جرمنی میں سائینس کے زوال نے دنیائے سائینس کو کتنا دھکا لگایا ہے اس کا صحیح اندازہ ابھی تک نہیں ہو سکا ہے۔

اگر مغربی یورپ میں فاشزم نے سائینس کو ختم کر دیا تو سائینس کی ترقی کئی منزل پیچھے ہٹ جائیگی۔ آج سائینس کی حفاظت قریب قریب اتنی ہی ضروری ہے جتنی اس کی ترقی کی کوشش سائینس کی جو ترقی آج ایک سائینس دان کے ہاتھوں ہو سکتی ہے وہ کل بھی کسی دوسرے کے ہاتھوں ممکن ہے مگر مجموعی طور پر سائینس کی حفاظت کے لئے جو کام ایک سائینس دان کر سکتا ہے وہ صرف سائینس کی ایک محدود شاخ ہی کو نہیں ترقی دیتا بلکہ ساری سائینس کو صدیوں تک قایم رکھنے میں مدد دیتا ہے ان ممالک میں جہاں خطرہ اس قدر سخت نہیں ہے شائد یہ بات مبالغہ آمیز معلوم ہو مگر یہ ضروری ہے کہ وقت پر خطرہ کو پہچان لیا جائے اور جرمنی کی طرح ایسا نہ ہو کہ خطرہ کا احساس پانی کے سر سے اونچا ہو جانے کے بعد ہو۔ سائینس کا مستقبل ہمارے زمانے کی اجتماعی اور اقتصادی دقتوں کے حل سے وابستہ ہے اور یہ ضروری ہے کہ کم از کم انسان کی حیاتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے وسائل افراد کے بجائے سوسائٹی کے ہاتھ میں ہوں۔

اگر ایک دفعہ ایسا ہو جائے اور یہ خطرہ نہ باقی رہے کہ موجودہ انتشار پھر لوٹ سکتا ہے تو

سائینس کا مستقبل شاندار ہو جائے گا۔ سویٹ روس سائینس کی مدد سے جس بہادری سے لڑ رہا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ کس طرح سائینس کو ترقی دی جا سکتی ہے۔

جدید معلومات کی سرحدیں یعنی علم طبیعات کے بنیادی مسائل جن کا گہرا تعلق کائنات کی ابتدا سے ہے۔ علم الحیات کے بنیادی مسائل جن کا تعلق حیات کی ابتدا سے ہے اور نفسیات اور عمرانیات کے مسائل انسان کی ابتدائی تاریخ سے الگ نہیں کئے جا سکتے۔ اگر سائینس کو اپنا پیدائشی حق حاصل کرنا ہے تو دو باتیں ضروری ہیں۔ سائینس دان کو چاہیے کہ وہ خود اپنے خاص شعبے کے باہر دیکھنا سیکھے اور کم از کم روزمرہ کے مسائل کو اس حد تک سمجھنے کی کوشش کرے جس حد تک کہ اسے اپنی خاص سائینس کی حفاظت اور ترقی کے لئے اس کی ضرورت ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لوگ جو ان مسائل سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں اور جن کے ذریعہ سے مستقبل قریب میں موجودہ سماج کی صحیح تبدیلی اور تشکیل کا امکان پایا جاتا ہے۔ سمجھیں کہ سائینس آج کیا کر رہی ہے ان کے لئے یہ ضروری ہے کہ سائینس میں اور فاشسٹ حکمرانوں کے ہاتھوں اس کے غلط استعمال اور تخریب میں تمیز کر سکیں اور اس بات کا اندازہ کر سکیں کہ اگر موجودہ تخریبی طاقتیں جو سائینس کو مسخ کئے ہوئے ہیں ہٹا لی جائیں تو سائینس سوسائٹی کے لئے کس حد تک مفید ہو سکتی ہے۔

سید شہاب الدین ایم۔ اے (عثمانیہ)

بھول گئے!

(جذبات و حسیات کی کامیاب ترجمانی اور محاکات کا پر کیف اظہار اس غزل کی خصوصیات ہیں شاعری کی "کارگاہ شیشہ گری" میں یہ بڑا نازک کام ہے۔
معلوم ہوا ہے کہ یہ غزل نیرؔ صاحب کے زیر تدوین کلام "شعاعین" کا ایک ورق ہے۔)

(مدیر)

پہلی سی طبیعت اب نہ رہی وہ جشنِ چراغاں بھول گئے / اے ساقیٔ گلرو! رخصت ہو ہم شغلِ بہاراں بھول گئے

اے صبحِ بہاراں! دے نہ ہمیں پیغام چمن میں پھر کا / اب ذوقِ تماشا دیس نہیں ہم سیرِ گلستاں بھول گئے

اک کیف سا حاصل ہوتا تھا اے دوست تلاشِ منزل میں / بڑھتے ہی گئے بڑھتے ہی گئے ہم چاکِ گریباں بھول گئے

مشتاقِ نظارہ دل تھا بہت ہم ڈھونڈھنے تم کو نکلے تھے / خود آپ ہی خود کو کیا کہئے اے خسروِ خوباں بھول گئے

وہ حسنِ مجسم آیا تھا پر شرحِ محبت ہو نہ سکی / دل کی تمنا دل میں رہی ہم سارے ارماں بھول گئے

کافر نظریں بانکی چتون چال میں جادو ایسا شباب / دیکھ کے ہم یہ حشرِ مجسم فتنۂ دوراں بھول گئے

ہر عہدِ وفا کو بھلا دینا یہ حُسن کی فطرت ہے شاید / اے جانِ تمنا! یاد بھی ہے تم کتنے پیماں بھول گئے

بیشک یہ حقیقت ہے نیرؔ کہ زہر بھرا ہے جامِ حیات
یہ فیضِ محبت ہے شاید ہم تلخیٔ دوراں بھول گئے

محمد علی نیرؔ بی۔ اے (عثمانیہ)

اجنٹہ کی عورت

ہولناک جنگ ایسی جنگ جس نے کرۂ ارض کو جوالامکھی بنادیا ہے ۔ وہ جنگ جسمیں لڑنے والوں نہ لڑنے والوں کا کوئی امتیاز نہیں ہے جس کی ہولناکیاں ہتیار بند نہتے عورت بوڑھے بچے سب کے لئے یکساں ہیں۔ جنگ کی اس پریشان خیالی میں یکایک میری نظر اجنٹہ کی اس تصویر پر پڑتی ہے جسمیں ماں کو پیش کیا گیا ہے ۔ ماں یعنی عورت کا مقدس ترین مظہر۔ وہ ماں جو چنگیز کو بھی جنم دیتی ہے اور گوتم بدھ کو بھی۔ اجنٹہ کی اس تصویر کو دیکھتے ہی میرا خیال اس زندۂ جاوید امن چین اور شانتی کے مندریں گھومنے لگا ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان صدیوں کے غاروں پر ماں کی ممتا، بیوی کی محبت، بہن کا خلوص اور بیٹی کی چاہت رنگوں کی شکل میں پھیل گئی ہے ۔ اجنٹہ کے حسن کار، عورت کو حسن کاری کی روح سمجھتے تھے ۔ اس کے موقلم کی جنبشوں اور تیشے کی زد میں کوئی مقام ایسا نہیں ہے جہاں عورت کی رعنائیاں کارفرما نہوں۔ کہیں دیوی ہے ۔ کہیں رانی ہے کسی جگہ راجکماری جوانوں کی تمنا ہے اور کہیں داسیاں اپنی تیکھی اداؤں اور بانکی سج دھج سے راجکماری کو حسن کا انتخاب بنارہی ہیں۔ محل میں۔ صحن میں۔ دالان میں۔ آبادی اور ویرانوں میں۔ محفل عیش ومجلس وعظ میں۔ رنج اور مسرت میں۔ وسعت زمین پر یہ دیویاں داسیاں ہیں تو فضائے آسمانی پر آپسرا کہیں یہ پھول ہیں تو کہیں باعث آفرینش کل۔ کہیں مقصد اصلی ہیں تو کہیں آرائش وتزئین۔ زندگی اور پائندگی کی نشانیاں ۔

اجنٹہ جانے والے زائر حسن کاری پر ایک حقیقت پہلی نظر میں واضح ہوتی ہے کہ موسیقی

صرف آواز اور آہنگ ہی پر موقوف نہیں ہے۔ نظر کی موسیقی زیادہ لطیف زیادہ ذی روح اور زیادہ قائم ہے۔ رنگ اور آہنگ دونوں احساسات کی دنیا میں صرف دو شکلیں ہیں، دو روپ ہیں ایک ہی دیوی کے اور اس راز کو جس خوبی سے اجنٹہ کا حسن کار جانتا ہے شاید دنیا کے کسی مرقع حسن کاری میں اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ یہی راز اجنٹہ کے حسن کار کو عورت اور نغمہ کے سنجوگ میں دکھائی دیتا ہے۔

وہ عورت جو بدھ سے پہلے چرنوں کی داسی تھی جس کا درجہ سوسائٹی میں اسفل اور موہوم تھا بدھ کی روحانی تعلیمات نے شانتی اور نروانہ کے اس مرکز کو اجاگر کر دیا۔ عورت بدھ مت کی دنیا میں گم نامی سے نکل کر وہ درجہ پاتی ہے جس سے زندگانی کی تصویر میں حرکت اور توانائی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اجنٹہ میں عورت کو نہ صرف مساویانہ رتبہ میں دیکھتے ہیں بلکہ وہ حسن کاری کی ایک علامت ایک ذریعہ ( ) اور نشان حیات ہے۔

اجنٹہ میں عورت کے متعلق غور کرنے کے لئے کئی نقطۂ نظر ہو سکتے ہیں۔ عورت بحیثیت صنف نازک۔ عورت بحیثیت آرائش محفل۔ عورت بحیثیت آفرینش حسن۔ عورت مختلف درجہ حیات میں۔ عورت کے روحانی مقام۔ گوتم بدھ کی زندگی میں عورت کا حصّہ۔ بدھ مذہب اور عورت اس سے پہلے کہ ہر نقطۂ نظر پر اظہار خیال کیا جائے انکی وضاحت کے لئے چند ضروری معلومات کا اظہار ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ اصطلاحات اور فنی گفتگو سے ہٹ کر عام فہم زبان میں دو خصوصیات بیان کی جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہندوستان میں دیواری تصاویر کا فن (Frisco) ایک مکمل اور انتہائی ترقی یافتہ فن ہے جس کی لافانی مثال اجنٹہ ہے۔ دیواری تصاویر کی خصوصیات میں اجنٹہ کی حد تک پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی رنگ کاری دو وسعتوں میں ہے۔ صرف لمبائی اور چوڑائی۔ جسامت کے خیال کو پر ترنم خطوط اور حدود سے ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ طرز رنگ کاری تجسیم یا تین وسعتوں (Two Dimensions) سے زیادہ پر قدرت اور حسن آفریں ہے۔ اس طرز کی دوسری خصوصیت روحانیت اور شاعرانہ موسیقیت نگاہوں کے سکون اور دل کی شانتی

کے ذریعہ پیدا کرنا ہے۔ دوسری بات اجنٹہ کی رنگ کاری میں رنگوں کی موزوں، مناسب، متقابل و متبادل یکجائی ہے۔ اس میں بھی جہاں تک ہو سکے رنگوں کی غیر معروف آمیزش اور مجہول ملاوٹ سے پرہیز کیا گیا ہے۔ سب سے بڑی چیز رنگوں کی وسعتوں کا حسین اور رس بھرے خطوط سے روشن کرنا ہے۔ جہاں تک انسانی جسم اور اس کی ساخت کا تعلق ہے اجنٹہ کا حسن کار اپنی اچھی مثالوں میں نہ صرف فن پر پورا حاوی معلوم ہوتا ہے بلکہ فن کو اپنے تخیل سے شاعرانہ بلندی اور روحانی رفعت دے سکتا ہے۔ اسی طرح اس کا موقلم نظروں کے لئے رس بھرے راگ اور رنگینیوں کا موسیقار ہے۔

اجنٹہ ایک ایسا مندر ہے جس میں صدیوں کی سعئ انسانی مرتسم ہے اس کے غار بدھ دور کے ہندوستان کی تاریخ ہیں۔ ابتداء، عروج، و زوال تینوں حالتوں کا مرقع۔ یہاں پر ہم ان غیر دلچسپ تفصیلات میں نہیں جائیں گے جن سے زائروں کی رہنما کتابوں کو تعلق ہے۔ غار کتنے ہیں۔ کہاں واقع ہیں۔ اس میں چیتیا (مندر) اور وہارا (خانقاہ) کونسے ہیں۔ غار کس طرح کھودے اور کس طرح تراشے گئے ہیں۔ اس کی تعمیر کاری کیا ہے، آذری کی کیا خصوصیات ہیں۔ یہ چیزیں ہمارے موضوع بحث سے خارج ہیں۔ البتہ عورت اور اجنٹہ سے متعلق ہر چیز پر نظر ڈال سکتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے کہا بدھ مت میں عورت کی معاشی آزادی مذہبی مساوات میں کوئی فرق دونوں جنسوں میں امتیاز کا باقی نہیں رکھا۔ نروانہ ہر آتما کے لئے اپنے حوصلہ اور عمل پر موقوف تھا۔

اس خیال کو پیش نظر لاتے ہی تخیل کی نگاہ کے سامنے وہ منظر آجاتا ہے جس میں انسانی پاکیزہ انفاس اجنٹہ کی تخلیق میں مصروف ہیں مذہبی لوگوں کی ایک جماعت جس میں راہب ہیں، راہبہ ہیں، گرو، جوان، پختہ عمر بزرگ ہیں۔ ہر قبیل کا انسان ہے اور ہر مقام کی انسانیت جن کے قلب و دماغ بدھ اور اس کی مذہبی روایات کو زندہ کرنے میں مصروف ہیں۔ انسانی آبادی کی بلندیوں اور پستیوں سے دور اور انکی کثافتوں سے بے نیاز یہ مذہبی گوہکن روحانی

عشق میں سرشار تیشہ زنی میں مصروف ہیں ۔ غار پر غار بنتے ہیں جوانی بڑھاپے میں تبدیل ہو رہی ہے ۔ ہر غار کی تکمیل کے بعد اس کی تزئین ہے ۔ دیواریں آہستہ آہستہ بدھ کی زندگی ۔ بدھ کا مذہب ۔ بدھ کا تخیل اور بدھ کی روایات کو رنگوں کی زبان میں قبول کرتی جارہی ہیں ۔ رنگ کاری کی ابتدا رہے رنگ کاری کی انتہا ہے اور رنگ کاری کا زوال ۔ روحانیت پرواز کر رہی ہے ۔ روحانیت عروج حاصل کر رہی ہے ۔ روحانیت کا چراغ ٹمٹما رہا ہے ۔ غرض گوتم کا آفتاب طلوع ہوتا ہے ۔ نصف النہار پر پہنچتا ہے ۔ اور اپنی لمبی لمبی پرچھائیوں کے ساتھ غروب ہوتا دکھائی دیتا ہے یہ ہے وہ مقام جہاں ہندوستان کی حسین ترین تہذیب نے اپنے بچپن جوانی اور بڑھاپے کو زندگی کی نذر کر دیا ہے ۔ اس ماحول میں حسنِ ظاہر حسنِ باطن کی طرف رخ کر رہا ہے عشق مجازی عشق حقیقی کو جائزہ دے رہا ہے ۔ مرد حسن کار اپنے تخیل کے حسین زرین لمحوں کو صنف نازک کے لوچ رس بھری آواز آہو چشمی اور سحر خرامی میں محسوس کر رہا ہے ۔ اور اس کے بالمقابل عورت بحیثیت حسن کار شکتی قوت توانائی اور بانکپن میں وہ حسین نقوش ڈھونڈ رہی ہے جس کے بل اور زور پر موقلم کی حسین جنبشیں منحصر ہیں ۔ اجنٹہ کا حسن کار کاروباری زندگی کی تلخیوں سے اپنے اچھے اور برے تجربوں کو سبق حاصل کر کے پرسکون غاروں میں اپنے تخیلات کو روحانیت کے راستے پر ڈال رہا ہے وہ عورت جس کو آپ نے وطن کے بازار ۔ گھر ۔ محل اور محفل میں دیکھا تھا آج اس کے خط و خال میں روحانیت کی ایک دنیا نظر آ رہی ہے ۔ یہی وہ ماحول تھا یہی وہ زندگی تھی ۔ جس نے اجنٹہ میں عورت کو ایک نیا حسن کارانہ روپ دیا ۔

اجنٹہ میں عورت کے متعلق سوچتے ہوئے لازماً دو چیزیں دل کی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں ۔ ایک زیور ۔ دوسرا لباس ۔ زیور کے متعلق یہ مشاہدہ عجیب ہے کہ مرد اور عورت دونوں اس کو جسم کی زینت بناتے ہیں اور سر سے لیکر پیر تک دونوں کی تصاویر میں ان کو دخل حاصل ہے لیکن مردانی زیور اور زنانی زیور میں وہی امتیاز ہے جو لازماً ان دونوں صنفوں میں ہونا چاہیئے ۔ مرد کے پاس مُکٹ یا تاج ۔ بازو بند ۔ کان کی بالیاں ۔ گلے کا ہار اور بعض تصاویر میں کمر میں خوبصورت

خنجر آرایش کے طور پر استعمال ہوتے ہیں لیکن عورت کا زیور تعداد اور اختراع کے لحاظ سے اس قدر بوقلموں ہے کہ محض اجنتہ کے زیور پر ایک اچھا سا رسالہ لکھا جا سکتا ہے ۔ یہ دیکھ کر کہ صرف زیور ہی تہذیبی مدارج اور معاشری درجے بتا سکتے ہیں ان حسن کاروں کے مشاہدہ کی وسعت کا ہر شخص اندازہ ہو سکتا ہے ۔ خاص طور پر عورتوں کے سر کا زیور جوڑا، کان کے زیورات اور گلے کے ہار بازوبند ۔ پہونچیاں ۔ کمربند ۔ زانوبند ۔ پیر کے زیور اس قدر تنوع اور حسن کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں کہ ان کو دیکھ کر عقل حیران رہجاتی ہے ۔ لباس میں ایک چیز عجیب ہے اعلیٰ طبقہ ادنیٰ طبقہ کے مقابلہ میں لباس سے بے نیاز معلوم ہوتا ہے ۔ تاہم ملبوس میں ساڑی کی قسم کی چیز کمر تک خوبصورت طرح اندازی اور پہننے کے ڈھب کی وجہ سے ایک حسن کارانہ ذوق کا اظہار کرتی ہے ۔ اس کے علاوہ انگیا، چولی، کرتنی، لانبے کرتے یہاں تک کہ بعض پر دیبیوں کی تصویر پیش کرنے میں شاید (Gown) تک دکھائی دیتا ہے ۔ لباس میں رنگوں کا انتخاب مختلف کپڑوں کا امتزاج پیرہن کے جھوک اور لوچ جسم کی مناسبت سے ان کا اتار چڑھاؤ ہر چیز موجودہ دنیا کو ذوق پیرہن دے سکتی ہے ۔ اُن کے پاس تن کی عریانی ہی گندگی کی دلیل نہ تھی ۔ تاہم ان میں نگاہ کی بدنمائی اور بدذوقی کا خیال تھا ۔ جہاں لباس سے جسم نازنین بے نیاز ہے وہاں زیور ستر پوشی کر کے جسم نازنین کے حسین زاویوں اور قوسوں کو جنت نگاہ بنا رہا ہے ۔

آپ اجنتہ کی عورتوں کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں جو تخیل کی رفعتوں کے ذریعہ خوب تر اور نازک تر بن گئی ہیں ۔ اجنتہ میں عورت کی آنکھیں، ہونٹ، چہرہ، بال جسم کا حسین نشیب و فراز، اداؤں کی خوبیاں غرض ہر چیز اپنے اصل نمونوں (Models) کا پتہ دے رہی ہے ۔

اب آئیے دیکھیں کہ عورت اس طوفان حسن اور رنگوں کے نغموں میں کتنے انداز سے جلوہ گر ہے ۔ ایک جگہ عورت کو ماں کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے ۔ یہ بڑی مشہور تصویر ہے اور غار نمبر ١٧ میں موجود ہے ۔ اس تصویر کا نیچے کا حصّہ کچھ اکھڑ گیا ہے پوری تصویر اصلی حالت میں موجود ہے جس میں

گوتم بدھ کو ہاتھ میں کشکول سئے پیش کیا گیا ہے۔ سامنے ماں اپنے بچے کے ساتھ ہے تصویر کے پس منظر میں ایک عمارت طائرنگاہ تناظر میں بنائی گئی ہے۔ فضائے آسمانی پر ایک آسمانی ہستی حالتِ پرواز میں چھتر لئے بدھ کے سر پر تھامے ہوئی ہے تصویر کے بالکل سامنے چوکھٹے کے طور پر ایک ستون اور اس کے اوپر ایک مستطیل اس انداز میں رنگا گیا ہے جیسے پتھر کی نقش کاری کو واضح کیا گیا ہو۔ مستطیل میں ایک عورت کو گل بوٹا کاری کے درمیان محوِ خیال دکھایا گیا ہے۔ اصلی تصویر ایک رنگ میں بنائی گئی ہے جس میں سرخ و زرد اور کچھ نیلا رنگ ملا ہوا ہے۔ اُس میں گوتم بدھ سیاہ فام ہے۔ قد زمین اور آسمان پر محیط ہے۔ ایک لمبا فرغل فقیرانہ انداز میں گلے سے لیکر پاؤں تک لٹکا ہوا ہے۔ بائیں ہاتھ میں پھول ہے اور دہنے ہاتھ میں کشکول۔ اس کے مقابل ماں اور بچے کی تصویریں بہت چھوٹے قد کی ہیں۔ آسمان کی یکرنگی اور گہرا پن چاندنی رات کا سماں ظاہر کرتا ہے جس میں گوتم بدھ کے سر کا ہالہ چاند کی جگہ درخشاں ہے اور تاروں کی بجائے سورج نما پھول کی چھوٹی چھوٹی ٹہنیوں سے فضائے آسمانی جگمگا اٹھی ہے۔ عمارت کا آنکھ کی سطح سے پست تناظر عورت اور بچے کو ارضی علائق سے بلند اور آسمانی بلندیوں سے پست بتا رہا ہے۔ یہ تو اب تک کسی محقق نے بیان نہیں کیا کہ یہ تصویر کس واقعہ کی یادگار ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ تصویر گوتم بدھ کے اُس واقعہ کی طرف اشارہ کر رہی ہو جبکہ تزکیہ نفس کے لئے انہوں نے خود اپنے ہی محل پر جاکر بھیک مانگی تھی اور ان کی رانی نے بھکشا دیا تھا۔ تصویر میں رانی ممکن ہے کہ گوتم بدھ کے بلند کشکول میں اپنے راجکمار کے معصوم اور ننھے ہاتھوں سے کچھ نذر پیش کر رہی ہو۔ واقعہ کچھ ہی ہو تصویر ایک عجیب روحانی درس دے رہی ہے۔ جہاں تک رنگ کاری کا تعلق ہے اس تصویر کو ہر لحاظ سے شہکار مانا گیا ہے۔ ماں اور بچے کا دھج اور اُن کے کھڑے رہنے کا انداز، انکی آنکھوں کا رخ، ہونٹوں کے جھوک پورے چہرہ پر ایک تمنا ایک آرزو اور ایک موہوم استدعا۔ ماں کی پوری مامتا بچے کی معصومیت دونوں مل کر زمین کی آرزوں اور تمناؤں کو آسمان کی طرف لیجا رہی ہیں گویا زبانِ حال سے کہہ رہی ہیں ؎

جب اُن سے ادب نے نہ کچھ منہ سے مانگا تو اک پیکرِ التجا ہو گئے ہم

وہ روح جو زمین کی کثافتوں سے نکال کر لطافتوں کی معراج حاصل کر چکی ہے زمین والوں میں محبت اور معصومیت کی ان دو نشانیوں کو دیکھ کر اپنے کمال میں کچھ اس طرح عجز اور خاکساری کو تڑپتا پا رہی ہے کہ آنکھ جھکی ہوئی ہے، خالی کشکول کا رُخ ماں اور بچے کی طرف گویا سب کچھ دینے والا ماں سے سب کچھ مانگ رہا ہے۔ یہ تخیل کے شہ پارے ہیں۔ یا ؎

فلک کی ہمسری کے ولولے تھے تھم گئے ہیں کیا   زمین کے حوصلے بلند ہو کے جم گئے ہیں کیا؟

گوتم بدھ کے مذہبی عقیدے اور معرفت کی راہوں میں تزکیہ نفس کی یہ منزل جو تواضع میں بلندی، عجز میں رفعت، خاکساری میں بے نیازی کا درس دیتی ہے اس تصویر سے واضح ہے رنگ کار نے کہیں کہیں روشنی اور سائے کی تنظیم سے تصویر کو روشن تر بنا دیا ہے اور اس ہلکے تجسیم کے ساتھ حدود کی نمی تحریروں نے تصویر کو شہکار کا رتبہ بخشا ہے۔ یہ خصوصیت اجنٹہ کی حسن کاری میں عام ہے۔

اب ایک شاعرانہ منظر دیکھئے۔ یہ غار نمبر ۱۷ کی تصویر ہے۔ جس کو سنگار کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس تصویر میں ایک رانی آئینہ کے سامنے کھڑی ہوئی ہے اور غالب کے اس شعر کی تشریح بن گئی ہے۔

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے
صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

سر پر مکٹ (تاج) ہے جو اہر نگار، گلے میں ایک چھوٹا ہار اور ایک موتیوں کا ست لڑا ہے ست لڑے کے درمیان ایک گول آویزہ ہے جس کے دائرہ پر موتی اور جواہر ٹکے ہوئے ہیں اور بیچوں بیچ ایک درِ شہوار ہے۔ ست لڑے اور اس آویزے کے درمیان دو موتی ایک چھوٹا دوسرا بڑا اپنے بندھن کی طرح لٹک رہے ہیں۔ چوٹی ہار اور بازو بند کے فیتے دونوں جانب ہوا میں رقصاں ہیں۔ دونوں ہاتھوں میں جڑاؤ چوڑیاں اور پہونچیاں ہیں کمر بند تین پٹیوں سے مزین ہے جو بجائے کمر کے نیچے کی طرف عجیب انداز سے ڈھلکا ہوا ہے۔ دو طرف دو زانو بند ہیں اور پیر میں کڑے ہیں۔

کھڑے رہنے کا ڈھب بے تکلف ہے ۔ ایک پیر پیچھے دوسرا اس سے آگے اور ایک ہی سیدھ میں ہے ۔ کھڑے رہنے کے اس ڈھب سے بائیں طرف جسم خوبصورت درمیانی زاویہ میں ڈھل گیا ہے ۔ اوپر کے بدن کا جھوک سیدھے جانب ہے ۔ کمر کا لوچ اور گردن کا جھکاؤ بھرے ہوئے شانوں کا ایک طرف مائل ہونا پوری تصویر میں ترنم پیدا کر رہا ہے ۔ بائیں ہاتھ کی دو انگلیوں سے آئینہ کو تھامے ہوئی ہے ۔اور سیدھے ہاتھ کی دو انگلیاں ہار کی طرف ہیں ۔ رانی سانولی سلونی ہے جسم پر زیور آرائش کے علاوہ ستر پوش ہی ہیں ۔ لباس جو ابھی زیب بدن نہیں ہے پیٹھ پر سے ڈھلکتے ہوئے پا بوسی کر رہا ہے اور خوبصورت سنجاف کی لہروں میں رقص و نغمہ بنا ہوا ہے ۔ رانی کی ایک طرف سیاہ فام داسی ہے جس کے ایک ہاتھ میں چنور ہے ۔ جسم پر کمر سے پاؤں تک تن زیب ہے ۔ ہاتھ میں چوڑیاں پاؤں میں کڑے ہیں ۔ رانی کی دوسری طرف ایک اور داسی ہے جو شاید مشاطہ ہے جس کے ایک ہاتھ میں تھال ہے جس پر سنگھار کا سامان رکھا ہوا ہے ۔ اس کے گلے میں ٹھسی کے قسم کا زیور ہے کمر سے نیچے تک ملبوس ہے ۔ پیروں میں کڑے ہیں ۔ اس کا منہ کھلا ہوا ہے گویا مجسم حیرت بنی ہوئی ہے ۔ آنکھیں حسن کی قصیدہ خوانی کر رہی ہیں اور دہ مجسم استعجاب کا پیکر ۔ فرش اس انداز کا بنا ہوا ہے جس میں خوبصورت طرح اندازی اینٹوں کے ذریعہ کی گئی ہے ۔ جس کی وجہ سے پوری تصویر میں ایک تحرک ہے ۔ فرش پر پھول ادھر ادھر بکھرے پڑے ہیں ۔ پس منظر میں دیوار ہے جس پر ایک عجیب و غریب لیکن حسین نمونہ ہے ۔

یہ تصویر عریانی میں ستر پوشی کے کمال کے لئے مثالاً پیش کی جا سکتی ہے ۔ کہنے کو تو چند نازنینوں کو ایک جا کیا گیا ہے لیکن حقیقت میں اس کی ترکیب اور طرح اندازی میں رقص کا سرور پوشیدہ ہے ۔

کالی رانی یہ تصویر رھتوا پدما پانی کے قریب غار نمبر ۱ کی دیوار پر ہے ۔ جسم آبنوسی، سر پر کٹ کان میں سنہری بلاق، گلے میں سونے کا ہار، موتیوں کی مالا، بازوبند، ہاتھ کے کڑے، اوپر کا جسم لباس سے بے نیاز، کمر سے نیچے ملبوس جس کا میدان زرد اور نیلگوں دھاریاں، تو ر پر سوفار کی

طرح اندازی، دھج پیچھے کی طرف جھکا ہوا، صراحی دار گردن سامنے کی طرف ایک خاص جھک لی ہوئی۔ اس تصویر کے چہرہ میں ہماری غزل کے معیاری حسن کی خصوصیات ہیں۔ ابرو کمانی، نرگسی چشم، سیدھی نکیلی نازک ناک، غنچہ دہن، بلند پیشانی، کتابی چہرہ، گول گول شانے ہاتھ میں کنول کی ٹہنی، سینہ کا حسین تموج، جوش شباب کا مبالغہ، کمر کی لچک اور جسم کے تحرک میں دریائے حسن کی لہریں ہیں۔ جس کو دیکھ کر جوش کا شعر یاد آجاتا ہے۔

پھر لبوں کی گلفروشی سے جواں ہے زندگی
پھر کمر کے لوچ سے عمر رواں سرشار ہے

حسن و جوانی کی یہ تصویر اپنے اندر ایک اور خصوصیت کو ظاہر کرتی ہے۔ بدھ مذہب میں رنگ کا امتیاز وجہ افتخار نہ تھا۔ کالا، گورا، سیاہ و سفید ہر رنگ میں حسن جلوہ گر ہے۔ کہیں ایک سیاہ رانی کی سفید داسیاں ہیں تو کہیں گلزار راجکماری سانولی سلونی داسیوں میں گھری ہوئی ہے۔ اس تصویر کی رنگ کاری میں استادی جلوہ گر ہے۔ کمال، سیاہ جسم پر زیور کا ہے۔ رنگ کی یہ ترتیب سیاہی کے کمال کو انتہائی عروج تک درخشاں کررہی ہے۔ اس تصویر کی سب سے خاص خصوصیت راجکماری کا تفکر اور سوچ ہے۔ پوری تصویر میں ہر خط، ہر ادا، ایک گہرے سوچ کا پتہ دے رہی ہے سیدھے ہاتھ میں جو کنول ہے اس کا نیچے کی طرف جھک جانا ان رنگوں کی رنگینی کا سم ہے۔ تصویر کو دیکھ کر زبان سے اقبال کا یہ مصرعہ نکلتا ہے۔

قدرت ہے مراقبہ میں گویا

اب کچھ بڑی تصاویر پر نظر ڈالیں گے۔ غار نمبر ۱۷ میں بدھ کے پہلے جنم کا ایک قصہ ہے جس کو چھا دانتا جاتک کا کہتے ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ بدھ کسی جنم میں سفید ہاتھی کے روپ میں تھے جس کے چھ دانت قوس قزح کے رنگ کے تھے۔ اس کی دو بیویاں تھیں جن میں سے ایک کو محبوب رکھتا تھا۔ دوسری سوکن سے یہ غم نہ سہا گیا۔ وہ مر کر نئے جنم میں بنارس کے راجہ کی رانی بنی۔ سفید ہاتھی بنارس کے جنگلوں میں تھا۔ رانی کو انتقام کی سوجھی۔ اُس نے اپنے شکاریوں کو حکم دیا کہ سفید ہاتھی کے دانت اکھاڑ کر لے آئیں۔ شکاریوں سے کچھ بن نہ پڑا لیکن

ہاتھی سے نے خود اپنے دانت اکھاڑ کر شکاریوں کے حوالے کردیئے ۔ جب یہ دانت رانی کے سامنے پیش کئے گئے تو اس پر اپنے کئے کا پچھتاوا ہوا کہ وہ بیہوش ہو کر راجہ کے گود میں گر پڑی۔

اس تصویر کے دو حصے ہیں ۔ ایک میں سفید ہاتھی اور اس کا غول معہ شکاریوں کے ہے دوسرے حصے میں محل کا وہ حصہ ہے جہاں رانی راجہ اور سہیلیاں ہیں ۔ رانی راجہ کے آغوش میں ہے ۔ رانی کی بیہوشی ہر ادا سے ظاہر ہے ۔ سیدھا ہاتھ خود بخود نیچے کی طرف گر گیا ہے ۔ جسم بے سدھ، پیر بے دم، چہرہ پر مردنی کے آثار، راجہ کے چہرہ پر رانی کی اس اچانک کیفیت سے سراسیمگی، اصل چیز سہیلیوں کی نفسیاتی کیفیت ہے کوئی پنکھا جھیل رہی ہے کوئی گلاب چھڑک رہی ہے، کوئی ہیبت میں تلوے سہلا رہی ہے، بدحواسی میں مورچل کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رہ گیا ہے، کوئی انگشت بدندان ہے، کوئی پریشان بال، کوئی اس حالت پر سرگوشیاں کر رہی ہے تو کوئی دم سادھ کر کھڑی ہوئی ہے ۔ جس خادمہ کے ہاتھ میں دانت رکھے ہوئے طشت ہے اس کا چہرہ غم کی مجسم تصویر ہے ۔ اس پورے غم و اندوہ کے منظر میں زندگی کا آفتاب غروب ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے تصویر اپنے کمال کی وجہ سے کسی بڑے استاد کے موقلم کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے ۔

اب دوسرا منظر ناچ کا ملاحظہ فرمائیے ۔ ناچ کا منظر اس غم کے منظر سے بالکل مختلف ہے، بانسری پر ناچ ہو رہا ہے، رقاصہ درمیان ہے، اس کے اطراف سازندے حلقہ کئے ہوئے ہیں۔ ایک طرف دو نازنین بانسری بجا رہی ہیں دوسری طرف دو مردنگ پر تال دے رہے ہیں ۔ دور پر ایک راجکماری تالیاں بجا رہی ہے اور دوسری محو حیرت ہے ۔ یہ منظر خانہ باغ کا ہے ۔ سامنے محل کا درانڈا ہے، فاصلہ پر ایک منڈپ ۔ رقاصہ کی تصویر پورے منظر کی جان ہے اس کا لباس بھی خاص ہے ۔ لانبے آستینوں کے قرمزی کرتے پر تارے ٹکے ہوئے ہیں، اس پر صندلی کرتنی ہے ۔ جسم کا رنگ سرخ گندمی ہے ۔ پیشانی پر جڑاؤ سربند ہے ۔ لامبے لامبے بال کے جوڑے پر چنبیلی کے پھول کے گجرے اور اس میں سے کنول کی پتیاں ظاہر کی گئی ہیں۔ کان کا بُندا ایک حلقہ ہے جس کے نیچے تین موتی آویزاں ہیں، ہاتھ میں پہونچیاں ہیں ۔ کمر سے

نیچے جو ملبوس ہے اُس پر موج دریا کے پٹے ہیں۔ پیلے میدان پر یاقوتی یا خونِ کبوتر کے رنگ کی طرح اندازی ہے جس میں سفید گل بوٹا کاری ہے۔ ہاتھوں کی ادا اور گردن کے خم میں ناچ کا پورا تحرک موجود ہے۔ رقص کا منظر کیا ہے گویا چاندنی رات میں رنگا رنگ فوارہ چھوٹ رہا ہے۔ تصاویر کی پوری ترتیب رقص اور راگ کا حلقہ ہے جسمیں رقاصہ گل نغمہ ہے۔ اس تصویر کو اجنٹہ کے حسن کار کے حرکت اور موسیقی پر قدرت دکھانے کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ نہ صرف اہل رقص میں تحرک ہے بلکہ آسمان اور پس منظر بھی اس مضمون سے ہم آہنگ ہیں رنگوں کو اس خوبی سے تقابلی طور پر پھیلایا گیا کہ دیکھنے والے کی نظر ایک غیر مرئی رقص سے محظوظ ہونے لگتی ہے۔ وہ رقص جس کو آواز اور آہنگ سے تعلق نہیں یہ حسن کاری کے ایک شعبہ کی دوسرے شعبوں میں ترجمہ کرنے کی بہترین مثال ہے۔

اس کے بعد ہم کچھ اور مثالیں پیش کرتے ہیں مثلاً ایرانی سفیر کی محفلِ عیش جو "شراب ساقی وآب رواں وروئے نگار" کی تصویر ہے یا بعض بڑے مجموعے پیش کرتے لیکن وقت کی تنگی اس کو برداشت نہیں کرتی اس لئے ہم آخر میں گلاڈاسٹن سالومن کے ان الفاظ پر اپنے مضمون کو ختم کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے "اجنٹہ کے راہب حسن کار کی نظروں میں عالم حسن ایک ہے۔ اُسی طرح سے جس طرح زندگی ایک ہے جسمانی یا اخلاقی حسن کا امتیاز اس کے پاس نہیں ہے۔ وہ بدھ کے پوتر جسم کے پاس ہی عورت کو پیش کرسکتا ہے۔ اجنٹہ کا حسن کار صنف نازک کی پرستش کرتا ہے۔ وہ عورت کو نمونہ نہیں سمجھتا بلکہ ایک ادا ایک انداز اور ایک بے ساختہ نغمہ۔ وہ تخیل کی آنکھ سے عورت کی اداؤں کو دیکھ کر حسین پیکر مرتب کرتا ہے۔ عورت کی اس کے پاس آرائشی قدر ہے' وہ زینت ہے لیکن ایسی قیمتی کہ اس کو اصول اور قاعدہ کی جکڑ بندھ میں نہیں لایا جاتا۔ حسن کاری کے ضوابط کی وہ پابند نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ خود حسن ہے اور اُن اصولوں کی رانی"۔

سید محمد اکبر وفا قانی بی۔اے ال ال۔بی (عثمانیہ)

قطعات

(برادرانِ جامعہ اس خبر کو نہایت مسرت سے سُنیں گے کہ مولوی احمد خان صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) سابق مہتمم مدیر مجلہ عثمانیہ نے جامعہ علیگڈھ میں اعلیٰ معیار تقریر کو پیش کر کے طلبائے علیگڈھ میں ایک نہایت بلند و ممتاز مقام حاصل کر لیا ہے۔

علیگڈھ کے حالیہ کل ہند بین الجامعاتی تقریری مقابلہ میں خان صاحب نے جامعہ علیگڈھ کی نمائندگی کی یہ وہ غیر معمولی اعزاز ہے جس پر عثمانین اور اہل حیدرآباد جس قدر فخر کریں کم ہے۔ علاوہ بریں موصوف نے انجمن اسلامیہ تاریخ و تمدن اور جامعہ علیگڈھ کے دیگر متعدد تقریری مقابلوں میں حصّہ لے کر مشاہیر ہند سے نہ صرف خراج تحسین حاصل کیا بلکہ انعامات اوّل کا بھی اعزاز موصوف ہی کو ملا۔

خان صاحب کی پیہم تقریری کامیابیوں کو سن کر میں نے حسب ذیل قطعات کہے ہیں۔) ”نیر“
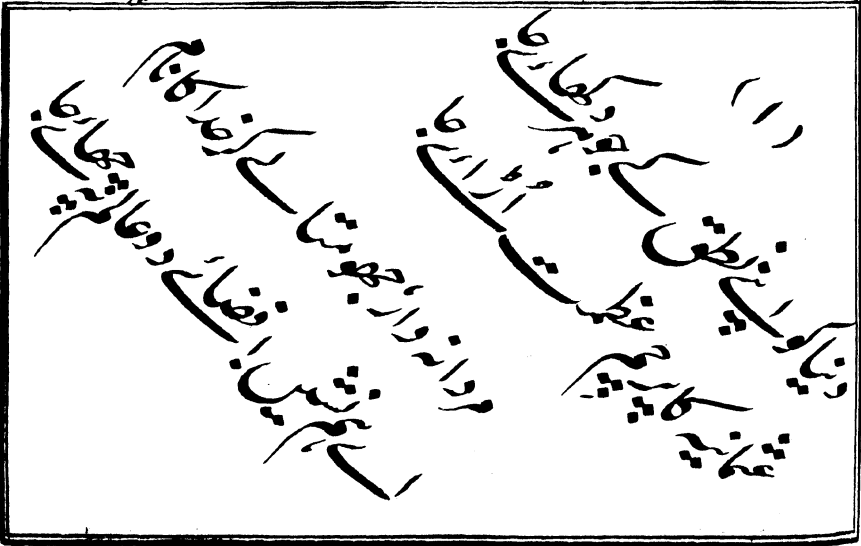
محمد علی نیّر بی۔ اے (عثمانیہ)

قانون بین الممالک کا آغاز و ارتقاء

قانون بین الممالک کی تعریف جو انگلستان کے مشہور ماہر لارنس نے کی ہے وہ یہ ہے کہ " وہ تمام قاعدے جو متمدن ممالک کی جماعتِ عامہ کے باہمی برتاؤیں ان کے طرزِ عمل کا تعین کریں"۔ یہ وہ قاعدے ہیں جو مختلف قوموں کے نہیں بلکہ مختلف مملکتوں کے باہمی تعلقات میں ملحوظ رہتے ہیں۔ اسی لئے ہماری اردو اصطلاح خود انگریزی اصطلاح International law سے بہتر ہے۔ اور اب امریکہ وغیرہ میں Inter-statal کا لفظ روزافزوں مقبولیت حاصل کرتا جارہا ہے۔

اس کا آغاز کب ہوا اور اس کا ارتقاء کس طرح عمل میں آیا' اس کے معلوم کرنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ تاریخ کے مختلف ادوار کا مطالعہ کریں۔

یہ ظاہر ہے کہ قانون بین الممالک کا آغاز اس وقت اور اس جگہ ہوا ہوگا جہاں بیک وقت دو خود مختار مملکتیں وجود میں آکر ایک دوسرے کے ساتھ کسی نہ کسی قسم' دوستی یا دشمنی کے تعلقات رکھنے لگی ہونگی۔ چونکہ مختلف ممالک کے باہمی برتاؤ کے اصول مختلف ہوسکتے ہیں اس لئے دنیا میں بیک وقت ایک سے زیادہ نظام ہائے قانون بین الممالک کا پایا جانا ناگزیر ہے اور جتنا زیادہ کسی زمرۂ ممالک میں باہمی احتیاج Interdependence ہوگی اتنا ہی زیادہ ان کا قانون بین الممالک یکساں ہوگا۔ اور سچ پوچھئے تو آج بھی تمام دنیا میں کوئی ایک نظام قانون بین الممالک موجود نہیں ہے اگرچہ اختلافات سابق سے اب بہت گھٹ چکے ہیں۔

ان حالات میں ہماری کوشش یہاں صرف یہ ہوگی کہ تاریخ عالم کے مختلف ادوار میں ہمارے موضوع کی حد تک جو نئے رجحانات پیدا ہوتے گئے اور مختلف ملکوں یا تمدنوں نے اس کی جو خاص خدمت کی اسے نمایاں کریں۔

سب سے قدیم دستاویزی مواد جو ہمیں تا حال دستیاب ہوا ہے وہ مصر و شام کا ہے جو نہر سویز کی کھدائی سے قبل خشکی میں بھی مشترکہ سرحد رکھتے تھے۔ یہ ساڑھے بارہ سو سال قبل مسیح کا دستاویز ہے۔ جو چاندی کی تختی پر کندہ کیا ہوا ہے۔ اس دستاویز سے پتہ چلتا ہے کہ اس قدیم زمانہ میں مصر و شام کی مملکتوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا جنھوں نے اپنی خود مختاری کو باقی رکھتے ہوئے دوستانہ تعلقات قائم کئے تھے۔ اس دستاویز سے مصر کے بادشاہ کا نام تو معلوم ہوتا ہے جس کو رامسیس (Ramses II) کہتے تھے۔ لیکن شام کے بادشاہ کا نام معلوم نہیں ہوا اسے حطاسیر (یعنی حکمران حطا) کہا گیا ہے۔ اس زمانہ میں شام کے اس علاقہ کو حطا کہا جاتا تھا جس کو آج کل (Hatay) کہا جاتا ہے۔ اس دستاویز کی ایک دفعہ میں یہ لکھا ہوا تھا کہ اگر کوئی اجنبی مصر پر حملہ کرے تو شام اس کی مدد کرے گا اور اگر شام پر کوئی حملہ ہو تو مصر شام کی مدد کرے گا۔ اس کی دوسری دفعہ میں یہ لکھا ہوا تھا کہ ہر دو ممالک کے تاجروں اور صناعوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ باہم آزادی کے ساتھ اپنا کاروبار کریں اس میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ہوگی۔ اس کے علاوہ اس کی بھی صراحت تھی کہ اگر کوئی مصر کا مجرم شام کو بھاگ جائے تو شام کا فرض ہوگا کہ وہ مصر کے حوالے کردے اور مصر کا فرض ہوگا کہ شام کا کوئی مجرم مصر بھاگ جائے تو شام کے حوالے کردے۔ یہ وہ چند چیزیں ہیں جو ہم کو اس دستاویز میں لکھی ہوئی ملتی ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانے میں بھی خود مختار مملکتیں اپنے سیاسی مفادات کے تحت پر امن تعلقات قائم رکھتی تھیں اور ان معاہدات کے تحت عمل کیا کرتی تھیں جو اس غرض سے ان کے درمیان ہوتے۔ وہ تمام معاہدات اور تعلقات جو ایک سلطنت دوسری سلطنت سے قایم رکھتی تھی اور جس کے تحت وہ عمل کرتے تھے ان سب سے قانون بین الممالک کی ترقی ہوتی ہے۔

یہودی دور

قانون بین الممالک کا ارتقا ہمیں یہودیوں کے دور میں بھی نظر آتا ہے لیکن ان کے خیالات دوسری اقوام سے بہت ہی مختلف تھے ان کا خیال تھا کہ یہودی قوم خدا کی محبوب ترین قوم Chosen People of God ہے ۔ وہ دنیا کی تمام قوموں پر فضیلت رکھتی ہے ۔ ان کا یہ ایمان اور عقیدہ تھا کہ سوائے یہودیوں کے دنیا میں کسی کو حکمراں رہنے کا حق حاصل نہیں انکی مذہبی کتاب توریت Old Testament میں واضح طور پر لکھا ہوا موجود ہے کہ سوائے یہودیوں کے ان چند اقوام کو قتل کردیا جائے جن کو وہ عمالقہ کہتے ہیں ۔ (Amalekete) ان کا یہ نظریہ تھا کہ عمالقہ کے سوا دنیا کی باقی تمام قومیں ہمیشہ یہودیوں کے ماتحت رہیں ۔

اس کے بعد ہمیں حضرت داؤدؑ (زمانہ ۹۹۹ سنہ تا ۹۵۹ سنہ قبل مسیح) و حضرت سلیمانؑ (۹۵۹ سنہ تا ۹۲۹ سنہ) کے عہد کے کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں ۔

حضرت سلیمانؑ نے صور (Tyre) کے بادشاہ سے ایک صلحنامہ کیا تھا ۔ اس بادشاہ کا نام حرام تھا ۔ اس صلحنامہ کے ذریعہ سے انھوں نے آپس میں دوستانہ تعلقات قائم رکھے تھے ۔ اس عہد کے بعد شام و مصر کے کچھ حالات نہیں معلوم ہوتے البتہ یونان و روم کے حالات کا ہمیں مفصل طور پر پتہ چلتا ہے ۔ اب ہم یونانی دور ۔ رومی دور ۔ عیسوی دور ۔ اسلامی دور پر علحدہ علحدہ مفصل بحث کریں گے اور دیکھیں گے کہ ان ادوار میں قانون بین الممالک نے کس طرح ترقی کی ۔ اور اس زمانے میں اس کے متعلق کیا کیا مختلف تصورات قائم ہوئے ۔

یونانی دور

یونان نے شام (فینیقیہ) سے رسم الخط اور تمدن کے دیگر درس لیئے ۔ اس کے قدیم ترین حالات ہم کو ۱۲۰۰ سنہ ق م سے معلوم ہوتے ہیں جبکہ جنگ ٹرائے (Iroy) ہوئی تھی جس کا ذکر ہومر نے اپنی نظموں میں کیا ہے اور جس کو وہ عالمگیر جنگ کہتا ہے اگرچہ اس جنگ میں جو سلطنتیں شریک تھیں وہ جزیرہ نمائے یونان کی خود مختار شہری مملکتیں تھیں اس جنگ کے بعد یونان میں امن کا دور دورہ رہا اور اس زمانے میں یونانی تہذیب و تمدن و علوم و فنون کو بہت ترقی حاصل ہوئی ۔

ارسطا طالیس نے اپنی کتاب (Politics) میں (City states) شہری مملکتوں کا ذکر کیا ہے اور کہتا ہے کہ یہ تمام شہری مملکتیں آزاد اور خود مختار تھیں۔ ان تمام شہروں کو اندرونی و بیرونی معاملات میں کامل اختیارات حاصل تھے۔ جنگ و صلح کے زمانے میں شہر کے تمام افراد ایک جگہ جمع ہوتے اور رائے عامہ سے تصفیہ کرتے کہ آیا انھیں جنگ کرنا چاہیئے یا نہیں ؟۔

یہ امر واقعہ ہے کہ یونانی تہذیب و تمدن اور علوم و فنون نے انھیں شہروں میں پرورش پائی۔ یہیں پھلے پھولے اور دنیا کے مختلف ممالک کو متاثر کیا۔ ارسطو ان "شہری مملکتوں" کی حکومت کو بہترین حکومت کہتا ہے۔

جوں جوں زمانہ گذرتا گیا یہ شہر صنعت و حرفت، تجارت، تہذیب و تمدن، اور علوم و فنون میں ترقی کرتے گئے۔ چنانچہ ہمیں ان شہروں میں قانون۔ انصاف عدل گستری۔ نظم و نسق اور حکومت کے تمام شعبے نہایت ہی عمدگی کے ساتھ کام کرتے نظر آتے ہیں۔ یونانی چونکہ فطرتاً مذہب اور اسپورٹ کے بہت زیادہ دلدادہ تھے اس لئے یہاں مندروں کے پاس ہمیشہ میلے لگتے اور گرم بازاری رہا کرتی تھی۔ اطراف و اکناف کے خود مختار شہروں سے لوگ کسی ایک شہر میں جمع ہوتے اور کھیلوں تماشوں اور میلوں میں حصہ لیتے۔ تجارت کی خاطر بھی وہ ایک شہر سے دوسرے شہر کو جاتے اور اپنی ضروریات کی چیزیں خریدتے اور واپس لوٹتے۔ جب ان شہروں کے تعلقات دن بدن وسیع ہوتے گئے تو یہ سوال پیدا ہوا کہ "غیر ملک" یعنی غیر شہر کے باشندوں سے اگر کوئی جرم سرزد ہو تو ان پر کن قوانین کا اطلاق کیا جانا چاہیئے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے یونان میں بھی قانون بین الممالک کا آغاز ہوتا ہے یونانیوں نے اس غرض کے لئے دو نظام قانون بیک وقت رائج کئے ایک یونان کے باشندوں کے لئے اور دوسرا غیر یونانی ممالک کے باشندوں کے لئے۔ یونانی آپس میں لڑتے بھی تو چند قواعد ملحوظ رکھتے جو نوامیس یونان کہلاتے۔ لیکن جب کبھی یونانیوں کا دوسری اقوام سے مقابلہ ہوا تو انھوں نے نوامیس انسانی پر عمل کیا (یعنی جو چیز ان کو مناسب معلوم ہوتی اس پر عمل کیا کرتے تھے)

یونان کی تاریخ سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ قدیم زمانے میں مختلف شہروں نے صنعت و حرفت و تجارت کی خاطر آپس میں اتحاد قایم کیا تھا ایسے مختلف معاہدات میں سے ایک جس کو ہم (Amphyctiony) کے نام سے یاد کرتے ہیں وہ ڈیلفی کے مندر کے ہمسایہ میں ہوا تھا۔ یہ (۱۲) قبایل میں ہوا تھا۔ اس کونسل کے ہر سال دو مرتبہ اجلاس ہوا کرتے تھے پہلا سردی میں دوسرا گرمی میں۔ اجلاسوں کی شرکت کے لئے ہر قبیلہ دو نمایندے بھیجتا تھا۔ اس طرح کل ۲۴ ارکان کی کونسل کا ڈلفی کے مقام پر اجلاس ہوتا یہ معلوم نہیں کہ جس قبیلے کے چار شہر ہوں تو ان کے نمایندے کس طرح شریک ہوتے تھے۔ بہر حال اس کا پتہ چلتا ہے کہ اس اجلاس میں ہر ایک شہر کے مختلف مسائل پر بحث ہوتی اور پھر رائے عامہ سے فیصلہ کیا جاتا۔ ہر شہر کے مندر کا تحفظ بھی اس کمیٹی کے سپرد ہوا کرتا تھا۔ مختلف قبائل آپس کے جھگڑوں کو اس کونسل میں پیش کرتے اور پُر امن طریقہ سے تصفیہ کیا کرتے تھے دشمن کے ساتھ اعلان جنگ کرنے کا فیصلہ بھی اس کونسل میں ہوتا اور تمام افراد ملکر مشورہ کرتے کہ انھیں جنگ کرنا چاہئے یا نہیں۔

سکندر اعظم کی وفات کے ساتھ ہی یونانیوں میں انحطاط پیدا ہونا شروع ہوا اور یونانی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اس کے بعد ہمیں ایک وسیع سلطنت کا ذکر ملتا ہے جس کو ہم رومۃ الکبریٰ (Roman Empire) کے نام سے موسوم کرتے ہیں

رومی دور

ابتداً ۵۳۰ ق۔م میں سلطنت روما ایک چھوٹی سی شہری سلطنت تھی لیکن جب پہلی صدی عیسوی میں رومیوں نے وسیع سلطنت قایم کی تو ان کے قوانین، معاشرت، تہذیب و تمدن میں روزمرہ تبدیلیاں پیدا ہوتی گئیں اور مرکز کے اثرات ملک کے ہر حصہ پر پڑنے لگے۔ رومن ایمپائر دنیا کے ۱/۴ حصہ پر مشتمل تھی۔ اس زمانے میں قانون بین الممالک کی حد تک ایک خاص دور پیدا ہوا۔ رومی تصور یونانی تصور سے بہت ہی مختلف تھا۔ یونانیوں کا خیال تھا کہ یونانی نسل کے لوگ، باقی تمام دنیا کے باشندوں پر مرجع ہیں لیکن رومن ایمپائر میں ایک نسلی نہ تھی اس لئے ان کے تصور کا یونان سے مختلف ہونا ناگزیر تھا۔ رومی سلطنت میں بہت سی

نیم مختار ریاستیں تھیں ان سب میں مساوات تھی البتہ جو رومن ایمپائر کے باہر تھے ان کے لئے صوابدید پر عمل ہوتا۔ رومن ایمپائر کا باشندہ ہونیکے لئے ہم قوم ہونا ہم مذہب ہونا یا ہم قبیلہ ہونا ضروری نہ تھا۔ برخلاف اس کے یونانیوں کا تخیل تھا کہ ہم قوم ہونے کے لئے ہم نسل اور ہم مذہب ہونا بہت ضروری تھا۔ یونانیوں کا تصور تھا کہ صرف یونانی حکومت کرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں اور دوسری اقوام کو ان کے ماتحت بطور غلام رہنا چاہیئے۔ لیکن رومنوں میں ہم کو اس قسم کا امتیاز نظر نہیں آتا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ شہر روما کے باشندہ کو خاص مراعات حاصل تھیں لیکن جہاں تک قانون کا تعلق ہے رومی سلطنت کی رعایا میں باہم کوئی زیادہ فرق نہ تھا۔ اجنبی ممالک سے دوستی کا معاہدہ ہوتا تو شرائط معاہدہ پر عمل کیا جاتا اور اگر معاہدہ نہ ہوتا تو دشمن سمجھ کر جب موقع ملتا جان و مال کو نقصان پہونچانے میں باک نہ کیا جاتا۔

رومی زیادہ تر یونانیوں سے متاثر تھے۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ روما نے اگرچہ سیاسی طور پر یونان کو فتح کر لیا تھا لیکن علمی و ذہنی حیثیت سے وہ یونان کا مفتوح تھا۔ رومن ایمپائر کا سیاسی مسلک یہ تھا کہ جو ملک وہ فتح کرے ان کو اندرونی آزادی (Internal autanomy) دیتے۔ چنانچہ اس زمانے میں ہم کو بہت سی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں نظر آتی ہیں جو بالکل خود مختار تھیں صرف ایک چیز تھی وہ یہ کہ جب کبھی ان ذیلی حکمرانوں میں باہمی جھگڑے ہوتے تو ان کا مرافعہ رومن شہنشاہ کے پاس پیش ہوتا۔ اس کو اکثر مورخین Roman International Law کہتے ہیں لیکن یہ غلطی ہے حقیقت میں اگر Roman International Law ہوسکتا ہے تو صرف وہ قوانین ہیں جن کے ذریعہ رومی مختلف غیر رومی سلطنتوں سے اپنے تعلقات قائم رکھتے تھے۔

رومی مقننین نے دنیا کو تین حصوں میں تقسیم کیا تھا۔

(۱) رومی سلطنت (۲) معاہدہ سلطنت (۳) حربی سلطنت

رومن زمانے میں ان تینوں قسم کے علاقوں کے لئے مختلف قوانین تھے۔ قدیم رومی سلطنت میں اندرونی نظم و نسق کے لئے انتظامی قانون تھا۔ جن ممالک سے دوستی تھی ان کیلئے

قانون بین الممالک پر عمل ہوتا۔ جن ممالک سے دوستی نہ تھی ان سے قانون جنگ پر عمل ہوتا۔ تاجروں کے معاملات کے لئے عدالت قائم تھی جو ان کے مقدمات کا تصفیہ کرتی تھی۔

رومیوں نے قانون کی ترقی میں بہت بڑا حصہ لیا۔ چنانچہ آج دنیا کا ۳/۴ حصہ رومی قوانین کو اپنے نظامہائے قوانین کا سنگِ بنیاد بنائے ہوئے ہے۔ رومی زمانے میں ملکی اور غیر ملکی افراد کے باہمی نزاعات اور مناقشات کا تصفیہ کرنے کے لئے پریٹر (مفتی عدالت) مقرر کئے گئے تھے جن کو پریٹر اربانس یعنی مفتی داخلہ اور پریٹیر یا مفتی خارجہ کہتے تھے۔ آخرالذکر غیر ملکی افراد کے لئے قانون مدون کرتا جو (Eqaity) یعنی اصول نصفت پر مبنی ہوتا۔ رومی سفیر مختلف ممالک کو بھیجے جاتے تھے اور وہ سب قانون بین الممالک کے اصول پر عمل کرتے۔ اس زمانے میں اعلان جنگ کے مختلف طریقے تھے۔ جب کبھی کسی ملک سے اعلان جنگ کرنا ہوتا تو اس ملک کی سرحد پر ٹھہر کر نیزہ پھینک دیا جاتا تھا۔ نیزہ پھینکنا جنگ کا اعلان سمجھا جاتا تھا۔ جنگ وصلح کے معاملات ایک خاص مجلس کے سپرد تھے جس کو ہم College of Fetiali کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس جماعت میں بیس پجاری ہوتے تھے۔ یہ مجلس روما کی تمام خارجہ سیاست پر چھائی ہوئی تھی اور جنگ وامن کے تمام معاملات اس سے متعلق تھے۔ المختصر ہم کو اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ رومیوں نے قانون بین الممالک کے ارتقا میں بہت بڑا حصہ لیا جس کے بعد عیسوی دور آتا ہے۔ اس دور میں بھی قانون بین الممالک کے تصورات پر گہرا اثر پڑا اور بہت سی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔

عیسوی دور فلسطین کے شہر بیت اللحم میں حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے۔ انھوں نے ۱۲ آدمی تبلیغ کے لئے روانہ کئے تھے جن میں ایک شخص St. Peters سینٹ پیٹر روما بھیجا گیا تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم انتہائی محبت کے اصول پر تھی انھوں نے کہا تھا کہ دشمن سے بھی محبت کرو۔ اگر تمھیں کوئی ایک طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی پیش کردو۔ چونکہ یہ اصول فطرت کے منافی تھا اس لئے عیسائی اس پر عمل نہ کرسکے۔ دوسری چیز جو انھوں نے بتائی وہ یہ تھی کہ مذہب اور سیاست دو علٰحدہ علٰحدہ

چیزیں ہیں۔ اور پادریوں کو چاہیے کہ سیاسی معاملات بالکلیہ بادشاہ کی مرضی پر چھوڑ دیں۔ اس کا ناگزیر نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی سیاست میں عیسائی مذہب کو رہنمائی کا موقع کبھی نہ مل سکا۔ عیسائیت میں خون آشامی پیدا ہونیکی سب سے پہلی وجہ یہ ہوئی کہ یہودیوں نے ان کے خدا حضرت عیسیٰؑ کو قتل کردیا تھا جسکی وجہ سے ان میں فطری طور پر یہودیوں سے نفرت پیدا ہوئی وہ اُن سب پر ظلم کرنے کے لئے تیار ہوئے جنھوں نے ان کے خدا کو قتل کردیا تھا۔

جب قسطنطین Constentine روما کا شہنشاہ ہوا تو اس نے عیسائی مذہب کو قبول کرلیا چنانچہ اب یہاں سے قانون اور عیسائیت میں ایک تعلق پیدا ہوتا ہے۔ جب حکمرانوں کا مذہب عیسائیت ہوگیا تو اب یہ سوال پیدا ہوا کہ غیر ممالک کے ساتھ کن قوانین پر عمل کیا جائے۔ چنانچہ جب انھیں اپنی مذہبی کتاب میں سیاست کے لئے احکام نہ ملے تو وہ قدیم رومی اصول ہی پر عمل کرنے لگے اور مذہب کی محبت صرف ایک کتابی اندراج ہوکر طاق نسیان پر رکھ دی گئی۔

Constentine کے بعد St. Augustine کے خیالات کا اثر عیسائیت پر پڑا۔ یہ ایک درباری پادری تھا۔ اس نے کہا کہ عیسائیت کو دنیا میں پھیلایا جائے چاہے تلوار ہی کے زور سے کیوں نہ ہو۔ اس کے خیالات کا اثر اس زمانے کے حکمرانوں پر بھی پڑا چنانچہ اب عیسائیت میں تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوئی اور وہ مذہب جو رہبانیت کی تعلیم دیتا تھا جس کو سیاست سے کچھ تعلق نہ تھا۔ جو محبت کا اصول لیکر آیا تھا جس نے دشمن سے بھی محبت کرنا سکھایا تھا اب باقی نہ رہا۔ مذہب نے سیاست کا چولا بدلا۔ اور اب مذہب کی آڑ میں سیاسی جنگیں اپنے خاص خاص اغراض و مقاصد کے لئے لڑی جانے لگیں۔

صلیبی جنگیں ۵۷۰ء میں پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اور آپ ۶۳ سال کی عمر شریف کو پہنچ کر اس جہان فانی سے رخصت فرما ہوئے۔ آپ کی وفات کے وقت مسلمانوں کی حکومت عرب اور جنوبی فلسطین تک اور وفات کے پندرہ سال بعد اسپین سے ترکستان تک پہنچ چکی تھی۔ مسلمانوں نے بہت سی عیسائی مملکتوں پر قبضہ حاصل کیا

جب بیت المقدس اور اسکندریہ جیسے مقدس عیسائی مرکزوں پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تو عیسائیوں کو بہت ناگوار ہوا۔

عیسائیت کے مقدس شخص پوپ کا اس زمانہ میں پادریوں کے بداخلاقی کے باعث اقتدار گھٹتا جا رہا تھا۔ چنانچہ اس نے اس موقع کو بہت غنیمت جانا اور مسلمانوں کے خلاف نفرت اور حقارت کے خیالات پیدا کئے۔ یہ کہنا کہ جنگ عیسائیت کے لئے لڑی گئی بالکل غلط ہے، یہ جنگ دراصل پوپ کے اقتدار کو قائم کرنے کے لئے لڑی گئی تھی۔

اسلامی دور

قانون بین الممالک پر اسلام کا بہت ہی گہرا اثر پڑا۔ ہم بلاخوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسے ایک مستقل اسلامی مولفوں ہی نے بنایا اور صحیح معنوں میں قانون بین الممالک کی ترقی اسلامی دور ہی سے شروع ہوئی ہے۔

حضرت عثمانؓ کے زمانے میں مسلمانوں کی حکومت اسپین سے مغربی چین تک پہنچ چکی تھی۔ اس کا پایۂ تخت مدینہ تھا۔ اس اسلامی حکومت کے ساتھ ساتھ اس کا تمدن ترقی کرتا گیا جس کی بنیاد کلام مجید تھی۔ چنانچہ اسلامی قوانین کا اثر دوسرے ممالک پر بھی پڑا۔ اور لوگوں کے تصورات، خیالات، رجحانات و افکارات میں تبدیلی پیدا ہوتی گئی۔

اسپین میں مسلمانوں نے بڑے بڑے کالج قایم کئے۔ "الحمرا" اور "غرناطہ" مختلف علوم کے مراکز تھے جہاں تشنگانِ علم دور دور سے آکر اس چشمہ علم سے سیراب ہوتے گئے۔ فلسفہ ریاضی، منطق، سائنس، علم ہیئت اور مختلف علوم و فنون کی تعلیم دیجاتی تھی۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہے جیسا کہ Hoyland نے اپنی کتاب History of civilization میں اعتراف کیا ہے کہ یورپ جب جہالت و گمراہی کے دور میں ٹھوکریں کھاتا پھر رہا تھا اس وقت اسلامی تعلیمات کا سورج چمکا اور اس نے اپنی کرنوں سے یورپ کو منور کیا۔ اسلامی دور کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ مسلمانوں نے زبان، نسل اور رنگ کے فرق کو بالکل اٹھا دیا تھا۔ انھوں نے یہ تعلیم دی کہ "بنی آدم اعضای یک دیگر اند" انھوں نے مساوات کی تعلیم دی اور تمام بنی نوع انسان کو ایک رشتہ اتحاد و محبت

میں منسلک کردیا۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ تمام دنیا کے مسلمان ایک وحدت رکھتے ہیں مسلمانوں کے پاس اپنوں اور دوسری اقوام کے لئے کوئی الگ الگ قانون نہ تھا وہ صرف قرآن مجید کے احکام پر عمل کرتے تھے جو ہمیشہ انصاف کرنے کا حکم دیتا ہے انھوں نے کہا کہ دنیا کی تمام سلطنتیں آپس میں مساوات رکھتی ہیں۔ انھوں نے زبان، نسل، مذہب و رنگ کے فرق کو بالکل مٹا دیا۔ ان کے پاس مہذب وغیر مہذب کا کوئی فرق نہ تھا۔ ہم بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ قانون بین الممالک کو اگر کسی نے ترقی دی ہے تو وہ صرف مسلمان قوم ہی ہوسکتی ہے۔

سب سے پہلی شخصیت جس نے سب سے پہلی کتاب قانون بین الممالک پر لکھی وہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کی ہی جنکی وفات ۱۵۰ھ میں ہوئی۔ انھوں نے سیر کے نام سے مختلف لیکچر دئے تھے۔ ان کی اصلی کتاب اس وقت نہیں ملتی البتہ ان کے خیالات پر ہمعصروں کے اعتراضات اور ان کے جوابات دئے گئے ہیں وہ ان کے شاگرد ابو یوسف نے جمع کئے ہیں۔ ایک اور مؤلف سرخس ہیں جنھوں نے امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد امام محمد شیبانی کی کتاب سیر کبیر کی شرح لکھی ہے۔ یہ یاد رہے کہ مسلمانوں کے ایک ہزار سال بعد اس فن کو ایک علحدہ فن کی حیثیت دی گئی اور اس کے بعد بہت سے یورپی مفکرین مثلاً وانتنے میکاویلی ایالا چینٹلس، اور گروشس نے اس مضمون پر جو کتابیں لکھی ہیں وہ اسلامی مولفوں کے خیالات سے بہت کچھ متاثر ہیں اور آئین وسلی کے اسلامی مدرسوں میں سیکھی ہوئی باتوں ہی کا نامکمل خلاصہ ہیں فقط

قاضی سید غلام خالق نواز بی۔اے (عثمانیہ)

متعلم ال۔ال بی (آخری)

پھولوں کی ڈالی

ننھی ننھی شاخوں پر ہیں اُجلے اُجلے پھول
یا پتوں کی اس پر جا پڑ اُترے ہیں پاک رسول

سونا جیسے رنگت انکی، بجلی جیسا روپ
ان کے مکھ پر چھائی دیکھو، پیلی پیلی دھوپ

سبزہ جیسے نیلا منڈل، کلیاں جیسے تارے
سندر جل پر اُڑتے ہیں کچھ چاندی سی فوارے

ڈالی جیسی پیاری دلہن، ہنس مکھ اور دلدار
جھک کر جلوہ دیتی ہے، پھولوں کا پہنے ہار

پیشانی پر افشاں ہے، اور کلیاں گیسو میں
بسا ہوا ہے گلشن سارا جس سے خوشبو میں

پی کرامرت گلشن کا، جب جھولا یہ جھولے
مانو اپنا دکھیا من بھی، دکھ کی بپتا بھولے

آؤ سکھی اس ڈالی کو، اپنے سینے لگائیں
اس مرجھائی دنیا میں پھر اپنا جیون پائیں!

باقی

خاکہ اُڑانا

خاکہ اُڑانا (Caricature) وہ مستقل فن ہے جس کے ذریعہ کسی شخص یا چیز یا کسی واقعہ کی نمایاں خصوصیت کو تصویر، تحریر یا بیان کے ذریعہ اس طرح اُجاگر کرنا کہ دل سے ایک سرد آہ نکل جائے یا ہونٹوں پر بے ساختہ ہنسی دوڑ جائے ۔ وہی خاکہ کامیاب ہوگا جس کے دیکھتے ہی خاکہ اُڑانے والے کا مقصد فوراً سمجھ میں آجائے ۔ خاکہ میں نرالا پن اور اپچ کا ہونا ضروری ہے ۔

یہ فن موجودہ زمانہ میں نہایت وسیع ہو چکا ہے ۔ زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جسے خاکہ اڑانے والا اپنے دلچسپ انداز میں ہنسی، مذاق، ہجو یا ملامت کا نشانہ نہ بنا سکے حقیقت میں یہ اتنا ہی وسیع ہے جتنا کہ انسانی زندگی ۔ لیکن خاکہ نویس عام طور پر سیاسی مسائل، معاشی کمزوریوں سماجی برائیوں اور مشہور شخصیتوں کی ذاتیات اور ان کے اعمال پر اس طنزیہ طریقہ سے چوٹ لگاتے ہیں کہ اس سے ایک اصلاحی پہلو بھی نکل آتا ہے ۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض کام جو لمبی چوڑی تقریروں، بڑے بڑے مضامین، سیاسی، مذہبی اور اصلاحی انجمنوں سے ہو نہ سکے انہیں ایک طنزیہ چوٹ نے ایک مضحکہ خیز تصویر نے فوراً پورا کر دکھایا ۔ خاکہ اڑانا ہر شخص کا کام نہیں ۔ نقاشی کے اصول سے زیادہ نفسیات پر عبور رکھنا ضروری ہے ۔ ورنہ نقش بیکار اور ہجو بے معنی ہو جاتی ہے ۔

اس عجیب و غریب فن کی ابتدا یونان سے ہوتی ہے ۔ ارسطو، ارسطا فینس اور

پیلنی نے اپنی کتابوں میں یونانی خاکہ نویسوں مثلاً پازان، باپالس اور اتھینس کا ذکر کیا ہے۔ جنھیں اس فن کی وجہ سے بڑی مصیبتیں اُٹھانی پڑیں۔ باپالس اور اتھینس نے ملکر ایک مشہور یونانی شاعر ھیپونکس کی تصویر نہایت مذاقیہ انداز سے کھینچی۔ شاعر نے ان دونوں کے خلاف ایک ایسی ہجو نظم کہی کہ اُنہیں پھانسی لینی پڑی۔

انگلستان میں سب سے پہلے سرتھامس برون نے اس لفظ کو استعمال کیا اور پھر اڈیسن نے اپنے مشہور رسالہ "اسپکٹیٹر" میں۔ خاکے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک ادبی دوسرے مصورانہ۔ ادبی خاکوں کے لحاظ سے اٹھارویں صدی کافی مشہور ہے۔ سیوفٹ نے Gulliner's Travels) کے ذریعہ انسانی بیچارگی اور بڑائی کے تصورات کی جس انداز میں قلعی کھولی ہے وہ عبرت ناک ہے۔ اسمالٹ اور ہنری فیلڈنگ نے ناولوں کے ذریعہ بھی کام انجام دیا۔ پوپ نے شاعری کے ذریعہ اپنے زمانہ کی برائیوں اور اپنے ہم زمانہ لوگوں کی خوب لے دے کی۔ اُس زمانہ میں فوٹ، ھاگارتھ اور گلرے کے خاکوں کی بڑی شہرت ہوئی۔ چند برسوں کے بعد مصورانہ خاکے ادبی خاکوں سے زیادہ مقبول ہوئے۔ مصورانہ خاکوں میں عام طور پر بیوپار کرنے والوں، بینک والوں، وکیلوں اور پارلیمانی لوگوں کا مضحکہ اڑایا جاتا تھا مثلاً ایک خاکے میں نقاش نے انگلستان کے ایوان عام کا منظر اس طرح دکھایا ہے۔

کہ جناب صدر کرسی صدارت پر جلوہ افروز ہیں۔ مگر اس طرح کہ اُنھیں جمائی پر جمائی آرہی ہے۔ نیند کا یہ عالم ہے کہ جھونکے پر جھونکے کھا رہے ہیں۔ جب کرسی سے سر ٹکراتا ہے تو بیدار ہو جاتے ہیں اور خفت مٹانے یا بیداری کا اظہار کرنے میز پر تین چار ہاتھ مار بیٹھتے اور "آڈر آڈر" چیختے ہیں۔ کرسی صدارت سے دور ایوان کے ایک کونے میں نقاش نے دو ارکین کو بتایا ہے۔ جو آپس میں گھوڑ دوڑ کے متعلق گفتگو فرمارہے ہیں۔ دوسرے کونے میں دو حضرات اپنی گھر والیوں بچوں اور بچیوں کی بابت بات چیت کر رہے ہیں۔ ایک جگہ پر تو لوگ ایوان کی کارروائیوں سے بیزار ہو کر سو رہے ہیں۔ دوسری جگہ فیشن کے اہم سوالیہ

بڑی گرم بحث چھڑ گئی ہے جس کے نتیجہ کے طور پر ایک کا ہاتھ دوسرے کے کالر پر اور دوسرے کا تیسرے کی گردن پر ہے۔ ان جماعتی خاکوں کے علاوہ چھوٹے چھوٹے خاکوں اور انفرادی نوعیت کے خاکوں کا رواج بھی عام ہوگیا۔ غرض اس قسم کے خاکوں سے لوگوں میں بڑی دلچسپی پیدا ہوگئی اور اُنکی مانگ آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ لیکن سیاسی نوعیت کے خاکے اب بہت عام ہونا شروع ہوئے چونکہ اس زمانہ میں جماعتی کشمکش بہت تیز ہوچکی تھی اور لوگ اپنے مخالفوں اور دشمنوں کے مضحکہ خیز خاکے کھنچواتے اور خوش ہوتے تھے۔

خاکہ نویسی کا فنی اصول یہ ہے کہ قلم کی دو چار لکیروں سے کسی فرد یا جماعت یا کسی واقعہ کی سب سے نمایاں خوبی یا کمزوری کو نہایت اختصار یا نہایت مبالغہ کے ساتھ پیش کیا جائے۔ اگر ایک شخص کے خد و خال ٹھیک اوسی طرح اُتارے جائیں جس طرح کہ وہ اصل میں ہے تو پھر اُس خاکے میں کچھ لطف نہیں۔ اگر اس طرح اُتارے جائیں کہ اس شخص میں اور اُس خاکے میں مشابہت عیاں نہو تو وہ نہ صرف غیر اصولی ہے بلکہ غیر فطری بھی۔ خاکہ دیکھنے والے کو یہ احساس ہونا چاہئے کہ نقش میں اور اصل میں مشابہت کے کچھ نقوش موجود ہوں ــــــ

یہ نقوش اور یہ اجزا خواہ بالکل خیالی ہوں یا اُن کی بنیاد قطعی طور پر مبالغہ پر ہو اس سے خاکہ نویس کو کچھ سروکار نہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خاکہ نویس کسی واقعہ کو لکیروں کے ذریعہ ہماری آنکھوں کے سامنے اس طرح پیش کرتا ہے کہ خاکہ میں اور اس واقعہ میں جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے بظاہر کوئی مشابہت نہیں پائی جاتی۔ لیکن خاکہ نویس اس نازک خیالی سے خاکہ پر کام کرتا ہے کہ اُسے دیکھتے ہی خیال فوراً اُس شخص یا واقعہ کی طرف خود بخود رجوع ہوجاتا ہے۔

ایک ماہر فن خاکہ نویس کسی شخص یا واقعہ کا خاکہ اُتارنے سے پہلے اپنے موضوع کے وہ تمام اجزا ذہن سے خارج کردیتا ہے جو دوسرے اشخاص یا دوسرے واقعات میں بھی پائے جاتے ہوں۔ اب وہ اپنے موضوع کی نہایت واضح اور نہایت نمایاں خصوصیات کو

ٹٹولنا شروع کرتا ہے ۔ یہ خصوصیات معلوم ہونے کے بعد وہ انتخاب سے کام لیتا ہے اور صرف اسی انفرادی اور ذاتی خصوصیت کو چن لیتا ہے جو اس شخص کی زندگی کا نہ مٹنے والا جزیا اس واقعہ کی حقیقی روح ہے ۔ اب وہ پنسل یا سیاہی کی لکیروں سے اس خصوصیت کو اس طرح ابھارتا ہے اور اس پر اس شدت کے ساتھ زور دیتا ہے کہ ہر شخص اس کے اصل مقصد کو سمجھ جاتا ہے یہ اس کے اختیار میں ہے کہ وہ اس خصوصیت کو بہت بڑھا کر بتائے یا اتنا گھٹا کر دکھائے کہ ــــــ صرف اس بڑھنے اور گھٹنے سے وہ واضح طور پر نمایاں ہو جائے اگر ایک موٹا شخص عقل سے معذور ہے تو اس فن کا جاننے والا اس کا خاکہ اس طرح پیش کریگا کہ وہ پہلے تو ایک بہت بڑے ڈیل ڈول کے انسان نما پہاڑ کو اتارے گا اور اس پر ایک نہایت چھوٹے سر کو رکھدیگا ۔

اگر مولانا کی نگاہ کسی ایسے شخص پر پڑھ جائے جو ذہن کے تو بڑے تیز ہیں لیکن جسمانی اعتبار سے نہایت کمزور تو پھر انکی خیر نہیں ۔ انکا قلم فوراً ایک ایسے خاکہ کی طرف بڑھے گا جسمیں ایک بہت بڑا سر دبلے پتلے پاؤں پر لاد دیا گیا ہو ۔ آپ نے اکثر دیکھا ہو گا کہ وہ دو ہاتھ آگے نکلی ہوئی ناک، شتر مرغ کی طرح پتلی ٹانگیں، ڈھول کی طرح پھولا ہوا پیٹ ــــ یہ سب موضوع کی وہ خصوصیات ہیں جنھیں فن کار نہایت واضح طور پر اور مذاقیہ پیرایہ میں آپکے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے ۔

خاکہ اور کارٹون میں بڑا لطیف فرق ہے ۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ ایک دوسرے سے ملا دئے جاتے ہیں حالانکہ یہ جدا جدا فن ہیں ۔ کارٹون بنانے والا اس کی کوشش کرتا ہے کہ نقش دیکھتے ہی موضوع کے متعلق تمام واقعات اور حالات فوراً ذہن میں آجائیں ۔ کارٹون کی خوبی اس میں ہے کہ دیکھنے والا نہایت آسانی سے ایک ہی نظر میں ان تمام کیفیات کو تاڑ لے جو اس خاکہ کا باعث ہوئے ہیں ۔ ان کیفیات کو اس سادہ انداز اور اس قوت بیان کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے کہ نقش کا مرکزی خیال فوراً سمجھ میں آجاتا ہے ۔ برخلاف

کارٹون کے خاکہ میں اثر پر زور دیا جاتا ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ خاکہ میں بھی کسی نہ کسی کیفیت کو ظاہر کیا جاتا ہے لیکن اس میں واقعہ یا کیفیت کے کسی خاص حصہ یا کسی خاص جز کو بے حد نمایاں کیا جاتا ہے ۔ یعنی کارٹون میں اگر خیال کو اہمیت دی جاتی ہے تو خاکہ میں "اثر" پر زور دیا جاتا ہے ۔ ان دونوں میں جو چیز ملی ہوئی ہے وہ طنز اور ہجو کا بے پناہ جذبہ ہے۔ اس کے بغیر نہ کارٹون مکمل ہو سکتا ہے اور نہ خاکہ ۔

سیاسی خاکوں کی ابتدا ر کا سہرا جارج ٹاون شینڈ کے سر ہے جو بعد میں مارکوئیس ہو گئے ۔ انھوں نے کارڈس پر اپنے زمانہ کے بعض بڑے لوگوں مثلاً ڈیوک آف کمبرلینڈ لارڈ ڈلنگٹن اور لارڈ ہیوٹ جیسے لوگوں کے خاکے کھینچے جنھیں دیکھ کر لوگ بے تحاشہ ہنس دیتے اور پھر غضب یہ کہ یہ خاکے ایک مقام سے دوسرے مقام ایک گھر سے دوسرے گھر بھجوائے گئے ۔

یہ دلچسپ فن اٹھارویں صدی میں انگلستان کی سیاسی، سماجی اور درباری زندگی کے مختلف پہلوؤں اور بڑی بڑی شخصیتوں کی کمزوریوں کی طرف نہایت بے باکی سے متوجہ ہوتا ہے ۔ اس زمانہ کے بہت سے رسالوں مثلاً لندن میوزیم، پولیٹیکل رجسٹر، اکسفرڈ میگزین اور خاص طور پر ٹاون اور کنٹری میگزین نے اپنے آپ کو خاکوں کے لئے وقف کر دیا ۔ یہ رسالے کسی کی خانگی زندگی پر ہنستے اور ہنسانے سے رکتے تھے اور نہ سرکاری زندگی کو نشانہ ملامت بنانے سے چونکتے تھے ۔ ان سے سیاسی اور بڑے بڑے درباری بھی ڈرتے تھے ۔

خاکہ نویسی میں جدید رجحانات کی ابتدا ر ایک مشہور فرانسیسی نقاش چارلس فلیپان سے ہوتی ہے ۔ اس نے اپنے مختلف اخبارات ۔ Le Journal، Le Charinar اور La Caricature کے ذریعہ نئے خیالات اور نئے قسم کے خاکے پیش کئے۔ فلیپان سے پہلے کے نقاشوں نے خاکے کا واحد مقصد پبلک لوگوں کی خانگی زندگی، انکی

صورت وشکل ان کی حرکتوں اور عادتوں کو بیرحمی کے ساتھ عوام کے سامنے پیش کرنا قرار دیا تھا۔ ان کے پاس خاکہ کی بحیثیت ایک فن کے کوئی حیثیت نہ تھی۔ وہ صرف مخالفت کی خاطر یا پیسہ پیدا کرنے کے لئے خاکے اُتارتے تھے لیکن اس شخص نے خاکوں میں فنی خوبصورتی کی تلاش پر زور دیا۔ اس کی تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ بہت سے فرانسسی، جرمن، ہسپانوی اور انگریز خاکہ نویسوں نے خاکہ کے فنی پہلو پر زیادہ زور دینا شروع کیا۔

انگلستان میں خاکہ نویسی کے ذوق کی اصلاح میں پنچ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ پرچہ تقریباً (۱۰۰) سال سے نہایت ذمہ داری کے ساتھ خاکہ نویسی کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ اس کی نمایاں خصوصیت اوسط طبقہ کے تعصبات کی نقاشی اور زندگی کے ہر ظریفانہ اور مذاقیہ پہلو کی تشریح ہے۔ انگلستان کے بہت سے ظرافت نگار مصوروں اور خاکہ نویسوں مثلاً چارلس کین، رچرڈ ڈائل، فل لے، لیچھ، سر برنارڈ پاٹرچ، سر جان ٹینیل، ال ریون ھل نے اس پرچے کو اپنی کوششوں سے مشہور کر دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دوسرے خاکہ نویس رسالوں مثلاً جوڈی، سرفلائی، آئیڈلر، ٹم، اور مون شائین نے اس فن کی دلچسپیوں میں کافی اضافہ کیا لیکن پنچ کے مقابلہ میں انکی کوششیں معمولی ہیں۔

انگلستان کا وہ مشہور خاکہ نویس جس نے اس فن میں عالمی شہرت حاصل کی وہ Max Beerboohm ہے۔ میکس کے خاکے تعداد میں زیادہ اور فنی خوبی میں بے مثل ہیں۔ اس کے خاکے انگلستان کے مشہور رسائل ——— اسٹانڈرڈ میگزین، پک میں اپ، وانیٹی فیر اور دی بلو پک مین چھپ چکے ہیں۔ میکس اصل میں ایک فطری خاکہ نویس ہے۔ نہ صرف خاکہ نویس ہے بلکہ ماہر نفسیات بھی۔ اس میں لوگوں کے مزاج اور انکی شخصیت کو سمجھنے کی غیر معمولی صلاحیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے خاکے موضوع کی نفسیات کو قوت اور وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ ان خاکوں کے ذریعہ وہ بڑے لوگوں کی برائیوں کو نہیں بلکہ کمزوریوں کو پیش کرتا ہے تاکہ وہ سبق لیں اور ملک کی صحیح خدمت انجام دے سکیں۔

میکس کے ہم زمانہ لوگوں میں ایوانس اور ڈیولاک نے بھی کافی شہرت حاصل کی۔

جنگ عظیم کے زمانہ میں خاکہ نویسی کو بڑا عروج ہوا۔ بعض ملکوں میں تو اس فن کی سرکاری سرپرستی ہونے لگی۔ سپاہیوں کو فوج میں بھرتی کرنے، میدان جنگ میں اپنے لوگوں کی بہادری دکھانے اور دشمنوں کی بزدلی بتانے کے لئے اسے خاص طور پر استعمال کیا گیا۔ اس زمانہ میں خفیف سی مسکراہٹ یا ہنسی کی لہر جو ان خاکوں سے پیدا ہوتی بڑی غنیمت سمجھی جاتی ہے جرمنی کے مشہور ظرافت نگار اخبار Simplicissimus نے اس زمانہ میں بڑے دلچسپ خاکے پیش کئے جو سخت طنزیہ چوٹ، بیرحمانہ مذاق اور فنی خوبی کے لحاظ سے کافی مشہور ہیں۔

جنگ عظیم کے بعد خاکہ نویسی کی نوعیت میں تھوڑی سی تبدیلی ہوگئی۔ بین قومی تعلقات کی وجہ سے خاکوں میں اب وہ ہجو اور تلخی نہ رہی جو جنگ کے زمانہ میں پائی جاتی ہے پہلے اگر خاکہ نویس زیادہ تر سیاسیات میں اُلجھے رہتے تو اب تجارت، صنعت و حرفت، معاشرتی اور دوسرے امور کی طرف انکی توجہ منتقل ہوگئی۔ بہت سی تجارتی اور صنعتی کمپنیوں نے اپنی چیزوں کو مشہور کرنے کے لئے خاکہ نویسی سے کام لینا شروع کیا۔ یہ خاکے پوسٹروں، پرچوں اور دوسرے اشتہارات سے بھی زیادہ دلچسپ اور فائدہ مند ثابت ہوئے۔ سیاسیات سے دلچسپی رکھنے والے خاکہ نویسوں کی توجہ اب زیادہ تر پارلیمانی کارروائیوں کی طرف مبذول ہوگئی۔ ایوان عام اور ایوان خاص اور رائل اکیڈیمی کے متعلق معلومات آفرین خاکے کھینچنے والوں میں مسٹر فریزر، مسٹر ای ڈی ایڈ اور سرایف سی گولڈ نے بڑا امتیاز حاصل کیا۔ اور مسٹر سامبورن نے تو اس فن میں کمال کردیا۔ جنگ عظیم کے بعد جہاں بہت سی نئی چیزیں مان لی گئیں وہاں مردوں اور عورتوں کی مساوات کو بھی تسلیم کرلیا گیا۔ زندگی کے ہر شعبہ میں عورتوں کو جگہ دی جانے لگی۔ یہاں تک کہ پولس اور فوج میں بھی ان کی بھرتی کا سوال اٹھایا گیا۔ خاکہ نویس کی تیز نگاہیں انگلستان میں عورتوں کی پولس کے منظر کو نہایت شوخی سے دیکھ رہی تھیں۔ خیال کا آنا تھا کہ "زنانہ پولس" کے عنوان سے پنچ نے ایک خاکہ پیش ہی کردیا۔

اس خاکہ میں ایک حسین اور جمیل لڑکی کو جو راستہ پر پولس کے لباس میں انتظام کرتے دکھایا گیا ہے ۔ ادہر تو یہ حسین دوشیزہ مصروف انتظام رہتی ہے اور ادہر بدانتظامی، پریشانی اور گھبراہٹ کے تمام سامان خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں ۔ ایک راستہ پر دو نوجوان پولس والی کو دیکھتے ہی آپے سے باہر ہو جاتے ہیں ۔ ایک کے سینہ سے سرد آہیں نکل رہی ہیں آنسوں کا دریا بہہ رہا ہے اور گریبان تار تار ہے ۔ اور دوسرا ایک ہی نظر میں "ہائے غضب" کہتا ہوا سڑک پر بسمل کی طرح لوٹ جاتا ہے ۔ دوسرے راستہ پر بڑی عمر کے لوگ نہایت مسرت کے ساتھ پھولوں کے گلدستے پیش کرنے بڑہتے ہیں ۔ لیکن اس سوال پر کہ پہلے کون پیش کرے لڑمرتے ہیں ۔ تیسری طرف چند بے فکروں کا ایک گروہ سونے کے قریطہ میں رکھا ہوا اور پس وپیش کرتے پولس والی کی طرف بڑھتے ہیں اور راستہ بند ہو جاتا ہے ۔ چوتھی طرف دو ڈرائیور بجائے راستہ دیکھنے کے پولس والی کو گھورتے رہتے ہیں اور انکی موٹریں آپس میں بری طرح سے ٹکراتی ہیں ——— یہ تھا وہ منظر جو خاکہ نویس نے عورت پولس سے وابستہ کیا تھا ۔ اب آپ ہی خیال کر سکتے ہیں کہ کون شخص اس خاکہ کو دیکھنے کے بعد زنانہ پولس کی تائید کیا ہوگا ۔

ممالک متحدہ امریکہ میں جس شخص نے بحیثیت ایک مشہور خاکہ نویس کے شہرت حاصل کی وہ تھامس ناسٹ ہے ۔ حقیقت میں ناسٹ کا فن امریکی سیاسیات کی خاکہ نویس کا مجموعہ ہے ۔ چودھویں سال سے اس نے اس پیشہ کو اختیار کیا ۔ پہلے تو وہ "لیزلی ویکلی" میں کام کرتا رہا ۔ اس کے بعد ھارپرس ویکلی کے ذریعہ آخر وقت تک سیاسیات کے بعض پیچیدہ مسائل کو صاف کرتا رھا ۔ اس کے خاکوں کی سیاسی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ممالک متحدہ امریکہ کے صدر ابراھیم لنکن جب دوبارہ صدارت کے لئے کھڑے ہوئے تو ایک سیاسی جماعت نے انکی سخت مخالفت کی ۔ ناسٹ نے اس سیاسی جماعت کے خلاف ایسے تیز طنزیہ، مضحکہ خیز اور عبرت دلانے والے خاکے کھینچے کہ اس جماعت کو زک اٹھانی پڑی ۔ امریکہ

کی سیاسیات اصل میں دو مشہور جماعتوں ڈیموکراٹک پارٹی اور ری پبلک پارٹی کے ہاتھوں میں ہے ۔ ڈیموکراٹک جماعت کے لوگوں نے جب ہفتہ وار مذاقی پرچہ Puok جاری کیا تو مقابل جماعت نے جواب کے طور پر ایک طنزیہ ہفتہ وار پرچہ Judge کے نام سے جاری کیا۔ ان دونوں پرچوں کی چوٹیں بڑی دلچسپ ہیں اور ان سے امریکہ والوں کے سیاسی رجحانات کا کافی اندازہ ہوسکتا ہے ۔ سیاسیات سے بالکل علیٰحدہ رہ کر J. A. Mitchell نے خاکوں کے لئے ایک پرچہ Life جاری کیا ۔ یہی وہ مشہور پرچہ ہے جس کے ذریعہ امریکہ کے بلند خیال خاکہ نویس گیبسن نے امریکی عورتوں کی زندگی کے نمونوں کو خاکوں اور نقشوں کے ذریعہ تمام دنیا میں مشہور کردیا۔ گیبسن نے اگر امریکی عورتوں کی طرف خاص توجہ کی تو اے ۔ بی ۔ فراسٹ نے غریبوں کی زندگی کی خاکہ نویسی کو اپنے فن کا موضوع بنالیا ۔ اس طرح اس نے اپنے ملک والوں کی بڑی خدمت انجام دی ۔ امریکہ کے دوسرے خاکہ نویسوں میں ای باڈرسں کلاں اینجل اور آر سی سرین خاص طور پر مشہور ہیں ۔

موجودہ زمانے کے خاکہ نویسوں کی صلاحیت اور فن دانی کا اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ انھیں اپنے موضوعات کے متعلق نہایت تفصیلی معلومات ہوتی ہیں ۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ موضوع کی ناک کی کیا لمبائی ہے ۔ کان کتنے چوڑے ہیں گال کتنے پچکے ہوئے ہیں ۔ سر کتنا بڑا ہے ۔ پیٹ کتنا پھیلا ہوا ہے ۔ وزن کیا ہے قد کیا ہے ـــــ قلم کی چند حرکتوں سے آج وہ کسی سماجی رجحان یا بین قومی صورت حال کو اس وضاحت ، صفائی اور دلچسپی کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں کہ بغیر کسی کتاب ، رسالہ یا اخبار کے طویل مضامین پڑھے ہم موجودہ حالات اور رجحانات سے اچھی طرح واقف ہوجاتے ہیں ـــــ اور پھر اس طرح کہ ہمارے ہونٹوں پہ ہنسی اور جسم میں گدگدی محسوس ہوتی ہے ۔ اس فن کی اثر پذیری اور قوت کا یہ عالم ہے کہ

بڑے بڑے بہادر، اعلیٰ درجے کے سیاس، مشہور مقرر اور بڑے بڑے مدبر خاکہ نویسوں سے اس طرح ڈرتے ہیں جس طرح کہ لوگ شیطان کے سایہ سے ۔ اور ساتھ ہی اس کی کوشش بھی کرتے ہیں کہ اپنے اعمال اور افعال سے کوئی کام ملک اور قوم کے مفاد کے خلاف نہ کریں جس سے خاکہ نویسوں کے لئے خود موضوعِ مذاق، ہجو یہ طنز بنجائیں ۔ خاکے رائے عامہ میں بہت آسانی سے تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مضامین، تقاریر اور سینما سے یہ زیادہ جلد، دلچسپ اور موثر طریقہ پر اپنا مقصد مزاحیہ پیرایہ میں پورا کرتے ہیں ۔

محمد بن عمر ام اے (عثمانیہ)
لکچرار انگریزی گلبرگہ کالج
و سابق صدر انجمن اتحاد جامعہ عثمانیہ

تُو اور میں!

گلشنِ ہستی کا سارا جوش ہے تیرے لئے
وا گُلِ نوخیز کا آغوش ہے تیرے لئے
ذرہ ذرہ میکدہ بردوش ہے تیرے لئے
اور فطرت کی تغافل کوشیاں میرے لئے!

کیف آگیں ہر سنہری شام ہی تیرے لئے
مہ بدامن چرخ نیلی فام ہی تیرے لئے
روح پرور زندگی کا جام ہی تیرے لئے
اور شبنم سی سرشک افشانیاں میرے لئے!

چشم حیرانِ ثریا باز ہے تیرے لئے
رنگ میں ڈوبا ہوا ہر ساز ہی تیرے لئے
تارِ ہستی زمزمہ پرداز ہے تیرے لئے
اور سازِ غم کی نوحہ زائیاں میرے لئے!

کہکشاں ظلمت میں جلوہ بار ہے تیرے لئے
آبشارِ نغمہ، نغمہ بار ہے تیرے لئے
فرقِ دل ہر لحظہ سجدہ بار ہے تیرے لئے
اور چشمِ تر کی دریا باریاں میرے لئے!

بزم تاروں کی مسرت ریز ہے تیرے لئے
خامشی راتوں کی کیف انگیز ہے تیرے لئے
جامِ فطرت حسن سے لبریز ہے تیرے لئے
اور قدرت کی کرشمہ سازیاں میرے لئے!
جام ہستی کی شراب ناب ہے تیرے لئے
ساز ہے تیرے لئے مضراب ہے تیرے لئے
زندگانی ایک رنگین خواب ہے تیرے لئے
اور گرمِ جستجو بربادیاں میرے لئے!

علی احمد بی۔اے (عثمانیہ)

اکبر کے زمانے میں ہندوستان کے اوزان پیمانے اور سکے

موجودہ زمانے کی طرح اکبر کے زمانے میں بھی ہندوستان کی یہ نمایاں خصوصیت تھی کہ یہاں معیاری وزنوں کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کے غیر معیاری وزن کثیر تعداد میں استعمال کئے جاتے تھے۔ حکومت کی جانب سے مقرر کئے ہوئے وزنوں کا استعمال زیادہ تر ایسے علاقوں میں ہوتا تھا جو حکومت کے صدر مقام سے قریب ہوتے تھے۔ شہروں سے دور مختلف دیہاتوں میں کئی قسم کے وزن استعمال کئے جاتے تھے۔ شمالی ہند میں "من" جو عام طور پر استعمال کیا جاتا تھا اس کا وزن تقریباً ۲۸ یا ۲۹ پونڈ (ایک پونڈ=۱۶ اونس) بتلایا جاتا ہے۔ اکبر نے ایک "من" کا وزن چالیس سیر مقرر کیا۔ تخمینہ کیا گیا ہے کہ اس من کا وزن تقریباً ۵۶ پونڈ (ایک پونڈ۔ ۱۶ اونس) کے مساوی ہوتا تھا۔ دار السلطنت کے اطراف واکناف میں یہی "من" استعمال کیا جاتا تھا لیکن سلطنت کے دور دراز حصوں میں اس کا رواج نہ تھا۔ سورت اور کیمبے کی بندرگاہوں میں عام طور پر دو طرح کے من استعمال کئے جاتے تھے۔ ایک چھوٹا من کہلاتا تھا اور دوسرا بڑا من چھوٹے من کا وزن (۲۷) پونڈ اور بڑے من کا (۳۳) پونڈ تخمینہ کیا گیا ہے۔ جنوبی ہند میں لوگ جس من سے واقف تھے اس کا وزن (۲۰) اور (۳۰) پونڈ کے مابین گھٹتا بڑھتا رہتا تھا۔ لیکن جنوبی ہند میں وزن کی جو اکائی بہت زیادہ استعمال کی جاتی تھی وہ کھنڈی کہلاتی تھی۔ مقامات کا لحاظ کرتے ہوئے اسکا وزن بھی

بدلا ہوا ہوتا تھا۔ لیکن اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس کا وزن (۵۰۰) پونڈ کے لگ بھگ ہوتا تھا بجار کا بھی بار بار حوالہ دیا جاتا ہے۔ یہ ایک غیر ملکی اکائی تھی جسے عربوں نے بحرۂ ہند کے طول و عرض میں جاری کیا تھا۔ اس کا وزن تجارتی رسم و رواج کے مطابق جو مختلف اشیاء کی فروخت سے متعلق ہوتے تھے، گھٹتا بڑھتا رہتا تھا۔ لیکن عام طور پر وہ کھنڈی سے کم ہوتا تھا۔ اس زمانے کے یورپی مصنفین نے قنطال کا بھی حوالہ دیا ہے جس کا وزن (۱۳۰) پونڈ کے برابر ہوتا تھا۔

وزنوں کی طرح پیمانوں کا بھی کوئی مقررہ معیار نہ تھا۔ مختلف مقامات میں مختلف نوعیت کے پیمانے استعمال کئے جاتے تھے۔ شمالی ہند میں طول کی اکائی گز تھی۔ لیکن اس میں بھی اختلاف پایا جاتا تھا۔ اکبر نے ایک گز جاری کیا جسے الٰہی گز کہتے تھے۔ اس کا طول ۳۰ ۳/۴ انچ کے مساوی تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس کا استعمال زیادہ تر صرف شمالی صوبوں میں ہوا کرتا تھا مغربی ساحل کے تجارتی مرکزوں میں اس کا استعمال رائج نہ تھا۔ ان حصوں میں جملہ کاروبار کوآد کے ذریعہ انجام پاتے تھے۔ تجارتی مال کی نوعیت کے لحاظ سے کوآد کا طول بھی بدلا ہوا ہوتا تھا۔ یہ پیمانہ سوتی کپڑے کے لئے تقریباً ۲۶ انچ اور اونی کے لئے تقریباً ۳۵ انچ کا ہوا کرتا تھا (بتلایا گیا ہے کہ سوتی کپڑے کے لئے اس کا طول تقریباً (۲۶) انچ تھا اور اونی کپڑے کے لئے اس سے بھی زیادہ یعنی ۳۵ انچ ہوتا تھا۔)

اکبر کے زمانہ میں وزنوں اور پیمانوں کی طرح سکّے بھی مختلف نوعیت کے ہوتے تھے۔ نہیں ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں (۱) سونے کے سکّے (۲) چاندی کے سکّے (۳) تانبے کے سکّے اور کوڑیاں۔

سونے کے سکّے | **سہنسہ** یہ ایک سونے کا گول سکّہ ہوتا تھا جس کا وزن ۱۰۱ تولے ۹ ماشہ سات سرخ بتلایا گیا ہے۔ اس کی قیمت (۱۰۰) لعل جلالی کے برابر تھی۔ سکّے کے بیچ میں اکبر کا نام کندہ ہوتا تھا اور کناروں پر یہ عبارت کندہ ہوتی تھی "السلطان الاعظم الخاقان المعظم خلد اللہ ملکہ و سلطانہ ضرب دار الخلافہ فتح آگرہ"۔ سکّے کے دوسری جانب درمیانی حصہ میں کلمہ طیبہ اور " ان اللہ یرزق من یشاء بغیر حساب" کندہ ہوتا تھا اور چاروں طرف حضرات چہار خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے

اسمائے گرامی کندہ ہوتے تھے ۔ بعد میں سکّے کے ایک طرف یہ عبارت بڑھائی گئی تھی "افضل دینار ینفقہ الرجل دینارًا ینفقہ علی اصحابہ فی سبیل اللہ" اور دوسری طرف "السلطان العالی الخلیفۃ المتعالی خلد اللہ ملکہ وسلطانہ و ابدً عدلہ و احسانہ ۔ لیکن اس کے بعد یہ تمام عبارتیں کندہ کرنا موقوف کردیا گیا اور شیخ فیضی کی یہ رباعی کندہ کی جانے لگی ۔

خورشید کہ ہفت بحر از گوہر یافت — سنگ سیہ از پرتو آں جوہر یافت
کاں از نظر تربیت او زر یافت — وان زر شرف از سکّۂ شاہ اکبر یافت

اسی طرح سکّہ کی دوسری جانب پہلی عربی عبارت کی بجائے یہ رباعی لکھی جانے لگی ۔

ایں سکّہ کہ پیرایۂ امید بود — با نقش دوام و نام جاوید بود
سیمائے سعادتش ہمیں بس کہ بدہر — یک ذرّہ نظر کردۂ خورشید بود

اس کے ساتھ ساتھ سکّے کے اسی جانب الٰہی سنہ اور مہینہ بھی کندہ کردیا جانے لگا ۔

لعل جلالی ۔ یہ سکّہ گول اور چوکور دونوں قسم کا ہوتا تھا ۔ لعل جلالی گول کی قیمت دو مہر کے مساوی تھی ۔ ایک مہر کی قیمت گیارہ روپیہ بتلائی گئی ہے ۔

سہنسہ نامی ایک اور سکّہ بھی رائج تھا ۔ اس کی شکل وصورت بھی اولذکر سکّے کی سی ہوتی تھی لیکن یہ سکّہ وزن میں مقابلتہً کم تھا ۔ اس کا وزن نوّے تولے آٹھ ماشہ تبلایا جاتا ہے ۔ اس کی قیمت سو گول اشرفیوں کے برابر تھی ۔

گول اشرفی ۔ یہ سکّہ وزن اور قیمت میں عدل گٹکہ کے برابر تھا لیکن اس کا نقش مختلف تھا

عدل گٹکہ ۔ یہ سکّہ بھی گول تھا ۔ اس کا وزن گیارہ ماشہ تھا ۔ اس سکّہ کے ایک جانب "اللہ اکبر" اور دوسرے رخ پر "یامعین" لکھا ہوتا تھا ۔

رہس ۔ یہ سکّہ سہنسہ کا نصف اور شکل میں چوکور ہوتا تھا ۔ اس کے ایک طرف سہنسہ کا نقش کندہ ہوتا اور دوسری طرف شیخ فیضی کی یہ رباعی لکھی ہوتی تھی ۔

ایں نقد رواں گنج شاہنشاہی — با کوکب اقبال کند ہمراہی
خورشید بہ پرورش ازاں رو کہ بدہر — یابد شرف از سکّۂ اکبر شاہی

آتمہ = سہنسہ کا ۱/۴ ہوتا تھا۔ یہ سکّہ گول اور چوکور دونوں طرح کا ہوتا تھا۔ بعض سکوں پر تو سہنسہ کا نقش کندہ ہوتا تھا اور بعض کے ایک طرف شیخ فیضی کی یہ رباعی کندہ ہوتی تھی۔

این سکّہ کہ دست بخت را زیور باد   پیرایۂ نہ سپہر ہفت اختر باد

زرین نقدیست کار ازو چون زر باد   در دہر رواں بنام شاہ اکبر باد

دوسری طرف "خورشید کہ ہفت بحر ازو گوہر یافت" والی رباعی کندہ ہوتی تھی۔

بِنْسَت = آتمہ کی طرح یہ سکّہ بھی گول اور چوکور دونوں قسم کا تیار کیا جاتا تھا۔ اس کی قیمت سہنسہ کی ۱/۵ ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ سونے کے بعض اور سکّے بھی رائج تھے جو شکل اور نقش میں بنست کی طرح ہوتے تھے اور قیمت میں سہنسہ کے ۱/۸، ۱/۱۰، ۱/۲۰ اور ۱/۲۵ حصوں کے برابر تھے۔

چُگل = یہ چوکور سکّہ تھا۔ اس کا وزن تین تولے ۴ ۱/۵ سرخ ہوتا تھا۔ اس کی قیمت تیس (۳۰) روپیہ کے مساوی تھی۔

گرد = جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ ایک گول سکہ تھا۔ اس کا وزن دو (۲) تولے نو ماشہ اور قیمت تین لعل جلالی مہر کے برابر تھا۔ اور ایک مہر کی قیمت گیارہ روپیہ بتلائی جاتی ہے۔

آفتابی = یہ سکّہ بھی گول ہوتا تھا۔ اس کا وزن ایک تولہ دو ماشہ ۴ ۳/۴ سرخ اور قیمت بارہ روپیہ تھی۔ اس کے ایک طرف اللہ اکبر جل جلالہٗ اور دوسری طرف دار الضرب کا نام اور سنہ الٰہی کندہ ہوتا تھا۔

الٰہی = یہ بھی ایک گول سکہ تھا۔ اس کا وزن ۱۲ ماشہ ۱ ۱/۴ سرخ تھا۔ اس پر بھی آفتابی سکہ کا نقش کندہ ہوتا تھا اور اس کی قیمت دس روپیہ کے برابر تھی۔

محرابی = یہ سکہ وزن، قیمت اور نقش میں گول اشرفی کے برابر ہوتا تھا۔

معینی = یہ سکہ گول اور چوکور دونوں طرح کا ڈھالا جاتا تھا وزن اور قیمت میں لعل جلالی اور گول اشرفی کے برابر تھا۔ اس پر "یا معین" کندہ ہوتا تھا۔

متذکرہ بالا مختلف سکوں کے علاوہ حسب ذیل سکّے پائے جاتے تھے:۔

چہار گوشہ = وزن اور قیمت میں آفتابی کے برابر

ربی یا ربعی - آفتابی کا $\frac{1}{4}$

دہن - لعل جلالی کا نصف

پانڈو - لعل جلالی کا $\frac{1}{5}$

من - الہٰی اور جلالی سکوں کا $\frac{1}{4}$

ثمنی - الہٰی سکے کا $\frac{1}{8}$

کلا - الہٰی سکہ کا $\frac{1}{16}$

ذرہ - الہٰی سکہ کا $\frac{1}{32}$

سلیمی - عدل گٹکے کا نصف

نصف سلیمی - عدل گٹکے کا $\frac{1}{4}$

سونے کے سکّے اکثر مقامات پر ڈھالے جاتے تھے لیکن اس زمانے میں صرف چار مقاموں یعنی دار الخلافت، بنگالہ، احمد آباد و گجرات اور کابل میں تیار کئے جاتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ سونے کے سکّے کثیر تعداد میں پائے جاتے تھے لیکن ان کا استعمال بہت کم ہوتا تھا۔ کیونکہ یہ لوگوں کی روزمرہ ضروریات کی پابجائی کے لئے بالکل ناموزوں تھے ان کی طلب زیادہ ترجمع کرنے کی غرض سے ہوتی تھی۔ لعل جلالی۔ دھن اور من تینوں سکّے ایک ایک مہینے میں ڈھالے جاتے تھے۔ دوسرے سکّے کسی خاص احکام کے بغیر نہیں ڈھالے جاتے تھے۔

چاندی کے سکّے = چاندی کے سکوں میں زیادہ تر روپیہ کا رواج تھا۔ یہ سکہ گول اور وزن میں ساڑھے گیارہ ماشہ (۱۷۲ $\frac{1}{2}$ گرین) ہوتا تھا۔ اس سکّے کے ایک طرف اللہ اکبر جل جلالہٗ کندہ ہوتا تھا اور دوسری طرف تاریخ تسکیک لکھی ہوتی تھی۔ اس کی قیمت چالیس دام (تانبے کا سکّہ) قرار دی گئی تھی۔ حالات کا لحاظ کرتے ہوئے اس کی قیمت گھٹتی۔ بڑھتی رہتی تھی لیکن تنخواہوں کی ادائی میں اس کی قیمت ہمیشہ چالیس دام سمجھی جاتی تھی۔

چاندی کا ایک اور سکہ بھی جاری تھا جسے جلالہ کہتے تھے۔ یہ چوکور شکل کا ہوتا تھا اور اکبر ہی کے زمانے میں رائج کیا گیا تھا۔ اس پر روپیہ کا سا نقش کندہ ہوتا تھا اور اس کی قیمت بھی روپیہ کے مساوی تھی۔ جلالہ کے ذیلی سکے حسب ذیل تھے :۔

درب ۔ جلالہ کا $\frac{1}{2}$

چیرن ۔ جلالہ کا $\frac{1}{4}$

پانڈو ۔ جلالہ کا $\frac{1}{5}$

اشٹ ۔ جلالہ کا $\frac{1}{8}$

دسا ۔ جلالہ کا $\frac{1}{10}$

کلا ۔ جلالہ کا $\frac{1}{16}$

سوکی ۔ جلالہ کا $\frac{1}{20}$

چاندی کے سکے دہلی، بنگالہ، احمد آباد و گجرات اور کابل کے علاوہ مزید دس مقامات پر ڈھالے جاتے تھے۔ ان مقامات کے نام یہ ہیں۔ الہ آباد، آگرہ، اجین، سورت، دہلی، پٹنہ، کشمیر، لاہور، ملتان، اور مانڈہ۔

تانبے کے سکے = چاندی کے سکوں میں روپیہ اور جلالہ کی طرح تانبے کے سکوں میں دام بہت اہمیت رکھتا تھا۔ اس سکے کے ایک طرف دار الضرب کا مقام کندہ ہوتا تھا اور دوسری طرف سنہ اور مہینہ لکھا ہوتا تھا۔ اس کا وزن ایک تولہ سات ماشہ (۵ء۳۲۳ گرین) اور قیمت روپیہ کا $\frac{1}{40}$ ہوتی تھی یعنی ایک روپیہ میں چالیس دام ہوتے تھے۔ حساب کی غرض سے دام کے پچیس حصے سمجھے گئے تھے اور ہر حصہ کو جیتل کہتے تھے۔ یہ خیالی حصے صرف حساب لکھنے میں استعمال کئے جاتے تھے۔ دام کے حسب ذیل ذیلی سکے بھی رائج تھے۔

ادھیلہ = $\frac{1}{2}$ دام

پاؤلی = $\frac{1}{4}$ "

دمڑی = ⅛ دام

معمولی اغراض کے لئے کوڑیاں بھی استعمال کی جاتی تھیں۔ ان کی قدر چاندی یا تانبے کے مقابلے میں اس فاصلے پر منحصر ہوتی تھی جو ساحل سے ہوتا تھا۔ تانبے کے سکوں کی تسکیک کے لئے علحدہ دار الضرب تھے۔ ان کی تعداد اٹھائیس تبلائی گئی ہے۔ ان کے نام یہ ہیں۔ اجمیر، اودھ، اٹک، الور، بدایون، بنارس، بھکیر بہرہ، پٹن، جون پور، جالندھر، ہردوار، حصار فیروزہ، کالپی، گوالیار، گھورپور، کلالوز، لکھنو، مندو، ناگور، سرہند، سیالکوٹ، سرونج، سہارن پور، سارنگ پور، سنبل، قنوج اور رنتھبور۔

سونے چاندی اور تانبے کے سکوں کا ذکر کرنیکے بعد زر کی قوت خرید کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ آئین اکبری میں قیمتوں کے جو اعداد درج ہیں ان کی مدد سے مورلینڈ نے تخمینہ کیا ہے کہ "سولھویں صدی کے اختتام پر دار السلطنت کے قرب وجوار میں ایک روپیہ میں جس قدر اناج ملتا تھا وہ اس مقدار سے کم از کم سات گنا زیادہ تھا جو شمالی ہند میں سنہ ۱۹۱۰ء اور سنہ ۱۹۱۲ء کے درمیان ایک روپیہ میں خرید اجا سکتا تھا۔ اسی طرح روغندار تخم گیارہ گنا اور کپڑا غالباً پانچ گنا زیادہ ملتا تھا۔ اس کے برخلاف دھاتیں اب سے (سنہ ۱۹۱۰-۱۲) کچھ زیادہ سستی نہ تھیں اور اشیائے درآمد زیادہ گراں فروخت ہوتی۔ کہا جاسکتا ہے کہ مفلس ترین طبقوں کے حق میں سنہ ۱۶۰۰ء کا ایک روپیہ سنہ ۱۹۱۲ء کے سات روپیوں کے برابر قدر رکھتا تھا۔ جو طبقے انتہائی افلاس کی حد سے ذرا بڑھیا تھے ان کے حق میں وہ تقریباً چھ روپیہ کے برابر تھا۔ اور متوسط طبقوں کے لئے وہ تقریباً پانچ روپیہ اس سے بھی کچھ زیادہ کے برابر تھا۔ لہذا عام اغراض کے لئے یہ خیال کرنا قرین عقل ہے کہ اکبر کا ایک روپیہ قوت خرید میں زمانہ قبل از جنگ سنہ ۱۹۱۴ء کے چھ روپیوں کے برابر تھا۔ بہ الفاظ دیگر یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ پانچ روپیہ کی ماہانہ آمدنی سے ضروریات کی اس قدر مقدار میسر آسکتی تھی جس قدر کہ سنہ ۱۹۱۲ء میں تیس روپیے کی آمدنی سے خریدی جا سکتی تھی"۔ یہاں تک تو ہم نے شمالی ہند کے سکوں کے حالات بیان کئے اب جہاں تک جنوبی ہند کا

تعلق ہے وہاں کا زرِ خاص کر سونے پر مبنی تھا۔ معیاری سکہ مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا تھا کبھی وہ وراہپچو کہلاتا تھا اور کبھی ہُن۔ لیکن اہل یورپ کی تحریروں میں اسے عام طور پر پگوڈا کہا جاتا ہے۔ اس کی اوسط قدر اکبر کے تقریباً ساڑھے تین روپیوں کے برابر سمجھی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور چھوٹا طلائی سکہ بھی جاری تھا جسے خانم کہتے تھے۔ اس کے علاوہ کئی اور چاندی اور تانبے کے معاون سکے بھی مروج تھے۔

ملکی سکوں کے علاوہ ساحلی تجارت کا بہت بڑا تعلق غیر ملکی سکوں سے بھی تھا۔ لاآرن ایرانی زر تھا اور بڑی مقدار میں ہندوستان پہنچتا تھا۔ اس کی شکل چاندی کے ایک خمیدہ ٹکڑے یا سلاخ کی سی ہوتی تھی جس کے کنارے پر مہر لگی ہوئی ہوتی تھی۔ اس کی قدر اکبر کے نصف روپیے سے بھی کم تھی۔ سیکوین یا چکین نامی ایک اور سکہ بھی پایا جاتا تھا۔ یہ وینس کا ایک طلائی سکہ تھا اس کی قدر اکبر کے تقریباً چار روپیوں کے برابر تھی۔ اٹلی کے ڈوکاٹ بھی پائے جاتے تھے۔ طلائی ڈوکاٹ کی قدر اکبر کے تقریباً چار روپیوں کے مساوی تھی اور نقروی ڈوکاٹ کی قدر اکبر کے دو روپیوں کے برابر تھی۔ اسپین کے ریال بھی جاری تھے۔ ریال کی قدر انگریزی زر میں چھ پنس سے کسی قدر زیادہ ہوتی تھی۔ آٹھ ریال کا ایک سکہ چار شلنگ اور تقریباً چھ پنس کے مساوی تھا۔

اس مضمون میں سکوں سے متعلق جو مواد پیش کیا گیا ہے اس سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں :-

(۱) اکبر کے زمانے میں بھی سارے ہندوستان کے لئے وزن یا پیمانوں کا ایک مقررہ معیار نہ تھا۔ اکبر نے من کا وزن چالیس سیر مقرر کیا تھا مگر معیاری حیثیت سے اس کا استعمال دارالحکومت کے اطراف و اکناف تک محدود تھا۔ جنوبی ہند میں کھنڈی کا استعمال عام تھا مگر اس کا بھی ایک مقررہ وزن نہ تھا۔ ناپنے کیلئے اکبر نے الٰہی گز جاری کیا تھا لیکن اس کا استعمال بھی محدود تھا مغربی ساحل کے تجارتی مرکزوں میں ناپنے کے لئے کوا د کا استعمال ہوتا تھا۔ لیکن حالات کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا طول بھی بدلتا رہتا تھا۔

(۲) شمالی ہند میں تین قسم کے سکّے جاری تھے۔ سونے کے سکّے۔ چاندی کے سکّے اور تانبے کے سکّے۔ سونے کے سکوں کی قیمت بہت زیادہ تھی لیکن یہ سکّے بہت کم استعمال میں آتے تھے۔ انہیں عام طور پر ذخیروں کی شکل میں رکھا جاتا تھا۔ البتہ چاندی اور تانبے کے سکّے کثرت کے ساتھ استعمال کئے جاتے تھے۔

(۳) مورلینڈ نے اندازہ کیا ہے کہ مفلس ترین طبقوں کے حق میں سنہ ۱۶ئہ کا ایک روپیہ سنہ ۱۹۱۲ء کے سات روپیوں کے برابر قدر رکھتا تھا۔

(۴) شمالی ہند کے برعکس جنوبی ہند میں زیادہ تر سونے کے سکّے استعمال کئے جاتے تھے ملکی سکوں کے علاوہ ساحل کے تجارتی مرکزوں میں غیر ملکی سکّے مثلاً لازن، سیکدین، ڈوکاٹ اور ریال بھی پائے جاتے تھے۔

نوٹ۔ اس مضمون کے لئے حسب ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔

(۱) آئین اکبری

(۲) (1) India At the Death of Akbar by W. H. Moreland

(۳) (2) The Commercial Policy of the Moguls by D. Pant.

محمد ناصر علی ایم اے (عثمانیہ)
لکچرار شعبہ معاشیات

انسان اور فطرت

(۱)

حسیں دیوی سحر کی، نور برساتی ہوئی آئی — تبسم کو گلابی رخ پہ لہراتی ہوئی آئی
دیا پیغامِ بیداری ہمیں رنگین نواؤں نے — ہوا کی شوخیوں نے آبشاروں کی صداؤں نے
ہماری خلوتِ معصوم میں حائل نہ تھا کوئی — ہماری بزم میں ہنگامۂ محفل نہ تھا کوئی
جھلکتی تھی ستاروں کی چمک اسکی نگاہوں میں — سنہری بجلیوں کا نور تھا اسکی اداؤں میں
حیاتِ تازہ اس کے پیکرِ سیمیں میں رقصاں تھی — شگفتہ پھول کی مانند وہ شاداں و فرحاں تھی
سویرے ہم نکل کر گھومتے تھے کوہساروں میں — سہانے جنگلوں میں، لہلہاتے مرغزاروں میں
کوئی زیر و زبر پیدا تھا دریا کے ترنم میں — کوئی رنگین ادا پنہاں تھی پھولوں کے تبسم میں

(۲)

حسین دیوی سحر کی، اب جگا سکتی نہیں اس کو — کوئی رنگین نوا آکر اُٹھا سکتی نہیں اس کو
ہماری خلوتِ معصوم میں حائل نہیں کوئی — ہماری بزم میں ہنگامۂ محفل نہیں کوئی
جھلکتی ہے شفق کی مُردنی اس کی نگاہوں میں — سنہری بجلیاں باقی نہیں اسکی اداؤں میں
سکوتِ موت اس کے پیکرِ خاکی پہ طاری ہے — کہ جیسے کوئی مرجھائے ہوئے پھولوں کی کیاری ہے
سویرے اب نہ گھومے گی کبھی وہ کوہساروں میں — سہانے جنگلوں میں، لہلہاتے مرغزاروں میں
وہی سرسبزیاں باقی ہیں لیکن مرغزاروں میں — وہی نغمے فضاؤں میں، وہی شورِ آبشاروں میں
وہی زیر و زبر باقی ہے دریا کے ترنم میں — وہی رنگینیاں باقی ہیں پھولوں کے تبسم میں

محمد نعیم الدین صدیقی ایم اے (عثمانیہ)

تھرمامیٹر!

شیوچرن کپڑے پہن رہا تھا۔ وِملا سوچ رہی تھی "آج بھی کیا یہ کام پر چلے جائیں گے۔ بچہ بیمار ہے، رات بھر بخار سے تڑپتا رہا ہے۔ ابھی اس کی آنکھیں لگی ہیں، انہیں اس کی کچھ بھی فکر نہیں! مرد کے دل میں ہمدردی ہوتی ہی نہیں۔ میں اکیلے اب دن بھر اس بیمار بچے کے پاس بیٹھی روتی رہونگی، اس کا بھی انہیں کیا کچھ خیال ہے۔"

اس نے کہا — "آج نہ جائیے۔ آپ کے لوٹنے تک نہ جانے اسکی طبیعت کتنی خراب ہو جاتی ہے"

شیوچرن سوچ رہا تھا، "میں گھر بیٹھے کیا کرسکتا ہوں۔ یہ سمجھتی ہے کہ اپنے شوہر کے گھر پر رہنے سے اسے بخار نہ آئے گا۔ روپیہ پاس نہیں ہے۔ آج بیس تاریخ ہوگئی ہے، شائد انسویا میری تنخواہ دے دیں گے۔"

اس نے کہا — "دوا ابھی تو لائی ہے" روپیہ مطلق پاس نہیں ہے۔ کل میں نے ان سے کہا کہ میرے لڑکے کی طبیعت خراب ہے روپیہ چاہئے۔ آج وہ دے دیں گے"

وہ سوچ رہی تھی، "ان میں کچھ بھی ہمت نہیں ہے۔ بیس تاریخ ہوگئی ہے۔ دوسرا مہینہ بھی پورا ہوتا ہے، ابھی تک اپنی ماہوار نہیں مانگ سکے!" اور کہنے لگی — "کل بھی تو آپ یہی کہتے تھے، آج نہ جائیے، وہ روپیہ ابھی نہیں دیں گے۔"

شیوچرن کہنے لگا — "اُن سے روز کہنا پڑتا ہے۔ اُس مہینے بھی تو اٹھارہ تک روپیہ نہیں ملا تھا اب تو بیس ہوگئی ہے، دے ہی دیں گے"

شیوچرن اور وِملا، شوہر اور بیوی، اس چھوٹے سے شہر کے ایک مکان کے نچلے حصے میں

رہتے تھے۔ شیوچرن النویا پرشاد کی دوکان پر محرر تھا۔ بیس روپیہ ماہانہ ملتے تھے۔ وہ بھی کبھی ٹھیک وقت پر نہیں۔ آٹھ دس تاریخ تک تو شیوچرن خاموش رہتا، اس کے بعد اسے کہنا پڑتا ــــ "میری تنخواہ...."
"کل لے لیجئے" النویا پرشاد کچھ بیزاری سے کہہ دیتے۔

دوسرے دن شیوچرن سمجھتا، انہیں یاد ہی ہوگا، دے ہی دیں گے، اس لئے چپ رہتا۔ لیکن النویا پرشاد کو کچھ بھی خیال نہ رہتا۔ تیسرے چوتھے دن شیوچرن گھر لوٹتے وقت پھر ایک بار ہمت کرکے آہستہ سے کہتا ــــ میری تنخواہ ....."
جواب ملتا ــــ "ہاں، تو کل لے لیجئے۔"

اسی طرح چار پانچ بار کل" ہوتے ہوتے بیس بائیس تک شیوچرن کو روپئے ملتے، وہ بھی اس شرط پر کہ دس آج لے لیجئے اور دس کل، اسی رقم میں تین جانیں پرورش ہو رہی تھیں۔ دو روپے مکان کا کرایہ ہوتا تھا۔ تیرہ چودہ تک بنئے کا حساب اور چار پانچ دیگر ضروریات میں خرچ ہوجاتے تھے۔ ان کی زندگی اسی طرح گزر رہی تھی۔ چار برس سے یہی حال تھا۔ لیکن بچے کی بیماری نے انہیں سخت پریشان کر رکھا تھا۔

"روپیہ لے کر آپ جلد آجائیے۔ دو دن ہوگئے ہیں، ڈاکٹر صاحب کو کیا جواب دیں گے؟ بیچارے اتنے مہربان تو ہیں کہ بچے کو ہسپتال نہیں لیجانے دیتے، بغیر فیس لئے دیکھنے آجاتے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ دن میں چار پانچ بار ٹمپریچر (حرارت) لیتے رہنا اور اس کو لکھ بھی لینا۔ لیکن ابھی تک تھرمامیٹر ہی نہیں آیا۔ پڑوس میں وکیل صاحب کے پاس ہوگا، ان سے بھی نہیں مانگ لائے"

"وکیل صاحب ہمیں کیوں دیں گے؟" شیوچرن کہنے لگا ــــ "کل ہی میں مانگنے گیا تھا۔ کہہ دیا کہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ میں جاتا ہوں، روپے مانگ کر ابھی تھرمامیٹر لئے لوٹ آؤں گا"
ؔرملا نے کہا ــــ "ہاں، تھرمامیٹر تو لانا نہایت ضروری ہے، دوا پھر بھی آسکتی ہے۔ اس دن ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کہ بغیر ٹمپریچر دیکھے میں ٹھیک ٹھیک دوا نہیں لکھ سکتا۔ کل تو اسے بہت بخار تھا۔ آج اگر ڈاکٹر صاحب کے آنے تک تین چار بار ٹمپریچر نہ لیا جائے، تو ٹھیک دوا نہیں ملے گی۔ آپ جلدی روپیے

لے کر آ جائیے۔ لیکن اگر انھوں نے آج بھی روپیہ نہ دیا تو ــــ" وہ سوچنے لگی ــــ "میرے پاس کوئی ایسا زیور بھی نہیں ہے کہ بیچ سکوں۔ ڈاکٹر صاحب شام کو ضرور آئیں گے۔ ان کی ہدایات پر عمل نہ کیا جائیگا تو وہ بہت خفا ہوں گے۔ ان سے آج بھی روپیہ نہ مانگا جائیگا، کچھ فکر ہی نہیں۔ کہنے تو ہیں کہ ابھی لوٹ آؤنگا، لیکن شام تک نہیں آئیں گے"

آہستہ آہستہ وہ اپنے صندوق کے پاس گئی۔ کھول کر دیکھا، کپڑوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ایک سفید اونی سوئٹر نکالتے ہوئے اس نے کہا۔ "کیا یہ بک جائیگا؟ میں نے کچھ دن آگے آپ کے لئے بنایا تھا۔ آپ کے لئے پھر بنا دونگی۔ بچے کے لئے تھرما میٹر بہت ضروری ہے"۔

شیو چرن کچھ دیر اسے بغور دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ کمرے کے باہر جاتے ہوئے اس نے کہا ــــ "تھرما میٹر لے کر میں ابھی آتا ہوں"

راستے میں چلتے چلتے وہ سوچ رہا تھا کہ آج جاتے ہی روپیہ مانگتا ہوں۔ کہونگا بچہ بہت بیمار ہے آج میں دوکان پر کام نہیں کر سکتا،

(۲)

دوکان پر آنسو یا اسی کے انتظار میں تھے۔ جاتے ہی کہا ــــ "اکیل کا لکھنو سے تار آیا ہے۔ وہ چھٹیوں میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کشمیر گھومنے جا رہا ہے، اس کے لئے دو سو روپے ابھی تار سے بھیج دو۔" شیو چرن کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ روپے لیکر وہ سیدھے تار گھر کی طرف چل دیا۔ روپیہ بھیج کر جب وہ لوٹ رہا تھا، تو یہی سوچ رہا تھا کہ زملا میرے انتظار میں بیٹھی ہوگی۔ رتیش کو بخار چڑھ آیا ہوگا۔ اب جاتے ہی روپیہ مانگ کر چل دیتا ہوں۔ ایک منٹ بھی نہ رکونگا۔

دوکان پر پہنچتے ہی آنسو یا پرشاد بولے ــــ "دو آرڈر آئے ہیں۔ سامان دیکھ کر جلدی چڑھا دو اچھا، ہاں، پہلے ایک چٹھی میڈیکل کالج کو تو لکھ دو کہ وہاں 'ایکسرے' کرانے میں کیا دینا ہوتا ہے۔ ہمارا شنکر مہینے میں دو تین بار بیمار پڑ جاتا ہے۔ ڈاکٹر دتسو کہتے ہیں کہ "ایکسرے" سے تشخیص کرائی ہوگی، تب ہی ٹھیک ٹھیک علاج ہوگا"

شیوچرن کچھ کہنے کو ہی تھا کہ انسویا پھر بولے ـــــ " پہلے فون کر دیجئے۔ رائے صاحب کو کہ کل شام سے شنکر کی طبیعت خراب ہو گئی ہے، اسی لئے آج ہم ان کی پارٹی میں نہیں آئیں گے۔"

فون کرنے کے بعد کچھ وقت پاکر شیوچرن کہنے لگا ـــــ " سرکار، میری تنخواہ اور میرا ....."

" کیوں شام کو تو رے جاؤ گے" ـــــ انسویا نے بات کاٹ کر کہا

" میں جانتا ہوں، لڑکا بہت بیمار ہے" شیوچرن نے بڑی لجاجت سے کہا۔

" شیوچرن، نوکری کرتے کرتے" ـــــ انسویا کہنے لگے " تمھیں چار سال ہو گئے ہیں، پھر بھی تم مالک کا بھلا برا نہیں جانتے! گھر میں شنکر کی طبیعت خراب ہے۔ اس نے کل رات بالکل کھانا نہیں کھایا۔ اس کی ماں کو بھی اسی کی فکر میں رات بھر نیند نہیں آئی۔ گھر پر ہر وقت ایک آدمی کی ضرورت رہتی ہے، نوکر کیا کیا کرے گا؟"

اسی وقت ڈاکٹر صاحب آ گئے، نہیں تو انسویا نہیں معلوم کیا کیا کہہ دیتے۔ ڈاکٹر نے کہا ـــــ

" کہئے، اب اس کی طبیعت کیسی ہے؟"

وہ دونوں اندر چلے گئے، پیچھے پیچھے شیوچرن بھی۔ ڈاکٹر نے شنکر کا آلہ سے معائنہ کیا۔

" دوا پی تھی؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

شنکر کچھ نہ بولا، صرف سر ہلا دیا۔

انسویا کہنے لگے ـــــ " ڈاکٹر صاحب، اس کے لئے کیا کروں، دوا پیتا ہی نہیں، سمجھانے پر بھی نہ مانا۔ دوا کی شیشی بھی اس نے غصہ میں آ کر توڑ دی۔

" دوا نہ پیو گے تو اچھے کیسے ہو گے؟ دوا تو ضرور پینی پڑے گی" ڈاکٹر نے کہا " دیکھئے بخار کتنا ہے" شنکر بیٹھے بیٹھے چھرا کر کھڑا ہو گیا۔

" لو یہ تھرما میٹر منہ میں رکھو" ـــــ انسویا نے کہا۔

" ہوں۔ ہوں" شنکر نے اسی طرح سر ہلاتے ہوئے کہا۔

" کیسے نہیں، رکھنا پڑیگا" ـــــ ڈاکٹر نے کچھ خفگی سے کہا۔

لیکن شنکر پھر بھی پیٹھ پھیرے کھڑا رہا۔ انسویا اسے سمجھانے لگے ۔۔۔ "لو بیٹا۔ لو۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا مانو۔ لو"

ڈاکٹر کو غصہ آرہا تھا۔ جھٹ آگے بڑھ کر انہوں نے شنکر کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا ۔۔۔ "منہ کھولو اور رکھو اسے زبان کے نیچے"

انسویا کہنے ہی کو تھے کہ اس کی زبان کے نیچے نہیں، بغل میں رکھئے، لیکن ڈاکٹر کے غصہ کو دیکھ کر کچھ نہ بولے روتے روتے شنکر نے منہ کھولا۔ ڈاکٹر تھرمامیٹر رکھ کر کھڑے دیکھنے لگے۔ ایک منٹ، بس ہو گیا لاؤ، کہہ کر ڈاکٹر نے تھرمامیٹر کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ روتے روتے شنکر نے منہ سے تھرمامیٹر نکالا اور زمین پر پٹک دیا۔ وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

"انسویا، تم نے لڑکوں کو بہت منہ لگایا ہے" کہتے ہوئے ڈاکٹر باہر آگئے۔

"کیا کروں ڈاکٹر صاحب، لڑکے ہی ایسے ہیں"

انسویا نے کہا ۔۔۔ "دوا لکھ دیجئے، اب ضرور پلاؤنگا"

دوا لکھ کر ڈاکٹر تو چل دیئے اور پھر شیو چرن نے گڑگڑاتے ہوئے کہا ۔۔۔ "حضور، میں جانتا ہوں، روپیہ . . . ."

"دیکھتے نہیں، میں کتنا پریشان ہوں" انسویا کہنے لگے ۔۔۔ "ایک تو لڑکا ایسا ہے، پھر تم بک بک جھک جھک لگائے رہتے ہو۔ میرے کان نہ کھاؤ۔ جانا ہے تو چل دو، کون منع کرتا ہے۔

(۳)

پیروں کی آہٹ سن کر وملا دروازے پر آئی۔ رمیش کو بخار چڑھ آیا تھا۔ وہ کواڑ کھولتے ہوئے کہنے لگی ۔۔۔ "اتنی دیر میں آئے، گھنٹوں بیت گئے۔ رمیش ماں دوا لاؤ، ماں دوا لاؤ، کہہ رہا ہے۔ اتنی دیر کیوں کی؟" اس نے کواڑ کھولا، لیکن یہ کون؟

مالک مکان کا آدمی کہہ رہا تھا ۔۔۔ "بیس تاریخ گزر گئی، اس مہینے کا کرایہ ابھی نہیں پہونچا!"

مارے شرم کے وملا گڑ سی گئی۔ منہ پھیر کر اس نے کہا ۔۔۔ "وہ روپیہ لانے گئے ہیں،

کل تک دیدیں گے"

وہ سوچ رہی تھی ـــــ "ابھی تک نہیں آئے، انہیں فکر ہی نہیں، اب وہی پانچ بجے آئیں گے، تو بچہ زندہ بھی نہ ملے گا۔ میں ہی کہیں جاکر ایک تھرمامیٹر لے آتی، لیکن یہ بھی نہیں ہوسکتا۔ گھر پر بچے کو اکیلا کیسے چھوڑ جاؤں؟"

ادھر شیوچرن دوکان کا کام چھوڑ کر لوٹ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا ـــــ "وملا میری پریشانیوں کو سمجھتی ہی نہیں۔ اب تھرمامیٹر کہاں سے لاؤں؟ اچھا ڈاکٹر وسو کی دوکان پر جاتا ہوں آدمی تو بڑے اچھے ہیں۔ کہونگا، میرا لڑکا بہت بیمار ہے، ایک تھرمامیٹر دے دیجئے، قیمت پھر دے دوں گا۔ شائد دے دیں۔"

وہ ڈاکٹر وسو کے دواخانہ کی طرف چل دیا۔ کچھ دور سے اُس نے دیکھا کہ دواخانے میں ڈاکٹر وسو ایک بیمار سے باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے قریب آنے تک ڈاکٹر اس بیمار کو لے کر قریب کے کمرے میں چلے گئے۔ شیوچرن دواخانے میں آکر بنچ پر بیٹھ گیا۔ میز پر بوتلیں کھڑی تھیں۔ اور شائد اسی بیمار کا ٹمپریچر لے کر تھرمامیٹر بھی وہیں پر رکھ دیا گیا تھا۔

وہ سوچنے لگا، "اب کس طرح ان سے تھرمامیٹر مانگوں؟ وہ تو مجھے جانتے بھی نہیں۔ پھر ان کے پاس تو ہر وقت تھرمامیٹر بیماروں کے لئے چاہئے۔ وہ مجھے نہ دیں گے۔ فضول یہاں چلا آیا۔ لیکن بغیر تھرمامیٹر کے گھر بھی کیسے لوٹ جاؤں؟"

وہ بیٹھ گیا لیکن پھر اسے ایک خیال آیا۔ میز پر تھرمامیٹر رکھا تھا۔ اس کے اور تھرمامیٹر کے درمیان دو ہی گز کا تو فاصلہ تھا۔ لپک کر اس نے اسے اٹھالیا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا، ہاتھ کانپنے لگے جلدی سے تھرمامیٹر جیب میں رکھ کر وہ دواخانہ کی سیڑھیوں سے نیچے اُتر آیا۔

اس کے سارے جسم میں کپکپی تھی۔ اس نے لوٹ کر پیچھے دیکھا بھی نہیں کہ کوئی اس کی طرف دیکھ بھی رہا ہے یا نہیں۔ کچھ دور آگے بڑھ کر وہ اپنے گھر کی طرف دوڑنے لگا۔ اسے بالکل یہ خیال بھی نہ رہا کہ میرے دوڑنے پر کسی کو شبہ ہوگا۔ وہ دوڑتا ہی گیا اور اپنے مکان کے دروازے پر پہنچ کر رکا۔

اس چوری کے بعد آج اسے اپنے گھر میں جانے کی بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ معاً

اسے خیال آیا بچے کے لئے یہ گناہ کیا ہے، کیا اس طرح گناہ کرنے سے میرا بچہ اچھا ہو جائے گا؟ لوٹ کر تھرمامیٹر وہیں پر رکھ دوں۔ خدا کی جو مرضی ہو گی وہی ہو گا۔ لوٹ جاؤں ..... '

اسی وقت ڈاکٹر نے کواڑ کھولا، کہا — "لے آئے تھرمامیٹر لائیے، اسے بہت بخار ہے۔ میرا خیال تھا کہ اب آپ شام ہی کو آئیں گے، اس لئے میں ہی کہیں جا کر تھرمامیٹر لانا چاہتی تھی۔ لائیے۔"

شیوچرن سر سے پیروں تک کانپ رہا تھا۔ اس کے جسم سے پسینہ رواں تھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وہیں دروازے کی چوکھٹ پر اس نے جیب سے تھرمامیٹر نکالا۔ اب بھی اس کا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا — اس گناہ کی وجہ سے میرا لڑکا کبھی اچھا نہ ہو گا! لیکن اب بھی تھرمامیٹر میں واپس کر سکتا ہوں۔ ڈاکٹر سے تمام واقعہ بیان کر دوں گا۔ اس وقت ٹمپریچر لے لیں،

اس نے تھرمامیٹر کھولا اور ڈاکٹر کے ہاتھ میں دینا چاہا! لیکن درمیان ہی میں اس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے وہ گر پڑا اور ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

(ترجمہ)

محمد علی نیر بی۔ اے (عثمانیہ)

زندگی

زندگی انسان کی مانا کہ ہے ناپائیدار
ہے مگر وسعت میں یہ اک بحرِ ناپیدا کنار

زندگی ہرگز نہیں بے دست و پا جینے کا نام
دل کی آنکھوں ہی سے آتا ہے نظر اس کا مقام

زندگی اِک محشرِ علم و عمل کا نام ہے
عزم راسخ زندگی کا اوّلیں پیغام ہے

زندگی کی زحمتوں پر اختیار آساں نہیں
کچھ سیاہی میں بھی تاروں کا شمار آساں نہیں

دردِ پیہم سے عیاں ہوتا ہے رازِ زندگی
اور عمل کی چھیڑ سے بجتا ہے سازِ زندگی

منزلِ ہستی نہیں شرمندۂ پائے رواں
ہر قدم پر اک نئی منزل کا ملتا ہے نشان

سوز و سازِ زندگی کو جاننا آساں نہیں
زندگی کی وسعتیں پہچاننا آساں نہیں

دردِ دل بن کر رواں ہے کاروانِ زندگی
صورتِ سیماب ہے بے چین جانِ زندگی

موت کیا ہے زندگی سے تھک کے ستانیکا نام
جستجوئے منزلِ مقصد سے رُک جانیکا نام

جستجوئے زندگی ہے امتحانِ زندگی
زندگی مٹتی ہے رہتا ہے نشانِ زندگی

گر نہ ہو عزم و عمل تو زندگی بے جان ہے
آدمی بے چینیوں کی گود میں انسان ہے

حرکتِ پیہم سے بزمی جاوداں ہے زندگی
عزم زندہ ہے تو سمجھو کامراں ہے زندگی

احمد معین الدین بزمی بی۔اے (عثمانیہ)

اسلام نے عورتوں کو وہ کیا حقوق عطا فرمائے جو اس سے پہلے کبھی حاصل نہ تھے

(کمیٹی جشنِ میلاد النبی جامعہ عثمانیہ نے طبقہ نسوان میں اس
مضمون کو انعام اوّل کا مستحق قرار دیا تھا)

دنیا کے بڑے بڑے حکماء اور فلاسفہ اس امر پر متفق ہیں کہ "مذہب" کا مقصد صرف انسان کو چند رسوم سکھانا نہیں ہے بلکہ مہذب اور متمدن بنانا' اور ایسے اصول کی تلقین کرنا ہے جن پر عمل کرنے سے وہ شائستگی کے اعلیٰ منازل و مقامات طے کر سکے۔ وہی مذہب سب سے اعلیٰ و ارفع سمجھا جا سکتا ہے جو ان شرائط کو بدرجہ اتم پورا کرے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شائستگی اور تمدن کے تمام اعلیٰ بنیادی اصول اسلام نے پیش کئے اور وہ حقائق معارف جو مہذب یورپ نے سینکڑوں برس کے بعد دریافت کئے درا صل قرآنی انوار کی وہی شعاعیں ہیں جو اب سے تیرہ سو برس پہلے ریگستانِ عرب پر چمک چکی تھیں۔ یورپ کی اس تمام ترقی کے باوجود جسے دیکھ کر آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ ایک انگریزی زبان کا قابل فخر شاعر "بائرن" عورت کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "عورت قدرت کا ایک نہایت خوبصورت عیب ہے" حقیقت میں یہ اس عہد کے تخیلات کا عکس ہے جب مرد اپنے غلبہ سے عورت کو محکوم و مظلوم بنائے ہوئے تھے اور عورتوں کو ان کی معین کردہ بندشوں کو توڑنے کا احساس بھی نہ ہو سکتا تھا اور ان کی حالت اس پست حال قوم کے فرد کی سی تھی جس کے احساساتِ خودداری کو صدیوں کی مظلومیت نے فنا کر دیا ہو (اور جو پستی کو بلندی سے بدلنے کا خواب میں تک خیال

نہ کر سکتا ہو)

تاریخ عالم اس کی شہادت دیتی ہے کہ اسلام سے پہلے جتنی معاشرتیں اور تمدن کے اصول بنائے گئے وہ سب کے سب مردوں کے بنائے ہوئے تھے اسی لئے انھوں نے عورتوں کے رتبے کو گھٹانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ رومی تمدن میں " ورجل " کے قول کے مطابق عورت کو متلون مزاج اور بدفطرت سمجھا جاتا تھا اور یونانی تہذیب میں اس کے انتہائی عروج کے زمانے میں بھی عورت کو قابل اعتماد نہ سمجھا جاتا تھا ایک جگہ سقراط کہتا ہے کہ " عورت کو ایک دفعہ مرد کے برابر تسلیم کر لو، پھر دیکھو یہ کس طرح تمھارے سر چڑھتی ہے۔ " " کنفوشس چین کی نمایندگی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ " عورت کا جو قدم آگے بڑھ جائے اسے واپس لے آنا شاید قدرت کے بس میں بھی نہیں ہوتا " اور بدھ مت نے تو صاف صاف عورت کو ایک گھناؤنی چیز بتا کر اس سے الگ رہنے کی تلقین کی۔ یہودیوں میں عورت صرف معمولی ملکیت سمجھی جاتی تھی جو املاک کی طرح ورثا میں تقسیم ہوا کرتی تھی۔

دوسری اور تفصیلات میں گئے بغیر ہم ایک مکالمہ کے ذریعہ آنحضرت صلعم کے دور کی اجمالی حالت بتانا چاہتے ہیں۔ جسے موسیو کوسان دی پرسوان نے نقل کیا ہے یہ مکالمہ آنحضرت صلعم اور قیس شیخ بنی تمیم کے پاس ہوا تھا۔ آنحضرتؐ ایک لڑکی کو زانو پر بٹھائے اس کو بہلا رہے تھے۔ قیس نے پوچھا " یہ کس جانور کا بچہ ہے " حضور انورؐ نے جواب دیا " میرا بچہ ہے "

قیس نے کہا باللہ العظیم میری بہت سی ایسی لڑکیاں ہوئیں لیکن میں نے ان سبھوں کو زندہ دفن کر دیا اور کسی کو بھی نہ بہلایا "

آنحضرتؐ نے فرمایا " اے بدبخت! معلوم ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے تیرے دل میں کسی قسم کی محبت انسانی پیدا ہی نہیں کی، تو ایک نعمت عظمیٰ سے جو انسان کو دی گئی ہے محروم ہے "

اور مقامات کو تو چھوڑئے ہمارے اپنے ملک ہندوستان میں بھی اس کی حالت انتہائی زبوں تھی۔ کسی کتاب میں عورتوں کے ساتھ ایسی سختی کا برتاؤ نہیں کیا گیا تھا ہندوؤں کی کتابوں میں

کہا گیا ہے۔ یہ مذہبی کتابیں عورت کو شبہ کی نظر سے دیکھنے کی تاکید کرتے ہیں اور ان کے بزرگوں کا قول ہے کہ "زہریلے سانپ' طوفان' مست ہاتھی' شکار کی تلاش میں پھرتے ہوئے شیر' موت کے فرشتہ اور چور' ڈاکو اور قاتل پر تو بھروسہ کیا جاتا ہے' لیکن جو شخص عورت پر بھروسہ کرے گا یقیناً خسارہ میں رہے گا۔ ڈاکٹر گستاؤلی بان نے ہندو قدیم نظریہ نقل کیا ہے کہ عورت ایک دلپسند مخلوق ہے لیکن ادنیٰ طبقہ کی۔ منو جیسے سنجیدہ مقنن نے اپنی سمرتی میں عورت کو عقل و شعور کی تمام خوبیوں سے خالی بتا کر اس کا درجہ شودر سے بھی کمتر رکھا۔ اس کے مذہبی اعمال اور ساری نیکیوں کو مرد سے وابستہ کر دیں اور عورت کو کسی عبادت میں حصہ لینے کا تک حق نہ دے کر اس کی عبادت کو فقط اپنے شوہر کی خدمت کرنے تک محدود کر دیا گیا۔ اس کی نیکی کا سب سے بڑا درجہ صرف یہی قرار دیا کہ وہ اپنے شوہر کے پاؤں دھو کر پیئے۔ چنانچہ آج بھی بعض قوموں میں شادی کے وقت یہ رسم ادا کی جاتی ہے اور ہندو عورت اپنے شوہر کا چھوڑا ہوا کھانا اپنے لیئے برکت کا موجب سمجھتی ہے یہی وجہ ہے کہ آج بھی جب تک مرد کھانا نہ لے وہ بھوکی پڑی سوکھتی ہے۔

منو نے عورت کو ورثہ کا کوئی حق نہ دیا جو کچھ حق وہ رکھتی ہے وہ اس کی زندگی ہی کی حد تک ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ مال کو بیع یا رہن کرنے کا کوئی حق نہیں۔ صرف تین قسم کی جائیدادوں میں اسے ملکیت کا حق حاصل ہوتا ہے۔ صرف منقولہ جائیداد جو اسے جہیز میں ملے دوسری وہ جو اس کے عزیزوں سے تحفہ کے طور پر ملی ہو اور آخری قسم کی وہ جائیداد ہے جو اس عورت نے شادی سے پہلے از خود پیدا کی ہو۔

رومی تمدن جس کے آج تک بڑے بڑے راگ الاپے جاتے ہیں عورت کو متلون مزاج اور بد فطرت سمجھتا ہے' رومی قانون کے ماتحت جس لڑکی کی شادی دوسرے خاندان میں ہو وہ اس کی مطیع و منقاد سمجھی جاتی تھی اور قانوناً اپنے باپ کے خاندان سے الگ ہو جاتی تھی اور ان شادیوں کی رو سے جو مملکت میں عام طور پر رائج تھیں اور جنھیں سادہ طور پر اظہار کیا جاتا تھا کہ فریقین میاں بیوی کی حیثیت سے ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔ رومی قانون کے تحت تمام سال بیوی پر

قابض رہنے سے خاوند کو اس پر مالکانہ اختیارات حاصل ہو جاتے تھے لیکن اگر عورت اس قید سے آزاد رہنا چاہے اور سال میں صرف ایک دن الگ رہنے کی "مقررہ شرط" پوری کرکے اپنی آزادی کو برقرار رکھے تو اسے کوئی حق نہ تھا کہ وہ خاوند کو مجبور کرکے اس سے گذارہ لے اور نہ اسے خاوند کی جائداد میں کوئی حصہ مل سکے۔

ایک رومی سپاہی کی بہت سی لونڈیاں ہوتی تھیں جنھیں وہ یا تو روم کی منڈیوں سے خریدتا تھا یا وہ جنگ کا مال غنیمت ہوا کرتی تھیں۔ ان سے جو بچے پیدا ہوتے انھیں رومی شہری کا باقاعدہ نام نہ دیا جاتا۔ جب تک ان کا باپ اس کی ماں سے شادی نہ کرلے۔ رومیوں کے تمدن کی بد اخلاقی اور کیا ہوگی کہ ان کے مکانات حیا سوز تصاویر سے پُر ہوتے تھے۔

عورت نہ بغیر سرپرست کے رہ سکتی تھی۔ نہ وہ کسی کی ضامن یا اتالیق بن سکتی تھی اور نہ ہی اسے کوئی سیول یا پبلک عہدہ مل سکتا تھا۔ شوہر کو بیوی کے قتل کردینا کا اختیار تھا اور شادی کے وقت بیوی کی ساری جائداد شوہر کی ملکیت میں چلی جاتی تھی اور عیسائی ممالک میں باوجود جسٹینین کے امتناعی حکم کے کثیر الازدواجی کا رواج تھا جو اس وقت عالمگیر تھی۔ عورت کی یہ حالت مورخین اس مملکت میں بتاتے ہیں جس کو نہایت عظیم الشان اور مہذب حکومت کہا جاتا ہے اور یورپ کو ایسے بہت سے قوانین اخذ کرنے کا فخر حاصل ہے۔

دور کیوں جائیے تمدن کے سب سے بڑے علمبردار انگلستان فرانس اور جرمنی کی گذشتہ تاریخ کا مطالعہ کیجئے۔ تاریخ ان گندگیوں سے بھری پڑی ہے۔ میں صرف انگلستان کے مایۂ ناز شاعر کے خیال ہی کا ذکر کرنے پر اکتفا کرتی ہوں۔ شکسپیر کہتا ہے کہ

"عورت، ایک نازک ترین شیطان، جسے کوئی آج تک نہ سمجھ سکا"

اسلام سے پہلے کا تو ذکر ہی کیا آج بھی مغرب کی تمام ترقیوں کے باوجود شادی کے بعد عورت اپنے تمام حقوق ملکیت سے محروم ہے اور اپنا خاندانی نام تک باقی نہیں رکھ سکتی بلکہ شوہر ہی کے نام سے پکاری جاتی ہے۔

خود عرب میں جہاں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے ظہور اسلام سے قبل عورت کی جو حالت تھی وہ سورۂ نحل میں بیان کی گئی ہے "جب کبھی کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی تو اس کا چہرہ غم و غصہ سے کالا پڑ جاتا تھا۔ وہ اس خبر کو شرم کے مارے اپنے قوم سے چھپانے کی کوشش کرتا تھا اور وہ سوچتا تھا کہ اس ذلت کو برداشت کرنے یا اس لڑکی کو زندہ زمین میں دفن کردیں" یہ حقیقت ہے کہ اکثر لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیا جاتا تھا بعض اوقات نکاح کے وقت بیوی سے معاہدہ کرلیا جاتا کہ اگر لڑکی پیدا ہو تو اسے مار ڈالا جائے گا۔ لونڈیوں کو ناچنا، گانا سکھا بازار میں بٹھایا جاتا اور ان سے جو آمدنی ہوتی وہ مالک کا حق شمار ہوتا تھا۔ ایک عورت کے ایک سے زیادہ شوہر ہونے کا رواج جو نہایت ادنیٰ اقوام میں پایا جاتا ہے عرب میں بھی موجود تھا نیز ایک مرد جس قدر چاہے عورتوں سے شادی کرسکتا تھا۔ عورت محض ایک جائداد سمجھی جاتی تھی۔ اس کا اپنے متوفی خاوند یا دوسروں کی وراثت میں حصہ تسلیم نہ کیا جاتا تھا بلکہ وہ خود ورثہ کا ایک حصہ قرار پاتی اور ورثے میں چلی جاتی تھی یہاں تک کہ باپ کی عورتوں کو بیٹا اپنی وراثت سمجھتا اور اس سے شادی کرنے میں بھی کوئی پس و پیش نہ کرتا تھا غرض عورتوں کے ساتھ بہائم کا سا سلوک ہوا کرتا تھا، عربوں کی لڑکیوں سے یہودی لڑکیوں کی حالت بہتر تھی یعنی لڑکی کا باپ اپنی بیٹی کو لونڈی کے طور پر فروخت کرسکتا تھا اور اس کے مرنے کے بعد وہ اپنے بھائیوں کے تابع ہوتی تھی اور خوبصورت ہونیکی صورت میں وہ یہودیوں کی نظروں میں ایک بیش بہا مقبوضہ سمجھی جاتی تھی۔

ان حالات میں اب سے ساڑھے تیرہ سو سال قبل سرزمین حجاز سے ایک صدا بلند ہوتی ہے کہ — اے لوگو! تمھارے حقوق عورتوں پر اور عورتوں کے حقوق تم پر واجب ہیں تم پر لازم ہے کہ اپنے رشتہ مناکحت کا انتہائی احترام کرو اور کوئی ناپاک حرکت اپنے سے سرزد نہ ہونے دو اگر ان سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو انھیں سزا دو مگر شدید نہیں اور اگر تمھاری عورتیں گناہوں سے توبہ کریں تو ان کی رفاقت اختیار کرو اور ان کے نان اور نفقہ کا معقول انتظام کرو۔ کیونکہ خداوند تعالیٰ کی طرف سے یہ امانت تمھارے سپرد کی گئی ہے"۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی

قانون عورت کو مرد کے ساتھ سماج میں ایک اعلیٰ درجہ عطا کرتا ہے۔ عورت ایک منقولہ جائداد باقی نہیں رہتی جسے خرید ایا بیچا جا سکے بلکہ وہ گھر کی حکمراں بنا دی جاتی ہے اور حقوق و فرائض میں برابر کی حصہ دار۔

بیوی اور لونڈی کی اولاد میں کوئی تمیز باقی نہیں رہتی اور بہشت کے راستے عورت و مرد دونوں کے لئے یکساں کھل جاتے ہیں۔ ازدواجی رشتہ میں اسلام نے عورت کو مرد کے مساوی درجہ پر لاکھڑا کیا اور ظلم اور ناانصافی سے اس کی حفاظت کر کے بعض حالات میں خلع و طلاق حاصل کرنے کے صریح احکام صادر فرمائے۔ رسم نکاح جو آج بھی تمام اقوام عالم میں محض ایک رسم کی حیثیت رکھتا ہے سب سے اوّل اسلام ہی نے اسے ایک معاہدہ کی شکل دی اور معاہدہ کی تمام شرائط لازم کرائیں چونکہ معاہدہ برابر والوں ہی میں ہوا کرتا ہے اس لئے نکاح کی اسلامی حیثیت بھی مرد اور عورت میں مساوات کی بیّن دلیل ہے اور شوہر و بیوی کے انتخاب میں بھی فریقین کے حقوق و اختیارات مساوی ہیں۔ نکاح کے بعد تفریق کے بارے میں بھی مرد و عورت دونوں کا پلہ برابر ہے اسلام نے محض اختلاف مزاج کے عذر کو تفریق کے لئے جائز تسلیم کر لیا ہے اور عورت و مرد دونوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ جب آپس کی مخالفت ناقابل برداشت حد تک پہنچ جائے تو وہ علیحدگی اختیار کر سکتے ہیں۔ جن وجوہ کی بنا پر طلاق ہو سکتی ہے ان میں بھی دونوں کا برابر حق ہے ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت ثابت ابن قیس کی بیوی جمیلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور کہا کہ میں اپنے شوہر سے جدائی چاہتی ہوں آپ نے وجہ دریافت فرمائی تو عرض کیا کہ آپسمیں بنتی نہیں اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا حیل و حجت تفریق کی کارروائی کرا دی ساتھ ہی ساتھ اپنے شوہر کے متعلق بی بی جمیلہ کے یہ الفاظ موجود ہیں کہ "میں نہ اس کے اخلاق پر عیب لگاتی ہوں نہ اس کے دین پر"۔

اصلاح کے قابل مخالفت کو رفع کرنے کے لئے جو پنچائت مقرر کرنے کا حکم قرآن مجید میں دیا گیا ہے۔ اس میں ایک پنچ مرد کی جانب سے اور ایک عورت کی جانب سے لکھا گیا

تاکہ دونوں کی مساوی حیثیت میں کوئی امتیاز نہ رہے۔ اسلام نے عقد بیوگان اور تعداد ازدواج کے مسائل کو حل کر کے ہر قسم کی اخلاقی خرابیوں کی جڑیں کاٹ دیں اور تعداد ازدواج کے سلسلہ میں عدل کی شرط لگا کر عورتوں کے حقوق کی بھی ہر طرح حفاظت کر دی اور جنگ وغیرہ کے نتائج کی سماجی ضرورت کو بھی پورا کر دیا۔

نیک اعمال کی جزا میں عورت و مرد کو ایک دوسرے پر فضیلت نہیں دی گئی اور نہ کسی جگہ ایک کے مقابلہ میں دوسرے کو نظر انداز کیا گیا۔ صاف الفاظ میں اس عقیدہ کی مخالفت کی گئی کہ دین میں مرد ہی درجات عالیہ حاصل کر سکتے ہیں۔ عورتیں اس سے محروم رکھی گئی ہیں اسی طرح بدچلنی کی سزا میں بھی مرد اور عورت کو یکساں رکھا کہ حقوق کے ساتھ ذمہ داری بھی مساوی ہو۔ عورت پر جھوٹی تہمت لگانے والوں کے لئے نہایت عبرت انگیز سزائیں مقرر کی گئیں یعنی مجمع عام میں اسّی درّے لگائے جائیں اور پھر کبھی ایسے شخص کی شہادت قبول نہ کی جائے۔

متعدد آیات قرآنی اور احادیث نبوی میں عورت کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مشہور خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا کہ " اے مردو! تم عورتوں کے بارے میں خدا سے ڈرتے رہو اور بہت احتیاط کرو اس لئے کہ وہ خدا کی امانتیں ہیں " اس کے بعد جہاں جہاں عورتوں کے حقوق کا ذکر کیا وہاں ان حدود کی بھی تاکید کی اور تغیر و تبدل کرنے والوں کو عذاب الٰہی سے ڈرایا۔

اسلام نے مرد کی طرح جائداد کا وارث بننے کے لئے عورت کی راہ میں جتنی رکاوٹیں حائل تھیں ان سب کو دور کر دیا اور بیواؤں کو حق وراثت سے محروم نہیں کیا دیگر زنانہ رشتہ دار مثلاً ماں بہن، بیٹی، بیوی اپنے حقوق کے مطابق برابر ورثہ کی حقدار ہوتی ہے۔ عورت کو اپنی ماں کی طرف سے، اپنے باپ کی طرف سے، اور اپنے شوہر کی طرف سے ترکہ کا مستقل حق ملکیت دیا گیا ہے اور اس ملکیت پر کسی قسم کے قیود عائد نہیں کئے گئے۔ اسلام نے جائداد سے متعلقہ امور میں عورت کو اتنے ہی حقوق دے رکھے ہیں جتنے مرد کو۔ وراثت کے علاوہ

عورتوں کو شرعاً اپنے لئے جائداد خریدنے یا ہبہ میں حاصل کرنے اور رکھنے کا حق حاصل ہے اور وہ اپنے معاملات کے متعلق خود جواب دہ ہیں اسی طرح وراثت اور زر کہ میں جس طرح لڑکے کا حق مقرر کیا گیا ہے اسی طرح لڑکی کا بھی۔ باپ کی جائداد میں بیٹی کا حصہ جو کم رکھا اس کی تلافی مہر، نفقہ اور شوہر کی جائداد سے حصہ دلا کر کر دی۔

عورت کی حیثیت کو قرآنی تعلیمات کی روشنی میں دیکھا جائے تو پیدائش سے لیکر موت تک زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس میں اسے مرد سے کم درجہ کی حیثیت دی گئی ہو بجز اس کے کہ فرائض فطری کا اختلاف ہو اگر قدرت کو یہ منظور ہوتا کہ مرد اور عورت میں قوائے فطری کی حد تک کوئی فرق نہ ہو تو دو علحدہ جنسیں پیدا کرنے کی ضرورت نہ ہوتی اور اکثر درختوں وغیرہ کی طرح ایک ہی جنس سے توالد و تناسل کا سلسلہ جاری ہو جاتا۔ اسلامی تعلیمات کے یہ ایسے ایسے انمول نمونے ہیں جو فطرت کے بالکل مطابق ہیں۔ ان وظائف فطری کے اختلاف اور ان کے اثرات سے قطع نظر اسلام نے تمام دیگر مذاہب کے برخلاف عورت کی ایک مستقل اور قایم بالذات قانونی شخصیت تسلیم کی جسے حقوق اور فرائض دونوں حاصل ہیں اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر دنیا کو چونکا دیا کہ "جنت ماں کے قدموں کے تلے ہے۔ مسلمانوں کو چاہیئے کہ عورتوں کے متعلق بدگوئی نہ کریں۔ خدا کی نظر میں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔" اور مردوں کی طرح عورت سے بھی یہی کہا کہ قدرت کی پیدا کردہ ہر نعمت سے فائدہ اٹھاؤ لیکن ان نعمتوں کو وسیلہ سمجھو، مقصود نہیں — وسیلہ اس امر کا کہ اپنے خالق کے مقابلے میں اپنے فرائض انجام دو اور اس کے احکام سے جو سراسر ہمارے ہی فائدے کے لیئے ہیں، سرتابی نہ کرو۔ یہ احکام ہمیں قرآن مجید اور حدیث شریف میں مدون ملتے ہیں اور اب دیگر اقوام بھی رفتہ رفتہ اور خواہی نخواہی انھیں کو اختیار کرنے پر مجبور ہوتی جا رہی ہیں

ش۔ بانو (سال اول)
کلیہ اناث جامعہ عثمانیہ

نطقِ محبت

جنوں انگیز ہے بادِ بہاری　　نہ ہوگی دردِ دل کی بیقراری
ابھی آنکھوں میں پھرتی ہیں وہ راتیں　　جوانی کی وہ اگلی وارداتیں
روش، صحنِ چمن، کھیتوں کی سیریں　　محبت کی طرب انگیز لہریں
اُمنگوں کا وہ سیلابِ طلاطم　　اشاروں کا اُمید افزا تکلم
حجاباتِ دوئی کی پردہ داری　　فسانہ بن گئی تھی اشکباری
سمن زاروں کے نرم و سرد جھونکے　　فریبِ حُسن کے دو چار دھوکے
خراباتِ تفکر والہانہ　　کشیدہ خاطری کا اک بہانہ
ملاقاتوں کا وہ اظہار پرجوش　　نگاہوں میں ابھی تک ہے وہ آغوش
خودی نا آشنا، معصوم باتیں　　حجابِ دلبری موہوم گھاتیں
شرابِ عشق سے سرشار و مخمور　　نشہ میں اپنے ہی جذبات کے چور
خودی اور بے خودی کی پاسداری　　رموزِ عشق کا الہام طاری
محبت اور وہ بھی پاک و معصوم　　جدائی کا تخیل حرفِ موہوم
یہی اسرار ہیں سوزِ دروں کے　　یہی معیار ہیں جذب و فسوں کے

یہ افسانہ محبت کی زبان ہے
اسی تخئیل سے دل بھی جواں ہے

عظیم (عثمانیہ)

"بھوت!۔۔۔"

میں نہ تو بھوت ہوں ۔ اور نہ آج تک میں نے کسی چڑیل کو دیکھا ہے ۔ لیکن چند دن پہلے ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ مجھے اپنے آپ پر بھوت کا شبہ ہونے لگا اور ۔۔۔ ایک چڑیل مجھے نظر آئی ۔

کوئی دوست آپ کا علی پور میں ہو ۔ اور وہ خط لکھ لکھ کر آپ کو بلا بھیجے ۔ شکار اور سیر و تفریح کے سبز باغ دکھائے ۔ اور آپ چھٹیاں گزارنے کے سارے منصوبوں کو بالائے طاق رکھ کر، علی پور جانے والی بس کے انتظار میں ٹہلتے رہیں، اور مسافروں کے ریلے میں دبتے دباتے علی پور پہنچ جائیں، تو وہاں کسی راہ چلتے کو " اے مہاراج " یا " آئیے جناب " کہہ کر " ہالٹ " کرائیے، اور چہرہ پر مسکینی طاری کرتے ہوئے پوچھئے کہ یہاں پٹواری کا پرانا مکان کہاں ہے ؟ آپ یقین کیجئے، پٹواری اور پرانے مکان کا نام سن کر علی پور کا ہر باشندہ حواس باختہ ہو جاتا ہے ۔ اگر آپ جوان ہیں تو آپ کی جوانی پر ترس کھایا جائیگا اگر آپ ادھیڑ ہیں تو آپ کو بیوی بچوں کا واسطہ دیا جائے گا، اور اگر آپ بوڑھے ہیں تو آپ کو "تھوڑی سی بچی ہے اسے بھی گزار دے" کی تلقیں کی جائیگی ۔۔ اور اس گھر کا بھول کر بھی رخ نہ کرنے کا مشورہ بلکہ حکم دیا جائے گا، آپ پوچھیں " مگر کیوں ؟ " تو داستانِ امیر حمزہ کا سا بکھیڑا شروع ہو جاتا ہے ۔ ایک زبان کہتی رہیگی اور دو کان سنتے رہیں گے ۔

اجی جناب ۔ آپ اس گاؤں میں نو وارد ہیں، آپ کیا جانیں، یہ پٹواری کا پرانا مکان

کیسی آفتوں کا اکھاڑا ہے ؟ وہ تو اچھا ہوا کہ آپ نے مجھ سے پوچھ لیا ۔ ورنہ اب تک آپ کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہوتے .. آپ کو اپنی جان پیاری ہے تو بیچ سڑک پر ڈیرہ ڈال لیے لیکن اس مکان کا نام نہ لیجیے ۔ کتنے ہی لوگ اُدھر گئے ۔ اور ادھر سے اُدھر ... کسی نے پھر انہیں نہیں دیکھا۔ آپ ہیبت زدہ ہو کر سوچیں گے " یہ گھر ہے یا نیلی چھتری کہ جو جاتا ہے غائب ... اجی بھوتوں چڑیلوں کا اڈا ہے وہ " آپ کے سوال " مگر کیوں ؟ " کا مدلل جواب آپ کے گوش گزار ہو جاتا ہے ۔ اب آپ اپنے فیصلہ کے مختار ہوتے ہیں ۔ آپ امتحان میں ناکام ہوئے ہوں، آپ کا دل دکھا ہوا ہو یا آپ کے دوست، جن کے تقاضے سے آپ علی پور آئے ہوں ۔ وہ اپنے مکان کے دروازہ کو قفل توڑا کر کے دورہ پر نکل گئے ہوں تو آپ یقیناً پٹواری کے مکان کو ترجیح دیں گے ۔ ورنہ علی پور سے رفو چکر ہو جانے کی راہ ڈھونڈ نکالیں گے ۔

لیکن چند دن پہلے اگر آپ وہاں جا نکلتے تو ہر بھلا مانس، آپ کو پٹواری کے پرانے مکان کا پتہ دیتا، بلکہ ساتھ چل کر آپ کو چھوڑ آتا اور آنجہانی پٹواری کی خوبیوں اور تقدس کی سینکڑوں روایتیں آپ کو سناتا ۔ مکان کے " ٹھنڈے سیلے " ہونے کی ضمانت بھرتا ۔" شادی میزبانی جس گھر میں ہوئی ہو، بچے جس گھر میں پیدا ہوتے ہوں ۔ جہاں چراغ جلتا ہو ۔ وہاں انسانوں کے سوا اور کس کا گزر ہو سکتا ہے ؟ اندھیرے میں سو جائیے ۔ کوئی خواب نہیں : کوئی خیال نہیں ۔" اور آپ وہاں ٹھیر بھی جاتے تو آپ نہ تو بھوت بنتے اور نہ کوئی چڑیل آپ کو نظر آتی ۔ مگر وہ جو کہا جاتا ہے کہ آدمی کو بھی میسر نہیں انسان ہونا ۔ ہمارے حق میں صحیح ثابت ہوا ۔ اور ہماری ذرا سی بھول نے پھر سارے گاؤں کو وحشت کے بھنور میں جھونک دیا اور ایک نیکنام گھر کو شائد ہمیشہ کے لئے " بھوت بھون " بنا دیا ۔ مگر اس میں ہمارا بھی کچھ قصور نہیں ۔ تند و تیز ہوا چلے ۔ چھتری اُلٹ جائے اور اسکی کوئی کاڑی کسی راہگیر کے " نینن کا تیر " بن جائے تو چھتری والے کے سر کیا الزام .. ماننا پڑتا ہے کہ بعض واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا پلاٹ خود بخود بنتا اور پوری سرعت کے ساتھ نقطۂ مخرج اور اختتامی منزل تک دوڑ جاتا ہے ۔ ہیرو یا اس کے دوسرے کردار منہ تکتے ہی رہ جاتے ہیں اور

آناً فاناً میں ایک مکمل افسانہ تشکیل پاجاتا ہے' جس کا عنوان "بھوت" رکھا جاسکتا ہے۔ تو واقعہ یہ ہوا کہ چند دن پہلے میرے ایک مخلص دیرینہ نے مجھے اپنے گاؤں علی پور کو ایسے شدید تقاضوں سے بلا بھیجا کہ میں جو علی پور پہنچا ہوں تو جیسے کسی پٹھان کی ہمیانی میں سود کا پیسہ۔ سفر کی تکلیفوں کا حال نہ پوچھئے۔ غنیمت ہوا کہ یہ سفر سفر آخرت نہ ہوا۔ سفر کے سارے عذاب' بلائے غمہائے دگر سمجھ کر سہہ لئے' اور بس سے اُتر کر اپنا مختصر سا اسباب ایک مزدور کے سر پر رکھوا کر اس کے پیچھے پیچھے خوش آیند توقعات کو "لفٹ رائٹ" کراتا ہوا۔ میں اپنے دوست کے مکان کی طرف روانہ ہوگیا۔ مجھے دیکھتے ہی' میرا دوست دوڑ کر گلے سے لپٹ جائے گا۔ وفور خلوص سے آبدیدہ ہوجائے گا۔ پرانی باتیں یاد آئیں گی نئے تذکرے چھڑیں گے۔ کھانے کا وقت آئیگا تو مرغیاں.. میٹھے' اور دوسری لذیذ غذاؤں پر ہاتھ ہوگا.. شکار کو نکلیں گے۔ جنگلوں اور باغوں کی سیر ہوگی۔ وقت اس طرح گزر گیا۔ جیسے ہوائی جہاز میں فاصلہ.. ابھی دن' ابھی رات.. کہ میں مزدور سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ کیونکہ مزدور ایک مکان کے آگے رُک گیا تھا۔ اور کہہ رہا تھا کہ "جناب انسپکٹر صاحب کا مکان تو یہی ہے"۔

میں نے مکان کی طرف دیکھا تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ دروازہ پر قفل پڑا تھا اور انسپکٹر صاحب نہ جانے کہاں غائب ہوگئے تھے۔ اتنے میں پڑوس کے ایک صاحب اپنے گھر سے ایک کتے پر ڈھیلے پھینکتے ہوئے' باہر نکلے۔ میں نے آگے بڑھ کر پوچھا "جناب یہ انسپکٹر صاحب کا کچھ پتہ ہے آپ کو؟"

فوراً ہی انھوں نے جواب دیا "وہ تو دورے چلے گئے۔ آٹھ دن کے لئے"۔ آٹھ دن کے لئے۔!! ایسا سنائی دیا جیسے میرا دل بڑی دردناک لَے میں الاپ رہا ہے۔

"اب کہاں بسیرا اپنا" سر تھام کر چبوترے پر بیٹھ گیا۔ سوچا کہ قفل توڑ ڈالوں اور اندر گھس پڑوں آٹھ دن تک بغیر کچھ کھائے پیے۔ اپنے سامان پر بیٹھ رہوں اور جب وہ انسپکٹر کا بچہ آئے تو درندہ کی طرح اس پر جھپٹوں اور اس کا گلا گھونٹتے ہوئے پوچھوں کہ "اسی لئے بلایا تھا کیا مجھے'

قفل توڑ کر اندر گھسنے اور مرنے کے لئے۔ دورہ ہی جانا تھا تو مجھے یہ چکر کیوں دیا۔" مزدور نے کہا "جناب میری مزدوری دیجئے"۔ میں نے مزدوری کے پیسے اس کے ہاتھ میں رکھدیئے۔ وہ دو چار ہی قدم بڑھا ہوگا کہ میں نے پکارا "اے ذرا ٹھہر تو" وہ رُک کر، میری طرف پلٹ آیا میں نے پوچھا۔ "اب بس کب جاتی ہے یہاں سے" سوچتے ہوئے اس نے جواب دیا۔ "کل صبح میں..." — ارے .. تو پھر شام کہاں گزاری جائے؟ رات کہاں بسر کی جائے؟

بس تو کل صبح جائیگی۔ میں نے پوچھا "کوئی مسافر خانہ ہے یہاں؟" اس نے نفی میں گردن ہلادی۔ اس کی گردن کے ساتھ میرے دل کو بھی جھٹکے سے لگے .. اور اس کے بعد... جیسے وہ رک گیا "نہیں... کوئی مسافر خانہ .. نہیں۔" میں نے حسرتناک لہجہ میں کہا "پٹواری کا ایک پرانا مکان ہے" وہ کہنے لگا۔ "وہاں کبھی کبھی مسافر ٹھیر جاتے ہیں، خالی پڑا ہے وہ۔" پٹواری کے "بلیدان" کو سب سے پہلے شاید میں نے محسوس کیا جو مسافروں کے ٹھیرنے کے لئے خود سورگباش ہوا ۔ اور مکان کو مسافر خانہ بنا دیا۔ تھوڑی دیر بعد میں پٹواری کے پرانے مکان میں تھا۔ مکان بہت بڑا تھا۔ کئی کمرے تھے صحن بھی کافی وسیع تھا۔ لیکن دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے چو طرف گھاس اُگ آئی تھی اور دو چار کمروں کی چھت بھی گر پڑی تھی۔ دیواروں کا چونہ جگہ جگہ سے جھڑ چکا تھا اور ان پر مختلف ممالک کے نقشے بن گئے تھے۔ جن دیواروں کی استر کاری اچھی حالت میں تھی ان پر کوئلوں کی مصوری کے شہ کار، اور گاؤں کی خفیہ رپورٹیں درج تھیں۔ دالان اور صحن میں جلی ہوئی لکڑیاں اور راکھ اور کوئلوں کے ڈھیر جمے ہوئے تھے۔ یہ مکان سڑک سے بالکل لگا ہوا تھا۔ دالان میں کھڑے ہو جائیں تو راستہ چلنے والے لوگ، بیل گاڑیاں اور چرنے والے جانور صاف نظر آتے۔ لیکن ایک ایسی پر اسرار خاموش اور اداسی چھائی رہی تھی کہ مجھے نانی اماں کی سنائی ہوئی ساری بھوت بریت کی کہانیاں یاد آنے لگیں۔ میں نے اپنا سامان ایک صاف ستھرے کمرہ میں رکھ دیا اور کچھ دیر ٹہل کر سوچا کہ ابھی سے گوشہ نشین ہو جاؤں تو بہت ممکن ہے کہ طبیعت اس ماحول سے مانوس ہو جائے ... شام ہو چکی تھی۔ جانوروں کے

گلے جنگل سے گھروں کی طرف ہنکائے جارہے تھے، اور گاؤں کی عورتیں کنویں پر پانی بھرنے کے لیئے جارہی تھیں ۔ میں نے خیال کیا تھوڑی دیر گاؤں ہی میں کیوں نہ گھوم آؤں لیکن سامان کس کے حوالے کرتا ۔ وہ مزدور تو شاید تاک ہی میں ہوگا کہ کب میری آنکھ چوکتی ہے اور کب اُسے اپنے ہاتھ کی صفائی دکھانے کا موقع ملتا ہے ۔ میں نے کمرہ کے ایک صاف کونہ میں شطرنجی بچھالی ۔ اور دیوار کے ٹیکہ سے بیٹھ کر سگریٹ سلگا لیا ۔ اندھیرا بڑھنے لگا ۔ چمگادڑیں پھڑپھڑانے لگیں اور مکان کے سامنے ہی دو چار کتّے بھونکنے لگے ۔ نانی اماں کہتی تھیں کتے بلّیات کو دیکھ بھونکتے ہیں"۔ ۔ ۔ اس خیال کا آنا تھا کہ میں بھی بلیات کے دیدار کا منتظر ہو گیا ۔ کہ اتنے میں ایسی آواز سنائی دی ۔ جیسے کوئی پھلیاں پھوڑ رہا ہو ۔ چوڑیاں بھی بجنے لگیں ... پسینے چھوٹ گئے ۔ اور دل کی دھک دھک کانوں میں نقارہ بجانے لگی ۔ یہ چپٹ پٹ اور کھن چھن کی آواز جاری ہی تھی کہ گنگنانے کی آواز ... دفع بلا کے لیئے یاد تھیں جتنی دعائیں با آواز بلند دہرانا چاہتا ہوں تو حلق میں جیسے کانٹے پڑ گئے ہیں ۔ ہمت کر کے میں نے دروازہ کی دراز سے باہر کی طرف دیکھا ۔ ایک عورت ۔ مونگ پھلیاں پھوڑ پھوڑ کر کھاتی بیٹھی تھی ۔ اور دروازہ کی طرف دیکھ دیکھ کر گنگناتی بھی تھی ۔ چڑیلیں پھلیاں بھی کھاتی ہیں اور گاتی بھی ہیں ۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا ۔ اکیلی عورت ! شام کے وقت! ایسے ڈھنڈار مکان میں عورت تو نہیں ہوسکتی ..

پھر ... چڑیل ! میرے جسم میں لرزہ دوڑ گیا، اور میں وہاں سے بھاگ نکلنے کے امکانات پر غور کرنے لگا ۔ کھڑکی کی سلاخیں مضبوط تھیں ۔ دیواروں میں کہیں رخنے نہ تھے ۔ چھت بھی پختہ تھی ہائے میں کیا کروں کہاں جاؤں ... ایک دروازہ ہی کھلا تھا ! یا میں باہر نکل جاؤں ۔ یا وہ چڑیل اندر گھس آئے ۔ میں باہر نکلوں تو وہ مجھے دیکھ لیتی ۔ اور شاید پیچھا بھی کرتی ... لیکن فٹ بال کا کھلاڑی رہ چکا ہوں ۔ سوچا کہ ایسی تیزی سے دوڑوں گا کہ ..... جھپٹ کر میں نے شطرنجی کی گٹھری بنالی اور سارے سامان کو جوں توں کر کے سنبھال لیا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا دروازہ کی طرف بڑھا ۔ دروازہ کے پٹ کھلنے لگے تو وہ چرچرائے اور میں نے اپنا سر باہر

نکال کر دیکھا تو وہ عورت .. نہیں .. وہ چڑیل .. دروازہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میری اسکی آنکھیں چار ہوئی ہی تھیں کہ اس نے ایک چیخ ماری۔ اور میں بجلی کی طرح دروازہ کے باہر نکلا۔ مارے دہشت کے میرے منہ سے بھی چیخ نکل گئی اور میں چیختا ہوا دالان سے صحن میں اور صحن سے مکان کے باہر۔ جب میں دروازہ سے نکل رہا تھا تو ایک صاحب مجھ سے ٹکرا گئے۔ وہ مکان کے اندر جا رہے تھے .. میں نے انہیں ہکا بکا چھوڑا، اور گاؤں کی سرحد سے نکل کر ایک درخت کے نیچے رک کر دم لیا۔ رات بھر میں اس درخت کے نیچے پڑا رہا۔ اور رات بھر میرے کانوں میں ان چیخوں کی آواز آتی رہی۔ اور رات بھر میں جاگتا رہا۔ پتہ بھی کھڑکتا تو میں کانپ اٹھتا کہ چڑیل !

صبح میں دن چڑھے گاؤں میں داخل ہوا۔ پٹواری کے مکان سے گزر رہا تھا کہ دیکھتا کیا ہوں کہ اچھا خاصا مجمع اس کے آگے کھڑا ہے۔ اور بیچ میں کون ؟ وہی چڑیل .. مگر نہیں ... بس مجمع میں گھستا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ وہی چڑیل مگر ایک عورت ! اور وہ لوگوں سے کہہ رہی تھی کہ رات کو اس نے ایک بھوت کو دیکھا۔ اپنی آنکھوں سے دیکھا .. اور وہ قسمیں کھاتی جا رہی تھی .. ایک دوسرے صاحب نے گواہی دی کہ انھوں نے بھی اس بھوت کو بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ تو کہتے تھے کہ ان کی اس سے ٹکر بھی ہوئی ؟ میں نے وہاں ٹھیرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اگر مجھے پہچان لیتی تو پھر سارے گاؤں والوں میں بھگدڑ مچ جاتی۔ اور جب موٹر ڈرائیور کو معلوم ہوتا کہ میں ہی وہ بھوت ہوں تو وہ بھی موٹر چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ کوئی مسافر میرے ساتھ نہ بیٹھتا۔ اور آٹھ دن تک مجھے یا تو اس پٹواری کے پرانے مکان میں رہنا پڑتا۔ یا اس جھاڑ کے نیچے۔ میں دبک دبکا کر اس بھیڑ سے نکل گیا۔ موٹر میں بیٹھ کر میں نے رات کے سارے واقعات پر غور کرنا شروع کیا۔ لیکن دو تین باتیں میری سمجھ میں نہ آئیں۔ وہ عورت اس ویران مکان میں اکیلی۔ رات کے وقت، گنگناتی کیوں بیٹھی تھی اور وہ ٹکرانے والے صاحب تیز تیز قدم اٹھاتے اس مکان کے اندر کیوں جا رہے تھے اور کیا میں واقعی بھوت ہوں ؟

رشید قریشی ام ۔ اے (عثمانیہ)

سر پہ آنچل نہیں بکھرے ہوئے گیسو کیوں ہیں؟ تمتمایا ہوا چہرہ کھچے ابرو... کیوں ہیں؟
ان گھنی پلکوں پہ سہمے ہوئے آنسو کیوں ہیں؟

رخِ روشن ہے نہ ہونٹوں پہ مسرت کی لکیر قہر آلود نگاہیں ہیں کہ چبھتے ہوئے تیر
فکرِ زنداں روایات میں اب تک ہے اسیر

خوں میں لتھڑے ہوئے جوبن کو سنواریں آؤ ان گنت صدیوں کا ملبوس اتاریں آؤ
کردیں قربان جوانی کی بہاریں آؤ

ظلم کی چھاؤں میں بیتے ہوئے ایام کی یاد ایک فرسودہ تصوّر غم و آلام کی یاد
مسکراتے ہوئے آئے اُنتِ جام کی یاد

زندگی نت نئے سانچوں ہی میں ڈھل جائیگی
اِک ذرا صبر کہ تقدیر بدل جائے گی

سردار علی الہام (عثمانیہ)
(سال اوّل)

مملکت آصفیہ کی عدالتوں کا ماضی و حال

سلطنت مغلیہ کے صوبے کی حیثیت سے ابتداءً حیدرآباد کا عدالتی نظام وہی تھا جو مغلیہ سلطنت میں۔ اس کے بنیادی اصول اور قانون کا خاصا بڑا حصہ تو اسلامی تھا لیکن مقامی ضرورتوں سے صدیوں کے عرصے نے اس میں بہت سے دیگر عناصر بھی شامل کردئے تھے۔ آصف جاہ اوّل نے خودمختاری کا اعلان کیا تو عدالتی نظام میں کوئی تبدیلی نہ کی اگرچہ حکام عدالت کا کردار بلند کرنے میں انھوں نے وہی مستعدی دکھائی جو دیگر شعبہ ہائے نظم ونسق میں حضرت ناصرالدولہ آصف جاہ کے زمانے تک اس نظام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی لیکن نااہل یا خائن وزرار کی سازشوں نے حکام عدالت کے سابقہ بلند معیار کو بہت کچھ پست کردیا تو سالارجنگ نے اپنی مدارالمہامی کے زمانے میں اور محکموں کی طرح عدالت کے لئے بھی یہی نسخہ تجویز کیا کہ برطانوی ہند کے انتظامات کے پیوند حیدرآبادی نظم ونسق کے جامے پر لگائے جائیں۔ چنانچہ ۱۲۳۱ھ میں پائے تخت حیدرآباد میں ایک عدالت دیوانی قائم کی گئی جو بعد میں عدالت دیوانی بزرگ کہلانے لگی۔ اس میں چارسو روپے سے زائد مالیت کے مقدمے رجوع ہوتے تھے۔ تجربے کے طور پر نئی نئی عدالتیں اور نئے نئے اختیارات دئے جاتے اور بسا اوقات برخاست بھی کردئے جاتے۔ لیکن ناکمل تقلید اور قدیم نظام کی متوازی بحالی سے ہر دو نظاموں کی برائیاں تو پیدا ہوجاتی ہیں اور بھلائی کسی ایک کی بھی پوری طرح اثر نہیں دکھاسکتی۔ یہی وجہ تھی کہ انصاف میں دیری بھی ہونے لگی اور اس کے

حصول کی قیمت گراں سے گراں تر ہوتی چلی گئی۔ برطانوی ہند میں اجنبیوں کی حکمرانی سے مالی و عدالتی اقتدارات یکجا کر دئے گئے ہیں بے سوچے سمجھے اس کی نقل بھی ہمارے ہاں بہت دن تک ہوتی رہی اور حکومت کی نیک نامی اور رعایا کی بہبودی دونوں متاثر ہوتے رہے۔

زمانۂ حال کی نسبتہً ترقی یافتہ صورت حال کی قدر دانی پس منظر کی واقفیت کے بغیر ممکن نہیں اسی لئے ذیل میں مختلف عدالتوں کے حالات جو ۱۲۳۱ھ ف سے قائم ہوئیں مختصراً درج ہیں، عدالت دار القضا بلدہ، اور عدالت امور مذہبی یہ پہلے ہی سے قایم ہیں صرف ۱۲۳۱ف کے بعد ان کے اختیارات کا تعین کیا گیا۔

عدالت دیوانی بزرگ یہ عدالت ۱۲۳۱ھ ف میں قایم ہوئی جسمیں چار سو روپیہ سے زیادہ مالیت کے مقدمات رجوع کئے جاتے تھے۔ ۱۲۵۶ف میں اس کے اختیار سماعت میں توسیع ہوئی اور سودی ڈگریاں، جن سے پہلے پرہیز کیا جاتا تھا۔ عدالت کی طرف سے دیجانے لگیں۔

عدالت مجلس ساہوان عدالت مجلس ساہوان ۱۲۶۶ف سے لیکر ۱۲۸۳ف تک زیر صدارت نواب سالار جنگ بہادر وزیر سلطنت آصفیہ قائم رہی اس میں مہاجنوں کے مقدمات زر نقد بطریقہ پنچایت سطے ہوا کرتے تھے۔

عدالت دیوانی بلدہ یا عدالت دیوانخانہ اس عدالت کو نواب سراج الملک نے بدوران ۱۲۶۱ف اپنے محل میں قائم کیا تھا اس میں دیوانی و فوجداری دونوں مقدمات پیش ہوتے تھے۔ ۱۲۷۲ف یعنی قیام کے ۱۱ سال بعد جملہ مقدمات دیوانی کو ایک ہزار تک کے اختیارات دئے گئے۔ ۱۳۰۱ف میں یہ عدالت عدالت دیوانی بلدہ کہلانے لگی ۱۳۳۴ف میں اس کو اختیارات عدالت خفیفہ عطا ہوئے۔ یہ اختیارات ۱۳۴۲ف میں علیحدہ عدالت "عدالت مطالبات خفیفہ" کے قیام پر اس سے علیحدہ کر دئے گئے۔

عدالت بیرون بلدہ عدالت بیرون بلدہ ۱۲۸۶ف میں قائم ہوئی مقدمات کے فریقین مضافات شہر کے رہنے والے ہوتے اور اس عدالت کے اختیارات غیر معمولی تھے، یوروپین، انکی اولاد

اور اس ملک کے دیسی عیسائیوں پر بھی خواہ وہ اضلاع ہی میں سکونت کیوں نہ رکھتے ہوں یا شہر حیدرآباد میں بلالحاظ حدود مقام حاوی تھے۔ ان کے ازدواجی مقدمات وعطائے وصیت ناموں کے مقدمات بھی یہاں رجوع ہوتے اور اس عدالت کا مرافعہ محکمہ مدار المہام میں دائر کیا جاتا تھا لیکن بعد میں مرافعہ کی تمام درخواستیں مجلس عالیہ عدالت میں منتقل کر دی گئیں ۱۲۹۵ف میں یہ عدالت توڑ دی گئی۔ اور پانچ ہزار تک مالیت کے مقدمات عدالت دیوانی بلدہ میں اور اس سے زیادہ مالیت کے مجلس عالیہ عدالت میں منتقل کر دئے گئے۔

عدالت گوشن راؤ اس عدالت میں مقدمات وطن داری یا نزاع مابین جوشیاں گوسائیاں پیش ہوتے تھے۔ یہ صرف ڈیڑھ سال ہی تک قائم رہی اور ۱۲۷۳ف میں برخاست ہو گئی۔

عدالت دارالقضا بلدہ جب ملک میں مختلف مسائل کی حد تک قانون اسلامی کی جگہ برطانوی ہند کے مماثل قانون نافذ ہونے لگے تو مسائل شخصی کی حد تک ہندو اور مسلمان دونوں کے مذہبی قانون بحال رکھے گئے۔ انتظامی ضرورتوں سے پائے تخت میں مسلمانوں کے شخصی مسائل کے لئے عدالت دارالقضا کو مختار کیا گیا اور جب ۱۲۷۹ف میں شہر حیدرآباد کی عدالتوں کے اختیارات کا تعین کیا گیا تو اس کو مقدمات نکاح طلاق، مہر، ترکہ، ثبوت حضانت، قتل، میں اختیارات حاصل تھے دوسرے الفاظ میں ان کو فوجداری اختیارات بھی پہلے سے حاصل تھے لیکن ۱۲۸۸ف میں اس کے اختیارات فوجداری باقی نہ رہے اور صرف مقدمات ثبوت نسب، ترکہ، نکاح، نفقہ و رضاعت، زیارت اقربا، فسخ رسم منگنی، بندوبست آزار دستی ولسانی، اخراجات بیمارگی و زچگی۔ خلع، طلاق، مہر، جہیز و چڑھاوا۔ طلب زوجہ و دختر، ولایت و حضانت، ہبہ اخراجات تجہیز و تکفین کی حد تک اور مقدمات شیعہ میں بلدہ حیدرآباد کی حد تک اختیار باقی رہا دیگر مذاہب کے مذکورۂ بالا نوعیت کے مقدمات خصوصاً ازدواجی مقدمات عدالت دیوانی بلدہ کے اجلاس میں رجوع ہوا کرتے

عدالت آرایش بلدہ ۱۳۲۳ف میں یہ عدالت قایم ہوئی اس کے ناظم ۔ نزاعات معاوضہ اراضیات کا فیصلہ کرتے انہیں قانون حصول اراضی و آرایش بلدہ (سٹی امپرومنٹ بورڈ) کے تحت غیر محدود اختیارات حاصل تھے ۔ یہ ' تصفیہ نزاعات مابین ورثا ' تحقیقات حقیت متعلق جایداد ' تعین مقدار معاوضہ کا اختیار بھی انہیں حاصل تھا ۔

عدالت "محکمہ قضائے عرب" عربوں کے مقدمات ۱۲۸۲ف تک پنچایت کے ذریعے طے ہوا کرتے جس کا صدر ابوالپنچ ہوا کرتا اور پنچ عرب جمعدار وشیوخ ہوا کرتے تھے ۱۲۸۲ف میں انکے مقدمات کے فیصلہ کی غرض سے علیحدہ عدالت کے قیام کی تجویز ہوئی اور ۱۲۹۸ف میں عربوں کے مقدمات بھی عدالت فوجداری میں دیگر اور فریقین کی طرح رجوع ہونے لگے ۔

دفتر امور مذہبی اسے کچھ فوجداری اختیارات بھی حاصل تھے ۔ بعض سررشتوں کو مثلاً سررشتہ ٹپہ ' سررشتہ کروڑگیری ' سررشتہ کوتوالی کو سہولت کار و انتظام کے نقطۂ نظر سے بھی فوجداری اختیارات دینے پڑے تھے انہیں یہ اختیارات صرف کسی خاص حکم قوانین کی خلاف ورزی میں حاصل تھے عام فوجداری اختیار حاصل نہیں تھا ذیل میں ہم چند ایسی عدالتوں کا ذکر کریں گے ۔

عدالت تعلقدار کروڑگیری اس عدالت کے اختیارات فوجداری صرف قانون کروڑگیری کے احکام کی خلاف ورزی تک محدود تھے ۔ کمشنر کروڑگیری کو چار سال تک قید اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کا اختیار تھا یعنی ایسے مقدمات جن میں ایسی سنگین سزا دیجاسکے اُنکی وہ خود سماعت کرسکتا تھا بشرطیکہ وہ جرم جس کی سماعت وہ کرتا ہے قانون کروڑگیری کی خلاف ورزی سے بنا ہو ۔ مہتمم اور امین کیلئے علی الترتیب تین ماہ قید سادہ اور ۵۰ روپیہ تک جرمانہ اور ایک ماہ قید سادہ ۳۰ روپیہ تک جرمانہ کا اختیار رکھتے تھے ۔ عہدہ دار تحت کی ناراضی سے اس کا مرافعہ افسر اعلیٰ کے پاس ہوتا تھا تعلقدار کے فیصلہ کا مرافعہ عدالت عالیہ میں

ہوا کرتا تھا۔ یہ عدالت ۱۲۹۴ف میں برخاست کردی گئی۔

عدالت ناظم ٹپہ عہدہ داران ٹپہ کو اہالیان ٹپہ کی بے ضابطگیوں کو روکنے کے لئے اختیارات فوجداری دے گئے تھے جن مقدمات کی سماعت کا انہیں اختیار تھا اُنکی نوعیت مقدمات ذیل کی سی تھی :-

۱ - تغلب -

۲ - تصرف

۳ - زائد محصول لینا

۴ - دوسرے کا خط شرارت سے کھولنا

۵ - سرکاری کاغذات میں خانگی خطوط بلا ادائی محصول روانہ کرنا -

یہ عدالت بھی ۱۲۹۴ف میں اُٹھادی گئی۔

اضلاع میں مہتمم ٹپہ خانہ، مددگار، نائب کارپرداز ٹپہ خانہ کو بھی سزاو جرمانہ کا اختیار تھا۔ عہدہ داران عدالت کے تقرر کے اختیارات ان سے لے لئے گئے تھے۔

فوجداری عدالتیں

عدالت بادشاہی ۱۲۶۴ف میں ایک عدالت نواب سالار جنگ بہادر کی صدارت میں قائم ہوئی بجز سزائے قتل وحبس دوام کے جملہ اختیارات اس کو حاصل تھے ۱۲۷۰ف میں باستثنا مقدمات قابل سماعت کوتوالی و دار القضا بلدہ جملہ مقدمات فوجداری کی سماعت کا انہیں اختیار تھا۔ ۱۲۷۰ف میں جب یہ عدالت برخاست کردی گئی تو سارے مقدمات عدالت عالیہ میں منتقل کر دے گئے۔

عدالت فوجداری بلدہ تیرھویں صدی فصلی کے نصف اوّل میں عدالت فوجداری بلدہ کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ اضلاع میں جج و منصف کے احکامات قابل تعمیل نہ سمجھے جاتے جب تک عدالت فوجداری بلدہ کی منظوری صادر نہ ہو۔

ناظم فوجداری بلدہ کو تین سال قید اور (۵۰۰) روپیہ جرمانہ کا اختیار تھا مددگار ناظموں کو ۱۲۸۰ف تک اختیارات فوجداری نہ تھے وہ بعد تحقیقات ناظم اوّل کے پاس سزا کے لیے مثل بغرض تجویز پیش کیا کرتے تھے۔

عدالت کوتوالی بلدہ ۱۲۳۱ف سے پہلے بھی عدالت کوتوالی بلدہ قائم تھی لیکن صرف زبانی احکام صادر ہوا کرتے تھے۔ کوتوال بلدہ کے مددگاروں کو جو منصفین کہلاتے تھے مجسٹریٹ کے اختیارات حاصل تھے اور

۱۔ ایسے مقدمات جن میں میعاد قید زائد از ایک سال نہ ہو

۲۔ سرقہ کے مقدمات جن کی مالیت تین سو سے زیادہ نہ ہو سزائے قید صادر کرسکتے تھے جس کی میعاد چھ ماہ سے زائد نہ ہوسکتی تھی جرمانہ کی سزا اس سے سوا ہے جس کی مقدار پچاس روپیہ سے زیادہ نہ ہوتی۔ اس عدالت کے احکام کا مرافعہ عدالت بادشاہی میں ہوتا تھا ۱۲۷۲ف میں عہدہ داران عدالت کوتوالی کو صرف مقدمات ضرر خفیف اور معمولی مارپیٹ کے نزاعات کے تصفیہ کا اختیار دیا گیا تھا ۱۲۸۶ف کے بعد ان کے اختیارات باقی نہ رہے۔

شہر حیدرآباد کی خاص عدالتیں صاحب عالیشان بہادر کو عدالتی اختیارات ۱۲۷۳ف میں ایک عہدنامہ کی رو سے دے گئے جس میں حسب ذیل مقدمات کا تعلق صاحب عالیشان بہادر سے تھا۔

سرکار عالی اور صاحب عالیشان بہادر کے عہدہ داروں کی مشترک جماعت کو مقدمات کی سماعت کا اختیار دیا گیا جب فریقین حسب ذیل ہوں۔

۱۔ کل یوروپین برٹش رعایا و دیگر یوروپین معہ اولاد جو کسی چھاونی حیدرآباد کی کنٹنجنٹ فوجی آبادی میں سکونت رکھتے ہوں

۲۔ کل یوروپین برٹش رعایا و دیگر یوروپین معہ انکی اولاد کے جو محکمہ ریل یا تار میں کسی

عہدے پر مامور ہوں۔

۳۔ کل یوروپین برٹش رعایا و دیگر یوروپین معہ انکی اولاد کے جو ساکن حیدرآباد ہوں یا علاوہ اُن کے جو سرکار عالی میں ملازم ہوں یا بجز مدار المہام یا کسی افسر حیدرآباد کے نوکر ہوں۔

۴۔ کل یوروپین برٹش رعایا جو مندرجہ بالا اقسام سے نہ ہوں مگر جس کو گورنمنٹ سرکار عالی نے گورنمنٹ سرکار عظمت مدار کے سپرد کیا ہو۔

(The British Enactment in native State Vol. H) کے تحت ۱۲۹۴ ف

مددگار صاحب عالیشان بہادر کو اختیارات سشن اور صاحب عالیشان رزیڈنٹ بہادر کو اختیارات ہائیکورٹ عطا فرمائے گئے۔

مجلس مرافعہ صدر یا مجلس عالیہ عدالت ۱۲۷۰ ف میں اضلاع شوراپور و رائچور کے عدالتی انتظام کے لئے اور صدر عدالت مستردہ" قایم ہوئی۔ ۱۲۷۲ ف میں تمام عدالت ہائے اضلاع کا تعلق اس محکمہ سے ہوگیا اور اس کا نام "صدر عدالت مستردہ تصحیح تعلقات" رکھا گیا ۱۲۷۵ ف میں تمام مقدمات دیوانی و فوجداری بہ صیغہ مرافعہ یہاں سے فیصل ہوتے اور ۱۳۰۵ ف میں "مجلس مرافعہ صدر" اس کا نام رکھا گیا ۱۲۸۱ ف میں عدالت دیوانی بزرگ اور بادشاہی عدالت برخاست کردی گئی تو اُن جملہ مقدمات کی سماعت کا اختیار بھی اسکو حاصل ہوا جو اُن عدالتوں میں رجوع ہوتے تھے یہ وہی زمانہ ہے جس میں پہلی دفعہ صیغہ ابتدائی کی بنیاد پڑی ۱۲۸۷ ف میں یہ عدالت "مجلس عالیہ عدالت" کہلانے لگی ۱۲۹۴ ف میں دستور العمل مجلس عالیہ عدالت بعد ترمیم نافذ ہوا۔ ۲۸ فروری ۱۳۳۵ ف میں مجلس عالیہ عدالت کو منشور خسروی عطا ہوا جس کی رو سے عدالت عالیہ کو بہت وسیع اختیارات حاصل ہوئے۔ ۱۳۴۴ ف میں قانون عدالت عالیہ کی ترمیم ہوئی جس سے فصل خصومات میں بے حد سہولت ہوئی۔

دفتر معتمدی عدالت ۱۲۷۰ ف میں عدالتوں کی نگرانی کے لئے قائم ہوا۔ عدالت العالیہ کا پانچ ہزار سے زائد مالیت کا مرافعہ یہاں دائر کیا جاتا جو صدر المہام عدالت بالاتفاق معتمد سماعت

کیا کرتا تھا۔ ۱۳۲۸ف میں ہائیکورٹ کے فیصلہ جات، قطعی قرار دئے گئے۔

مقدمات فوجداری کی بابت بھی مجلس عالیہ عدالت کے فیصلے قطعی قرار دئے گئے اور عدالت بیرون بلدہ کا مرافعہ صدرالمہام کے پاس ہوتا تھا وہ بھی اب مجلس عالیہ عدالت میں دائر ہونے لگا تھا اور مقدمات جو صدرالمہام عدالت کے اختیار میں تھے وہ مجلس عالیہ عدالت میں منتقل کر دئے گئے۔

صوبہ و اضلاع کی عدالتیں

صوبہ جات میں صوبہ داران یعنی عہدہ داران مال کو ہی عدالتی اختیارات حاصل تھے اول دوم وسوم تعلقدار کے کسی فیصلہ کا مرافعہ ان کے پاس پیش ہوسکتا تھا نیز ناظم ریلوے کے فیصلہ کا مرافعہ بھی انہیں کے پاس پیش ہوتا تھا۔ جب کار عدالتی میں اضافہ ہوا تو ان صوبہ داروں کو عدالتی اختیارات کے استعمال کے لئے ایک مددگار ملا۔ ۱۲۹۴ف سے عدالتی اختیارات عہدہ داران مال سے جب علیحدہ کر دئے گئے تو اسی سال سمت اورنگ آباد میں سشن جج مقرر ہوا۔ اور پھر کثرت کار کے باعث زائد ناظم سشن کا ۱۳۲۶ف میں تقرر کیا گیا

عدالت نظامت سشن اس عدالت میں بہ صیغہ دیوانی غیر محدود اختیارات سماعت مقابلہ ناظم صدر عدالت کو حاصل ہیں اور بہ صیغۂ فوجداری ہر جرم کی سماعت ناظم سشن کر سکے گا اور سزائے جائز کا حکم صادر کر سکے گا لیکن اس سزا کا نفاذ نہ ہو سکے گا تا وقتیکہ

۱۔ دس سال سے زیادہ قید کی صورت میں اجلاس متفقہ مجلس عالیہ عدالت کی منظوری نہ ہو

۲۔ سزائے قید دوام کی صورت میں محکمہ سرکار کی

۳۔ سزائے موت کی صورت میں اعلیٰحضرت بندگانعالی کی منظوری شاہانہ صادر نہ ہو۔ بہ صیغۂ مرافعہ عدالت ضلع کی تجویز کی ناراضی سے دائر کئے ہوئے مرافعہ کی سماعت کر سکے گا۔ ضلع اطراف بلدہ میں مرافعہ اجلاس ابتدائی میں پیش ہوگا۔

اہل اسلام کے وہ مقدمات جو بلدہ میں عدالت دارالقضا بلدہ کے ناظم کے قابل سماعت

قرار دیئے گئے ہیں اُن کے مرافعہ کی سماعت اضلاع میں، اُس ضلع کی عدالت سشن میں ہی ہوگی اور فیصلہ کی ناراضی سے مرافعہ اُسی مقام پر ہوا کرے گا۔

عدالت ضلع شہر حیدرآباد میں دیوانی اور فوجداری مقدمات کی سماعت کے لئے علیحدہ علیحدہ عدالتیں قائم ہیں لیکن اضلاع میں دیوانی اور فوجداری دونوں قسم کے مقدمات کی سماعت کا اختیار ناظم ضلع کو دیا گیا ہے۔ اور رعایا کی سہولت کے لئے اختیارات عدالت خفیفہ بغرض سماعت مقدمات دیوانی (مالیتی سَو یا سَو سے کم) تک کے دلئے گئے ہیں جن کی مالیت میں پانچسو ۵۰۰ تک کے اضافہ کی گنجائش ہے۔

عدالت ضلع بہ صیغہ دیوانی دس ہزار تک کی مالیت کے مقدمہ کی سماعت کی مجاز ہے۔ اور اسمیں بیس ہزار تک توسیع ہوسکتی ہے۔ اہل اسلام کے جو مقدمات عدالت دارالقضا بلدہ میں قابل سماعت قرار دیئے گئے ہیں۔ وہی مقدمات جس میں اہل ہنود فریقین ہوں اضلاع میں عدالت دیوانی ضلع سے اور بلدہ حیدرآباد میں عدالت دیوانی بلدہ سے فیصل ہوتے ہیں۔ مثلاً مقدمہ طلب زوجہ و دختر طلاق، نان ونفقہ وغیرہ۔ بہ صیغہ فوجداری سزائے قید جس کی میعاد چہار سال سے زائد نہ ہو اور جرمانہ جس کی مقدار پانچہزار روپیہ سے زائد نہ ہو دی جاسکتی ہے۔

عدالت دیوانی بلدہ عدالت دیوانی بلدہ کے ناظم کی امداد کے لئے ناظم دوم، ناظم سوم و چہارم مقرر کئے گئے ہیں ناظم اوّل کو دس ہزار کی مالیت کے مقدمہ کی سماعت کا اختیار ہے ناظم دوم کے اختیارات زائد ناظم ضلع کے اختیارات کے مماثل ہیں یعنی دس ہزار یا اُسی قدر مالیت کے مقدمہ کی سماعت کرسکتے ہیں۔ ناظم اوّل کے اختیار سماعت میں بیس ہزار تک اضافہ کیا جاسکے گا لیکن زائد ناظم ضلع یا ناظم دوم کے اختیارات میں اضافہ کی گنجایش نہیں۔ ناظم سوم و چہارم کا درجہ منصفوں کا ہے لیکن انہیں پانچ ہزار یا اُسی قدر مالیت کے مقدمہ کی سماعت کا اختیار ہے۔ ان کا مرافعہ ناظم اول و دوم کے پاس پیش ہوتا ہے، ناظم اوّل و دوم کی تجاویز کی ناراضی سے مرافعہ مجلس عالیہ عدالت میں پیش ہوتا ہے۔

عدالت دیوانی بلدہ میں دو اعزازی نظار بھی کارفرما ہیں جن کو ما، سو اور ۳۰۰ سو کی مالیت کے مقدمات کی سماعت کا اختیار حاصل ہے

عدالت دیوانی بلدہ میں ۱۳۴۲ف سے تمسکات کی رجسٹری Notary Public یعنی مُصَدِّق کے احکام کے متعلق اختیارات کا استعمال شروع ہوا جن سے بنکوں اور مہاجنوں کو از حد سہولت ہو گئی ہے۔

عہدہ داران مال جن کو ۱۲۹۴ف سے قبل اختیارات عدالتی حاصل تھے اور فوجداری مقدمات میں دس سال قید اور چار ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا صادر کرنے کا اختیار تھا۔

عدالت ہائے اول تعلقداران ۱۲۵۶ف کے بعد ٹھیکہ دار تعلقداروں کو اختیارات عدالتی عطا ہوئے ۱۲۷۵ف میں ان تعلقداروں کو بہ صیغہ دیوانی لا محدود مالیت کے مقدمات کی سماعت کا اختیار تھا اور صیغہ فوجداری چار سال قید اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا صادر کر سکتے تھے بہ صیغہ مرافعہ ۳۰۰ سو روپیہ کی مالیت کے مقدمات میں انکی تجاویز قطعی قرار دی جاتی تھیں، نائب تحصیلداروں کے فیصلہ کے مرافعہ انہیں کے پاس پیش ہوتے۔ ۱۳۳۱ف میں جب اسکیم انتزاع اختیارات نافذ ہوئی تو فوجداری اختیارات بھی لے لئے گئے۔

عدالت ہائے دوم تعلقدار و سوم تعلقدار ۱۲۷۵ف کے بعد عہدہ داران مال کو باقاعدہ عدالتی اختیارات دئے گئے دوم و سوم تعلقداروں کو علی الترتیب بہ صیغہ دیوانی مقدمات مالیتی دو ہزار اور ایک ہزار کی سماعت کا اختیار تھا اور بہ صیغہ فوجداری دو سال کی قید اور پانچ سو روپیہ جرمانہ کی سزا صادر کرنے کا اختیار دوم تعلقدار کو اور ایک سال قید اور تین سو روپیہ جرمانہ کا اختیار سوم تعلقدار کو حاصل تھا

تحصیلدار ان کو بہ صیغہ دیوانی تین سو روپیہ کی مالیت کے مقدمات کی سماعت کا اختیار تھا اور بہ صیغہ فوجداری ایسے مقدمہ کی سماعت کر سکتے تھے جس میں چھ مہینے کی قید یا ڈیڑھ سو روپیہ جرمانہ یا دونوں کی مجموعی سزا صادر کی جا سکتی ہو۔ پولیس پٹیلوں کی تجاویز کا

مرافعہ بھی یہی سماعت کرتے تھے ۔

پولیس پٹیلاں ان کو دیوانی مقدمہ کی سماعت کا اختیار نہ تھا البتہ بہ صیغہ فوجداری ۴۸ دن کی قید اور تین روپیہ جرمانہ کی سزا صادر کرنے کا اختیار انہیں حاصل تھا۔ ان کے احکام کا مرافعہ تحصیلدار کے پاس ہوتا ۔ ان کی کارروائی ضبط تحریر میں نہ لائی جاتی تھی ۔

موجودہ تنظیم سررشتہ عدالت میں اختیار سماعت

ہمارے موجودہ بادشاہ کے زمانے میں اور شعبہ ہائے حیات کی طرح عدالت میں بھی انتہا درجے اصلاح وترقی ہوئی ہے ۔ عدلیہ کو عاملہ (Executive) سے آزاد کردیا گیا ہے ۔ مالی عہدداروں سے عدالتی اختیارات کی علیحدگی وہ نعمت ہے جو خود برطانوی ہند کو اب تک حاصل نہ ہوسکی ہے مقدمات کا دوران گھٹانے کے لئے وسیع تدبیریں اختیار کی گئی ہیں ۔ دفتر عدالت صدر المہام کو برخاست کردیا گیا اور جملہ اختیارات عدالتی ذریعہ منشور خسروی مجلس عالیہ عدالت کو حاصل ہوگئے ہیں ارکان مجلس بغرض انصاف رسانی فرمانروا کے نمایندے سمجھے جاتے ہیں اور مجلس عالیہ عدالت کے اکثر فیصلے قطعی ہوتے ہیں چند فیصلے جو انتظامی معاملات سے متعلق ہوں مجلس عالیہ عدالت کی تجاویز کی ناراضی سے صدر المہام عدالت و مدار المہام کے پاس پیش ہوسکتے ہیں نیز ہر شخص جسے مجلس عالیہ عدالت نے سزائے موت وحبس دوام کے سوا کوئی اور سزا دی ہو باجازت خاص جوڈیشل کمیٹی میں قابل مرافعہ ہوسکتے ہیں ۔ حیدرآباد کا قانون عمومی چونکہ اب بھی شرع شریف ہے اس لئے سزائے موت کے لئے مفتی عدالت العالیہ کی رائے بھی حاصل کرنی پڑتی ہے ۔

دیوانی مقدمات بھی جن کی مالیت دس ہزار سے زائد ہو یا جو خاص طور پر اہم ہوں مجلس عالیہ عدالت کی ناراضی سے بہ صیغہ مرافعہ جوڈیشل کمیٹی میں پیش ہوسکتے ہیں لیکن محکمہ بالا یعنی جوڈیشل کمیٹی کو کارروائی عدالت تحت میں کوئی دخل نہیں ۔ مجلس عالیہ عدالت کو بہ صیغہ نگرانی ماتحت عدالتوں کی طلبی امثلہ کا اختیار حاصل ہے نیز کسی کارروائی کی بابت جو عدالت تحت میں جاری رہی ہو کسی خاص

طور پر عمل کرنے کا عدالت ماتحت کا حکم دے سکتی ہے اور مقدمات کے رجوع اور فیصل ہونے تک مختلف ضرورتوں کے لحاظ سے عدالت ماتحت کی رہنمائی کے لئے قواعد وضع کرسکتی ہے، یہ سفارش کرسکتی ہے کہ کسی عدالت کا اختیار سماعت خاص حد تک بڑھایا جائے۔

مجلس عالیہ عدالت کے اختیارات

مجلس عالیہ عدالت کے اجلاس ابتدائی پر مقدمات دیوانی دس ہزار سے زائد اور لا محدود مالیت کے رجوع کئے جاسکتے ہیں۔
اجلاس ابتدائی کا مرافعہ اجلاس منفقہ میں ہوسکے گا اور بلدہ حیدرآباد میں اجلاس ابتدائی عالیہ عدالت صدر عدالت کے درجہ کی ہوتی ہے۔

مجلس عالیہ عدالت بہ صیغۂ فوجداری ہر سزائے جائز کا حکم دے سکے گی لیکن اس سزا کا نفاذ نہ ہوسکے گا تا وقتیکہ

۱۔ سزائے موت کی صورت میں بندگان اقدس کی منظوری صادر نہ ہو۔

۲۔ حبس دوام کی صورت میں محکمہ سرکار کی منظوری نہ لی گئی ہو

مجلس عالیہ عدالت کے اختیارات نگرانی و امثلہ کی طلبی کے اختیارات اوپر مذکور ہوئے ہیں۔ مجلس عالیہ عدالت بہ صیغہ مرافعہ ثانی عدالت ضلع کے اور بہ صیغہ مرافعہ عدالت سشن کے فیصلہ کی ناراضی سے مرافعہ کی سماعت کرسکتی ہے۔

جاگیرات کی عدالتیں

ممالک محروسہ سرکار عالی میں چھوٹی بڑی بہت سی جاگیریں ہیں لیکن ان تمام کو عدالتی اختیارات حاصل نہیں ہیں۔ مال کا سررشتہ ہر جاگیر میں موجود رہتا ہے لیکن انتظام دعدالتیں چھوٹی جاگیرات کی رعایا کے لئے سرکار عالی کی جانب سے مہیا کئے جاتے ہیں۔ بڑی جاگیرات میں انتظام و عدالتی اختیارات خود جاگیرداروں کے سپرد رہتے ہیں۔ جاگیریں کثرت کار کے لحاظ سے منصفی، عدالت ضلع صدر عدالت بھی قائم کیجاتی ہے۔ لیکن ان تمام عدالتوں پر عدالت عالیہ کو اسی طرح نگرانی کا حق

حاصل ہے جس طرح کہ ممالک محروسہ سرکار عالی کی مماثل درجہ کی عدالتوں پر حق رکھتی ہے ۔

جاگیرات کی منصفی' اور دیگر عدالتوں کو وہی اختیارات حاصل ہیں جو ممالک محروسہ سرکار عالی کی مساوی درجہ کی عدالتوں کو حاصل ہیں ۔ جاگیرات کی اعلیٰ عدالتوں کا مرافعہ اُس ضلع یا صوبہ کی عدالتوں میں ہوتا ہے جس ضلع یا صوبہ کے حدود سماعت کے اندر وہ جاگیری عدالت واقع ہو ۔ جاگیرات کی صدر عدالتوں کے مرافعے عدالت عالیہ میں ہوتے ہیں ۔ جاگیر کی جانب سے عطا کردہ معاش و انعام کی دریافت اور اس کی وراثت کی کارروائی بھی جاگیر کے عدالتوں میں ہوگی اور اس کی نسبت کوئی دعویٰ سرکار عالی کے محکمہ جات میں سماعت نہیں کیا جاسکے گا ۔

لیکن جو معاشین عطیہ سلطانی ہوں اسکو محض اندرونی جاگیرات و پائیگاہ واقع ہونیکی وجہ سے انکی بابت تحقیقات و دریافت انعامی کا اختیار جاگیر یا پائیگاہ کی مالی عدالتوں کو حاصل نہیں رہتا ایسی معاشوں کی دریافت سرکار عالی کے محکمہ انعام میں ہوگی ۔ لیکن قبل اس کے کہ مقدمہ سرکار عالی میں رجوع کیا جائے جاگیر متعلقہ میں اُس کی ابتدائی تحقیقات کرکے اس امر کا تصفیہ کرنا ہوتا ہے کہ آیا وہ معاش عطیہ سلطانی ہے یا عطیہ جاگیر مگر ایسی تحقیقات میں کارروائی مطابق اُن تمام ضوابط و قواعد کے ہوگی جو سرکار عالی میں نافذ ہیں ۔

اگر معاش ہائے مذکور جو عطیہ سلطانی ہوں مشروط الخدمت ہو یا جو بغرض ادائی خدمت جاگیر عطا کی گئی ہوں اور اب ادا ہو رہی ہوں تو اُن کی دریافت انعامی و دریافت وراثت جاگیر کی مالی عدالتوں ہی میں عمل میں آئیگی مملکت آصفیہ میں ذیل کی جاگیرداروں کو عدالتی اختیارات حاصل ہیں ۔

۱ ۔ نواب سالار جنگ بہادر
۲ ۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر آنجہانی
۳ ۔ راجہ شیوراج بہادر
۴ ۔ نواب کمال یار جنگ بہادر
۵ ۔ نواب غازی جنگ بہادر

۶ ۔ راجہ شامراج راجونت
۷ ۔ نواب شوکت جنگ بہادر
۸ ۔ نواب میر جنگ بہادر
۹ ۔ نواب صاحب کلیانی
۱۰ ۔ نواب سیف نواز جنگ بہادر
۱۱ ۔ راجہ راؤ رنبھا
۱۲ ۔ نواب مہدی جنگ بہادر
۱۳ ۔ نواب دوست محمد خان بہادر
۱۴ ۔ نواب میر سلیمان علیخان بہادر
۱۵ ۔ نواب ثریا جنگ بہادر
۱۶ ۔ نواب علی محمد خان بہادر
۱۷ ۔ جاگیر قطب علیخان
۱۸ ۔ نواب علی یار جنگ بہادر
۱۹ ۔ راجہ رگھوتم راؤ صاحب
۲۰ ۔ قطب النساء بیگم صاحبہ

جاگیر کی طرح سمستانوں کو بھی عدالتی اختیارات حاصل ہیں اور بعض سمستانوں کو غیر محدود عدالتی اختیارات بھی بعض سمستانوں میں صرف ایک یا دو منصفیاں قائم ہیں اور سمستان ونپرتی اور جٹپول میں عدالت ضلع بھی قائم ہے ۔سمستان کی عدالتوں پر بھی عالیہ عدالت کو انتظامی اختیارات حاصل ہیں اور اختیارات مرافعہ ونگرانی بھی۔

سمستانات ذیل کو عدالتی اختیارات حاصل ہیں

۱ ۔ گدوال

۲ ۔ پالونچہ ۔ عدالت ضلع مستقر بورگم پہاڑ

۳ ۔ ونپرتی ۔ (ایک عدالت ضلع اور ایک عدالت منصفی) اس کے علاوہ انہیں کوتوالی اور رجسٹری کے اختیارات بھی حاصل ہیں

۴ ۔ جٹپول ۔ ایک عدالت ضلع اور ایک عدالت منصفی موجود ہے ۔

۵ ۔ امرچنتہ ۔ (ایک منصفی درجہ اول قائم ہے)

۶ ۔ گرگنٹہ ۔ (دو مقامات پر منصفی قائم ہے)

۷ ۔ راجہ پیٹھ ۔ (ایک منصفی موجود ہے)

۸ ۔ گوپال پیٹھ ۔ (ایک منصفی جس کو بہ صیغہ فوجداری درجہ دوم کے اختیارات حاصل ہیں)

۹ ۔ اناگندی ۔ (ایک منصفی قائم ہے)

جاگیرات کی انعامی کارروائیاں ممالک محروسہ سرکار عالی کے محکمہ انعام میں سماعت نہیں کی جاتیں بلکہ وہ جاگیر کی مالی عدالتوں سے ہی فیصل پاتی ہیں ۔ البتہ اگر کوئی انعام عطیہ سرکار عالی ہے تو صرف اس کے تصفیہ کا حق سرکار عالی کو ہوگا ۔

ناظم عدالت مطالبات خفیفہ

۱۳۳۸ف میں ناظم اول دیوانی بلدہ کو مقدمات زر نقدیں ۵۰۰ روپیہ تک اختیارات عطا ہوئے ۔ بعدازاں الحاق رزیڈنسی اور کثرت کار کی وجہ سے علیحدہ عدالت کو اختیارات خفیفہ عطا کرنے کی ضرورت پیش آئی چنانچہ عدالت عالیہ کی تحریک پر ۱۳۴۲ف میں ایک علیحدہ عدالت مطالبات خفیفہ کے نام سے قائم ہوئی جسکو ۵۰۰ روپیہ کی مالیت کے مقدمات کی سماعت کا اختیار حاصل ہے اور اس میں دو ہزار تک وسعت کی گنجائش ہے ۔

کثرت کار کی وجہ سے زائد ناظم عدالت مطالبات خفیفہ کا تقرر بھی عمل میں آیا ہے اضلاع

میں بھی ناظم ضلع اور منصف کو بغرض سہولت رعایا ایک سو روپے تک کی مالیت والے مقدمات کی نسبت اختیارات خفیفہ استعمال کرنے کا مجاز گردانا گیا ہے۔ نیز ناظم کو پانسو تک کی مالیت والے مقدمہ کی سماعت کا اختیار حاصل ہے

ناظم ضلع اور منصف کے اختیارات میں پانسو اور ایک سو تک اضافہ کی گنجائش ہے۔

عدالت منصفی ہر تعلقہ میں عدالت منصفی قائم ہے۔ اُن جاگیرات کے تعلقوں میں بھی جنھیں عدالتی اختیارات دئے گئے ہیں منصفی قائم ہے۔

اس عدالت کو بہ صیغہ دیوانی ایک ہزار تک کی مالیت کے مقدمات کی سماعت کا اختیار حاصل ہے اور اختیار خفیفہ پچاس روپیہ مالیت کے مقدمہ کے لئے حاصل ہے جس میں ایک سو روپیہ تک اضافہ کی گنجائش ہے۔

تعلقہ میں شائد کثرت کار کی وجہ سے یا رعایا کی سہولت کے مد نظر تحصیلدار یعنی عہدہ دار مال کو جن سے سابق کے اختیارات عدالتی لے لئے گئے ہیں۔ اب پھر ایک سو روپیہ تک کی مالیت کے مقدمات کی سماعت کا اختیار دیا گیا ہے جس میں تین سو تک اضافہ مجلس عالیہ عدالت کی خاص سفارش پر سرکار عالی کرسکے گی۔

عدالت آرائش بلدہ اس عدالت میں معاوضہ اراضی و املاک وغیرہ کے مقدمات جو علاقہ خالصہ سے متعلق ہوں پیش ہوتے ہیں۔

مقدمات مذکور جو صرفخاص سے متعلق ہوں اوّل تعلقداری باغات کے ناظم کے پاس رجوع کئے جاتے ہیں۔ تعلقدار مذکور ہی علاقہ صرفخاص کے ناظم آرائش بلدہ تصور کئے جاتے ہیں۔

عدالت فوجداری بلدہ اضلاع میں جس طرح ایک ہی عہدہ دار عدالت کو اختیارات دیوانی وفوجداری حاصل ہیں اس طرح بلدہ حیدرآباد میں عدالت دیوانی بلدہ کے ناظم کو اختیارات فوجداری حاصل نہیں ہیں۔ بلکہ علٰحدہ عدالت جو "عدالت فوجداری بلدہ" کے نام سے قائم ہے اس عدالت کے اختیارات ناظم ضلع کے فوجداری اختیارات کے مساوی ہیں۔ البتہ

مقدمات کی سپردگی یا مرافعہ مجلس عالیہ عدالت ہی میں ہوتا ہے کسی عدالت سشن میں نہیں ہوتا

عدالت دار القضاء بلدہ یہ عدالت اسلامی طریقہ انصاف رسانی کے زمانہ سے اب تک برابر قائم ہے پہلے اس کو اہم فوجداری اختیارات بھی حاصل تھے لیکن اب یہ اختیارات حاصل نہیں اور مقدمات ذیل میں اس کو اختیار سماعت حاصل ہے جبکہ فریقین بلدہ یا ضلع اطراف بلدہ میں سکونت رکھتے ہوں جس میں سکندرآباد بھی شامل ہے اور مسلمانوں کو مسائل شخصی کی سماعت کا حق سکندرآباد کی انگریزی عدالت کو نہیں ہے۔

ازدواجی مقدمات مثل مہر، ترکہ، ثبوت نسب، حصانت، طلاق و خلع، ان معاملات میں اختیارات غیر محدود حاصل ہیں۔ ان تمام مقدمات میں ناظم کی تجویز کا مرافعہ عدالت عالیہ میں ہوتا ہے مذکورالصدر مقدمات میں فریقین ہنود ہوں تو مقدمات عدالت دیوانی بلدہ میں رجوع کئے جاتے ہیں

اگر فریقین مقدمہ اضلاع میں سکونت رکھتے ہوں تو مقدمہ اسی ضلع کے ناظم کے پاس رجوع کیا جائے گا۔

محکمہ انعام دریافت انعامی کی کارروائیاں اس قدر زیادہ نہیں کہ ان کے لئے خاص کر علحدہ محکمہ قائم کرنا ضروری خیال کیا گیا اور نظامت بندوبست کی طرح نظامت عطیات قائم ہوئی۔ اس محکمہ کے اضلاعی عہدہ دار، عہدہ داران مال ہی ہیں، پس عہدیداران مال کو عدالتی اختیارات صرف بہ صیغۂ انعامی حاصل ہیں کسی اور معاملہ یا حق کے تصفیہ کے لئے عہدہ داران مال کو عدالتی اختیارات حاصل نہیں۔ تحصیلدار کے اختیارات نسبت دریافت وراثت و دریافت انعامی گشتی ۱۳۳۱ف سے لے لئے گئے۔

انعامی تحقیقات اور دریافت وراثت کے اختیارات صرف تعلقدار، صوبہ دار، اور ناظم عطیات کو حاصل ہیں۔ ہر کارروائی کی جو کسی عہدہ دار کے قابل سماعت قرار دی گئی ہو کامل سماعت اسی عہدہ دار سے ہونی چاہئے اور اعلیٰ عہدہ دار اپنے فرائض عہدہ دار تحت کے سپرد نہیں کرسکتا۔

جس طرح اور عدالتی کارروائیوں میں کیا جاتا ہے۔ تحقیقات انعامی و دریافت وراثت کے علاوہ اور کارروائیاں جو محکمہ انعام سے متعلق ہوں محکمہ انعام میں ہی مسموع اور فیصل ہونگی مثلاً کسی انعامی معاش دار کی لی ہوئی تبنیت کو منظور کرنا یا تبنیت لینے کی اجازت دینا۔

قابض آراضی اور انعام دار کے مابین اراضی انعام کی نسبت ان کے حقوق کا تصفیہ جبکہ قبضہ زائد از تیس سال ہو۔

بعض عطا موقوعہ جاگیر معاشہائے عطیہ سلطانی)

عہدیداران انعام کے اختیارات

تعلقدار ضلع کو تحقیقات انعامی میں حسب ذیل اختیارات حاصل ہیں۔

(۱) اراضی انعام و اراضی مقطعہ کی دواماً بحالی تا بحد

۵۰ ایکر خشکی ۱۳ ایکر تری اور مجموعی محاصل سالانہ ۱۰۰ روپیہ

(۲) اراضی انعام و اراضی مقطعہ کی بحالی تا دو پشت

۷۵ ایکر خشکی ۵ ایکر تری اور مجموعی محاصل سالانہ دو سو (۲۰۰) روپیہ

(۳) اراضی انعام و آراضی مقطعہ کی بحالی تا حیات

۱۰۰ ایکر خشکی ۱۰ ایکر تری اور مجموعی محاصل سالانہ ۲۵۰ روپیہ

نقدی معاش کے متعلق ۱۰۰ روپیہ سالانہ تک

تعلقدار ضلع کو تحقیقات وراثت میں حسب ذیل اختیارات حاصل ہیں۔

(۱) آراضی انعام و اراضی مقطعہ بلحاظ منتخب

(۲) نقدی معاش کے متعلق (۲۰۰) روپیہ سالانہ تک

(۳) پس مقطعہ میں اگر ہارو ائلی محاصلی ۱۰۰۰ روپیہ سالانہ تک

(۴) جاگیر وسمتان و مقطعہ بلا پن و اگر ہار بلا پن محاصلی پانسو (۵۰۰) سالانہ تک۔

گشتی نشان (۱۰) ۱۳۳۸ف

صوبہ دار کو تحقیقات انعامی میں حسب ذیل اختیارات حاصل ہیں :-

(۱) اراضی انعام و اراضی مقطعہ کی صورت میں تعلقدار ضلع کے اختیارات سے متجاوز اور سالانہ (۳۰۰) محاصل تک۔

(۲) نقدی معاش کی صورت میں تعلقدار ضلع کے اختیارات سے متجاوز اور (۲۰۰) دوسو روپیہ سالانہ تک

(۳) موضع مقطعہ کی صورت میں خواہ پن مقطعہ ہو یا پن اگرہار یا اُملی محاصلی (۱۰۰۰) ہزار سالانہ تک۔

تحقیقات وراثت میں حسب ذیل اختیارات حاصل ہیں۔

(۱) اراضی انعام و آراضی مقطعہ کے متعلق تعلقدار ضلع کے اختیارات سے متجاوز اور سالانہ محاصلی پانچ ہزار تک

(۲) نقدی معاش کے متعلق۔

تعلقدار ضلع کے اختیارات سے متجاوز اور پانسو سالانہ تک

(۳) موضع مقطعہ کی صورت میں خواہ پن مقطعہ ہو یا پن اگرہار یا اُملی تعلقدار ضلع کے اختیارات سے متجاوز اور محاصلی (۲۵۰۰) روپیہ سالانہ تک

(۴) جاگیر وسمستان و مقطعہ بلاپن و اگرہار بلاپن کے متعلق تعلقدار کے اختیارات سے متجاوز اور محاصلی (۱۰۰۰) روپیہ سالانہ تک

ناظم عطیات کو تحقیقات انعامی میں حسب ذیل اختیارات حاصل ہیں :-

(۱) اراضی انعام و اراضی مقطعہ کے متعلق

صوبہ دار کے اختیارات سے متجاوز غیر محدود

(۲) نقدی معاش کے متعلق

صوبہ دار کے اختیارات سے متجاوز اور پانسو روپیہ سالانہ تک

(۳) موضع مقطعہ کے متعلق خواہ پن مقطعہ ہو یا پن اگرہار یا اُملی
صوبہ دار کے اختیارات سے متجاوز اور محاصلی (۲۰۰۰) روپیہ سالانہ تک

(۴) جاگیر و سمستان و مقطعہ بلا پن و اگرہار بلا پن کے متعلق محاصلی ہزار روپیہ سالانہ تک۔

ناظم عطیات کو تحقیقات وراثت میں حسب ذیل اختیارات حاصل ہیں :-

(۱) اراضی انعام و اراضی مقطعہ کے متعلق
صوبہ دار کے اختیار سے متجاوز اور غیر محدود

(۲) نقدی معاش کے متعلق
صوبہ دار کے اختیارات سے متجاوز اور غیر محدود

(۳) موضع مقطعہ کے متعلق خواہ پن مقطعہ ہو یا پن اگرہار یا اُملی
صوبہ دار کے اختیارات سے متجاوز اور غیر محدود

(۴) جاگیر و سمستان و مقطعہ بلا پن و اگرہار بلا پن کے متعلق
صوبہ دار کے اختیارات سے متجاوز اور محاصلی (۲۵۰۰) روپیہ سالانہ تک

گشتی نشان ۱۰ ۱۳۳۸ ف

مفصلہ ذیل ابواب کی بحالی یا شرکت خالصہ کا حکم دینا محکمہ انعام کے اختیارات سے خارج ہے۔ گشتی نشان ۱۰ ۱۳۳۸ ف۔

(۱) جاگیرات اور سمستان کے متعلق جب محاصل ہزار روپیہ سالانہ سے زائد ہو۔ ماہوار جو بعاوضہ جاگیر اور سمستان جاری ہو

(۲) مقطعہ جات سے متعلق جن کا محاصل بعد وضع لوکلفنڈ و حصہ سرکار دو ہزار روپیہ سالانہ سے زیادہ ہو آمدنی کا تعین واقعی آمدنی کے لحاظ سے ہوگا نہ کہ کاغذات دیہی کے اندراجات کے لحاظ سے

(۳) انعام از قسم نقدی جب اُس کی مقدار پانسو روپیہ سالانہ سے زائد ہو۔

(۴) ایسے سمستان یا جاگیر کی وراثت و تبنیت کی منظوری و نامنظوری جس کا محاصل (۲۵۰۰) روپیہ سالانہ سے زائد ہو۔

عہدہ داران انعام فیصلوں کی ناراضی سے مرافعہ اُس عہدہ دار کے عین بالا عہدہ دار کے پاس پیش ہو سکے گا یعنی تعلقدار کی تجویز کا صوبہ دار کے پاس اور صوبہ دار کی تجویز کا ناظم عطیات کے پاس۔ اب ناظم عطیات کا فیصلہ بہ صیغہ مرافعہ ثانی قطعی ہے۔ البتہ بہ صیغہ مرافعہ اولیٰ کوئی کارروائی جو ناظم عطیات سے فیصل ہوئی ہو بہ صیغہ مرافعہ اجلاس متفقہ میں پیش ہو سکے گی اور جو فیصلہ نظامت عطیات سے بہ صیغہ مرافعہ ثانی قطعی ہوا ہو اس کی ناراضی سے نگرانی بھی اجلاس متفقہ میں ہو سکے گی۔

ناظم عطیات اور اجلاس متفقہ کے فیصلہ کی ناراضی سے تجویز ثانی بھی اندرون ۳۰ یوم چاہی جا سکتی ہے۔

وائی۔ ویرو پاکشیا پٹیل بی۔ اے۔ ال ال۔ بی (عثمانیہ)

معصوم اشارے

وہ موسمِ گل اور وہ دریا کے کنارے — سبزہ پہ جہاں لوٹتے پھرتے تھے شرارے
دوشیزۂ فطرت کے وہ دلسوز نظارے — جان لیوا تھے اس پر ترے معصوم اشارے
ہاں - یاد ہیں اب تک مجھے معصوم اشارے

دریا کا نکھار اور وہ پُرکیف بہاریں — وہ منظرِ پرلطف وہ جنت کی ہوائیں
انوارِ محبت کی ضیا پاش فضائیں — جیسے کسی "مہ پارہ" کی بیداد ادائیں
ہاں - یاد ہیں اب تک مجھے معصوم اشارے

وہ لرزشِ صہبائے محبت کی کہانی — وہ ساغرِ مے محبت رنگین کی نشانی
وہ فطرتِ شاعر کے لئے طور سراپا — تھی حشر بدامان کسی کافر کی جوانی
ہاں - یاد ہیں اب تک مجھے معصوم اشارے

دزدیدہ نگاہیں وہ شرربار نگاہیں — بدمست نگاہیں وہ گہربار نگاہیں
تو مست مے ناز تھی میں دیدۂ حیرت — بے تاب نگاہیں وہ سحرکار نگاہیں
ہاں - یاد ہیں اب تک مجھے معصوم اشارے

نظروں میں تری رقصِ شرر دیکھ رہا تھا — مخمور نگاہوں کا اثر دیکھ رہا تھا
مانا کہ مجھے تابِ نظارا نہ تھی لیکن — میں دیکھنے والے کی نظر دیکھ رہا تھا
ہاں - یاد ہیں اب تک مجھے معصوم اشارے

ابرو کے اشاروں سے کھلا بابِ تکلم   آواز تری گویا ترنم ہی ترنم
وہ محفلِ عشرت کے لئے صبح بہاراں   بارِ غمِ دنیا پہ ترا ایک تبسم

ہاں - یاد ہیں اب تک مجھے معصوم اشارے

اک عشق و جوانی کا جگر سوز فسانہ   ہیں دردِ مجسم مجھے رونے کا بہانہ
ہر چند کہ وہ بھول گئے اے دلِ عارفؔ   میں بھول نہیں سکتا محبت کا زمانہ

ہاں - یاد ہیں اب تک مجھے معصوم اشارے

شاہ یعقوب عارفؔ (سال اول)

"صدرِ جلسہ"

(اشخاص ڈرامہ)

(۱) مرزا افتخار الدین (المعروف بہ مرزا جی) . . . ایک بھولے بھالے جاگیردار
(۲) قمر جہاں . . . . مرزا جی کی نوجوان بیوی
(۳) شیخو . . . . ملازم

وقت ڈرامہ . . . . . . زمانہ حال
مقام ڈرامہ . . . . . مرزا جی کا مکان

(مرزا جی کا مکان ۔ بیوی مشین چلا رہی ہیں اور میاں حقہ پی رہے ہیں ۔ مشین اور حقہ کی آواز باری باری سے سنائی دیتی ہے ۔ اس کا مجموعی دوران میں سکنڈ ہوگا)

مرزا جی ۔ بیوی ۔ تم برا نہ مانو تو ہم ایک بات کہیں ۔

قمر ۔ سرکار میں بلا وجہ برا کیوں ماننے لگی ۔ کہئے ۔

مرزا جی ۔ نہیں ہمیں یقین ہے کہ تم بگڑ جاؤ گی ۔

قمر ۔ یہ آپ نے خوب کہا ۔ بھئی اگر بات بُری ہے تو ظاہر ہے کہ ہر ایک بگڑے گا تو پھر آپ ایسی بات ہی کیوں کرتے ہیں جو کسی کو بری لگے ۔

مرزا جی ۔ بیوی تمھیں ہماری جان کی قسم کہو بُرا تو نہیں مانو گی ۔

قمر ۔ میں یہ کیسے کہہ سکتی ہوں ۔ پہلے آپ بتائیے تو کہ وہ ہے کیا ۔

مرزا جی ۔ پہلے تم وعدہ کرو کہ بُرا نہیں مانو گی ۔

قمر ۔ یہ خوب حجت ہے ۔ اچھا صاحب بُرا نہیں مانیں گے ۔

مرزا جی ۔ تو کہیں ؟

قمر ہاں ہاں کہئے ۔

مرزا جی ۔ دیکھو بعد میں ....

قمر ۔ (بات کاٹ کر) بس اپنے ....

مرزا جی ۔ (بات کاٹ کر) اچھا تو سنو ۔ بات یہ ہے کہ ..... ہاں ۔ ہاں .... آں .... آں واللہ تم برا مانو گی ۔

قمر ۔ آپ کو تو دل لگی سوجھی ہے ۔ جائیے اور ہمیں کپڑے سینے دیجئے ۔

مرزا جی ۔ خدا کی قسم صرف اتنا سن لو ۔

قمر ۔ اسے ہے مجھے آپ قسمیں وسمیں تو نہ دیجئے جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہہ دیجئے ۔

مرزا جی ۔ مگر تم مانو گی نہیں ۔

قمر ۔ تو پھر نہ کہئے ۔

مرزاجی ۔ ہماری اچھی بیوی ذرا سن بھی لو ۔ اچھا تم مشین تو روکو (مشین رک جاتی ہے) بات یہ ہے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے مولانا حکمت عالم آئے تھے ۔

قمر ۔ یہ حکمت عالم کون بلا ہیں ۔

مرزاجی ۔ ارے وہی جو ہمیشہ میرے پاس آتے رہتے ہیں نا تمھیں یاد ہوگا ایک مرتبہ میں نے تم سے کہا تھا کہ وہ میرے اٹاوہ کے دوست ہیں ۔

قمر ۔ آہا میں سمجھ گئی ۔ اچھا ـــ تو ۔

مرزاجی ۔ تو وہ کہتے تھے کہ جہانگیر نگر میں ایک یتیم خانہ بنایا جانے والا ہے ۔

قمر ۔ یتیم خانہ ! جی سارا مطلب میری سمجھ میں آگیا ۔ اب رہنے بھی دیجئے ۔

مرزاجی ۔ ارے تم سنو تو سہی ۔

قمر ۔ اب آپ کیوں سناتے ہیں بغیر سنے ہی سب سمجھ گئی ۔

مرزاجی ۔ ذرا تم صبر تو کرو ۔

قمر ۔ بس بس میں سمجھ گئی اب آپ کیوں .....

مرزاجی ۔ (بات کاٹ کر) ابھی تم نے سنا ہی نہیں سمجھی کیا ہوگی ۔

قمر ۔ جی صرف ایک اشارہ کافی ہے ۔ میں آپ کے دوستوں سے خوب واقف ہوں ۔ اور حکمت عالم کو تو اچھی طرح جانتی ہوں ۔ وہ آئے ہوں گے چندہ کے لئے بس یہی اور کیا ۔ کیوں ہے نا ایسا ۔

مرزاجی ۔ بھئی تم نے تو غضب ہی کر دیا ۔ ارے وہ آئے تھے اس قدر کہنے کہ اس یتیم خانہ کے سلسلہ میں وہ ایک جلسہ کرنیوالے ہیں جس میں چندہ کی اپیل کی جائے گی ۔

قمر ۔ لیجئے نا وہی ہوا جو میں نے کہا تھا ۔ فرق صرف اتنا پڑا کہ چندہ کا نام میں نے شروع میں لے لیا اور آپ نے آخر میں ۔ مگر مطلب تو دونوں کا ایک ہی ہے نا ۔

مرزاجی ۔ پہلے تم ہماری بھی تو سنو ۔ تم تو اپنی ہی کہے جا رہی ہو ۔
قمر ۔ اچھا بھئی کہیئے ہمیں اس سے کیا غرض ۔
مرزاجی ۔ یہ لو تم تو بگڑنے لگیں ۔
قمر ۔ اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے ۔ ہم ہی جھوٹے سہی ۔
مرزاجی ۔ واللہ تمھیں میری جان کی قسم غصہ نہ کرو ۔ اس سے ہمیں رنج پہنچتا ہے ۔ میں تو تمھیں ایسی بات سناؤں کہ تم پھڑک جاؤ ۔
قمر ۔ آج تک آپ نے کوئی ایسی بات ہی نہیں سنائی پھر اعتبار کیسے کیا جا سکتا ہے ۔
مرزاجی ۔ اچھا اب سنو ۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ حکمت عالم چاہتے ہیں کہ یتیم خانہ کی جو کمیٹی بنی ہے پہلے اس کا ایک جلسہ ہو اور وہ جلسہ ہماری ہی کوٹھی میں ہو ۔
قمر ۔ سرکار مجھ سے خاموش بھی نہیں رہا جاتا ۔ کہوں تو مشکل اگر خاموش رہوں تو مشکل ۔
مرزاجی ۔ کہو بیوی ۔ ہم تمھاری باتوں کا بُرا نہ مانیں گے مگر تمھارے غصہ سے مجھے دلی تکلیف ہوتی ہے ۔ میں تو تمھیں ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہوں ۔ ہاں تو کہو ۔
قمر ۔ سرکار کہنا یہ ہے — یہ تو آپ کو معلوم ہے ہی کہ آج کل کا زمانہ بڑا نازک ہے ۔
مرزاجی ۔ یہ تم بالکل ٹھیک کہتی ہو ۔ اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے ۔
قمر ۔ اس لئے آجکل جلسوں ولسوں میں آپ کا حصہ لینا کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا ۔
مرزاجی ۔ مگر کس قسم کے جلسے ۔
قمر ۔ ہر قسم کے ۔
مرزاجی ۔ بیوی ذرا تم غور تو کرو یہ کیسا جلسہ ہے ۔ یتیموں کی امداد غریبوں کی مدد ارے اس پر کس کو اعتراض ہو سکتا ہے اس سے تو ہر ایک خوش ہوگا اور اس کے لئے تو خدا و رسول کے احکام موجود ہیں مجھے اس وقت وہ آیت یاد نہیں آرہی ہے وہ ہے آں .... آں ....

قمر ۔ میں یہ سب جانتی ہوں مگر پھر بھی . . . . . .

مرزاجی ۔ نہیں بیوی تم اطمینان رکھو۔

قمر ۔ نہیں سرکار میرے دل میں تو کچھ شبہ سا پیدا ہوگیا ہے ۔ میں تو جانوں یہ سب دعوتیں اُڑانے یا محض خوش گپی کرنے کے لئے ہو رہا ہے ۔

مرزاجی ۔ بیوی تم مولانا حکمت عالم کے متعلق تو کم از کم یہ نہیں کہہ سکتیں ۔ ارے وہ تو بڑے بڑوں تک رسائی رکھتے ہیں ۔ ان کو اس کی کیا پرواہ ۔ وہ تو میرے دوست اور خیر خواہ ہیں بھلا ان کو اب تک کیا ملا ہے جواب کچھ مل جائیگا ۔

قمر ۔ تو کہئے معاملہ صرف اتنا ہے کہ جلسہ ہماری کوٹھی میں ہو ۔

مرزاجی ۔ نہیں کچھ اس سے زیادہ ۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ جس دن کمیٹی ہو اس دن تم . . . تم . . . . . . تم . . . . . .

قمر ۔ میں حکمت عالم کے سامنے آجاؤں ۔

مرزاجی ۔ نہیں جی یہ نہیں بلکہ تم کچھ چار پانی کا انتظام کردو ۔

قمر ۔ میری کہی ہوئی بات اگر کبھی غلط ہوجائے تو ہاتھ قلم کروادوں ہاتھ ۔ کہئے پیشین گوئی صحیح نکلی کہ نہیں ۔ میں جب ہی سمجھ گئی تھی کہ دعوت ضرور ہو گی اور وہی آپ نے بھی کہا ۔

مرزاجی ۔ چار پلادینا بھی کوئی دعوت ہے اور اگر ہے بھی تو بیوی تمھیں تو ضرور حامی بھرنی پڑیگی ۔

قمر ۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ ایک لمبا چوڑا سلسلہ ہے ۔ نہ معلوم کس نوبت پر چل کر ختم ہو ۔

مرزاجی ۔ بیوی بالکل چھوٹی سی چیز ہے اس میں ہوتا ہوا تا ہی کیا ہے ۔ ذرا سی تکلیف ہوگی البتہ بندو بست کردو ۔

قمر ۔ تو کہئے کہ یہ ساری خوشامد اسی کی تھی ۔

مرزاجی ۔ اس زمانہ میں تو بیوی کی خوشامد کرنی ہی پڑتی ہے اور پھر وہ بھی تم جیسی بیوی کی تو . . . .

قمر - (خاص انداز میں) اوں —— ہوں -

مرزاجی - بخدا جب سے مولانا نے ذکر کیا ہے میں بے حد خوش ہوں - بیوی وہ کہہ رہے تھے کہ اس میں بڑا نام ہوگا -

قمر - اب آپنے نمک مرچ لگانا شروع کردیا -

مرزاجی - نہیں نہیں واقعی وہ کہہ رہے تھے کہ اس میں بہت نام ہوگا -

قمر - سرکار کیا نام ہوگا اور نام کو لیکر کیا کیجئے گا -

مرزاجی - ارے تم نہیں سمجھتیں - آجکل نام اور شہرت کی خاطر لوگ ہزاروں روپیہ خرچ کردیتے ہیں - اب یہی دیکھ لو نا گذشتہ سال کچی باؤلی کے مدرسہ کے سلسلہ میں شیخ صاحب نے بس اتنا کردیا کہ تعلقدار صاحب سے اجازت دلوادی ابتک لوگ ان ہی کا ذکر کرتے رہتے ہیں - اب تو وہ مشہور ہوگئے ہیں -

قمر - چھوڑیئے بھی ان باتوں کو - ہمارے ابا - خدا جنت نصیب کرے ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے - "میں بہت مشہور ہوں - تمام شہر والے مجھے جانتے ہیں" اللہ بخشے دادا جان کو وہ تو ان سے زیادہ شہرت رکھتے تھے - دونوں نے —— توبہ کرکے کہتی ہوں —— ایڑیاں گھس گھس کے جان دیدی مگر تحصیلداریاں نہ ملنی تھی نہ ملیں کہاں گئی وہ شہرت اور نام - یہ تو سب دکھاوے کی باتیں ہیں -

مرزاجی - بیوی صاحبہ وہ زمانہ اور تھا یہ اور ہے - اس وقت تو فقط یہی دیکھا جاتا ہے کہ لوگ کس کو زیادہ جانتے ہیں - سچ ہے اگر کسی کا نام اشتہار ہی کے سلسلہ میں ایک سے دو مرتبہ اخبار میں چھپ جائے تو سمجھ لو کہ دنیا اس کو جاننے لگی - ہر ایک اس کو لائق اور نیک سمجھنے لگا - کوئی دعوت ایسی نہو جس کے رقعے اس کے پاس نہ آئیں - بخدا جدہر وہ چلا جائے لوگ آنکھیں بچھانے لگیں - دیکھتی نہیں جھنو میاں کا نواسہ —— ارے ہمارے سامنے کا لونڈا —— اپنے باپ دادا سے زیادہ نیک نام ہوگیا

جہاں کوئی مشکل آن پڑی اور لوگ اس کے پاس پہنچے ۔ یہ سب کیوں اس لئے کہ اس نے کام کر کے نام پیدا کیا ۔

قمر ۔ تو میں یہ پوچھتی ہوں کہ اس میں آپ کا کیا نام ہوگا ۔

مرزاجی ۔ اچھا تو تمھیں تفصیل سے بتائیں ۔ لو وہ بھی سن لو ۔ نام یوں ہوگا کہ سب سے پہلے تو جتنے رضاکار ہیں ہمیں جاننے لگیں گے ۔

قمر ۔ شاید دعوت کی وجہ سے ۔

مرزاجی ۔ دعوت کی وجہ سے کیوں ۔ ہم سے جب وہ ملیں گے تو پہچاننے لگیں گے یا نہیں ۔ دوسرے یہ کہ جتنے اشتہارات ہوں گے ان میں میرا نام چھپے گا ۔ اخبارات میں مضامین آئیں گے ۔ تقریروں میں میرا شکریہ ادا کیا جائیگا ۔ خود حکمت عالم سب سے کہتے پھریں گے ۔ عہدہ داروں کو معلوم ہوگا ۔ ہر جگہ یہی چرچا ہوگا کہ جلسہ اور یتیم خانہ کے سلسلہ میں مرزا صاحب بہت محنت سے کام کر رہے ہیں ۔ ہر طرف شہرت ہوجائیگی اور کیا چاہیئے ۔

قمر ۔ مگر سرکار اپنے گھر میں جلسہ کر دینا تو کوئی محنت کا کام نہیں اس کے لئے تو ہر ایک تیار ہوگا ۔

مرزاجی ۔ یہ لو تمھاری اس حجت میں اصل بات تو میں بتلانا ہی بھول گیا ۔

قمر ۔ اس کے علاوہ اور بھی کوئی بات ہے جو کہنی ہے ۔

مرزاجی ۔ ہاں ہاں اصل بات تو وہی ہے ۔

قمر ۔ اچھا تو فرمائیے ۔

مرزاجی ۔ وہ ہے یہ کہ آج سے چار چھ روز بعد ایک بڑا جلسہ ہونیوالا ہے ۔ واللہ بیوی ۔ اتنا بڑا جلسہ کہ میں نے تو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ۔

قمر ۔ اب آپ جھوٹی سچی باتیں نہ بنائیے یعنی وہ جلسہ ابھی ہوا نہیں اور آپ کہنے لگے ..... کہ .....

مرزاجی ۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بہت بڑا جلسہ ....

قمر ۔ (بات کاٹ کر) جی ہاں بڑا جلسہ —— میں سب سمجھ گئی ۔ کتنا بڑا جلسہ ہوگا۔ شاید پہاڑ کے برابر ٹھیک ہے نا ۔

مرزاجی ۔ مذاق نہیں واقعی بہت بڑا جلسہ ہوگا قسم ہے مجھے ابھی سے یہ محسوس ہورہا ہے کہ اس دن سارے شہر کے لوگ ٹوٹ پڑیں گے آہ آدمیوں کا ایک سمندر نظر آئیگا ۔

قمر ۔ خیر وہ تو ہوگا میں یہ پوچھتی ہوں کہ اس سے آپ کو کیا خاک فائدہ ہوگا ۔

مرزاجی ۔ یہ لو پھر بات میں بات نکل آئی اور میں جو کہنا چاہتا تھا وہ بھول ہی گیا۔

قمر ۔ آپ جب اتنے بھولکڑ ہوگئے ہیں تو جلسہ ....

مرزاجی ۔ (بات کاٹ کر) تم ٹوکو نہیں پہلے سن لو ہاں تو میں اس جلسہ میں تقریر کروں گا۔

قمر ۔ کیا کہا۔

مرزاجی ۔ ہاں ہاں جی تقریر کروں گا ۔

قمر ۔ اے ہے میرے کان مجھے کہیں دھوکہ تو نہیں دیرہے ہیں ۔

مرزاجی ۔ اجی ابھی اور سنو ۔ مرزاجی اول تو بولتے نہیں مگر جب بولنے پر اُتر آتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا بہا چلا جارہا ہے ۔

قمر ۔ ہم نے تو کبھی آپ کو تقریر کرتے نہیں سُنا ۔

مرزاجی ۔ اس میں کیا ہے اب سن لینا ۔

قمر ۔ اچھا ہم بھی دیکھیں گے ۔

مرزاجی ۔ ہاں ہاں گھوڑا میدان سامنے ہے ۔ واللہ ہم تقریر کریں گے اور تقریر بھی ایسی کہ واہ —— لوگ عش عش کرجائیں —— اچھا تم نے یہ بھی سنا ہم ہی اس جلسہ کے صدر بھی ہوں گے ۔

قمر ۔ ہائیں ۔

مرزا جی ۔ جی ہاں صدر۔ آپ نے سمجھ کیا رکھا ہے ۔ مرزا جی جو ٹھیرے مرزا جی —

قسمر ۔ سرکار میرا تو خیال ہے کہ آپ کے ساتھ کچھ مذاق کیا جا رہا ہے ۔

مرزا جی ۔ تم نے تو مذاق کی بھی ایک ہی کہی ۔ حکمت عالم اور مجھ سے مذاق کریں !!

اور وہ بھی ایسے اہم معاملات میں ! بیوی ہوش کے ناخن لو ۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو!!!

قسمر ۔ آپ مانیں یا نہ مانیں ہمیں جو چیز کھٹکتی ہے وہ بس زبان پر آ ہی جاتی ہے کیا کریں

مجبور ہیں ۔

مرزا جی ۔ تم بات کرنے سے پہلے سوچ لیا کرو تم نے وہ مقولہ تو سنا ہی ہوگا کہ دیوار کے بھی

کان ہوتے ہیں ۔ ایسا جملہ ہی زبان پر کیوں لاؤ جس سے کسی کو برا معلوم ہو ۔

قسمر ۔ کوئی بلا وجہ اپنے سے منسوب کرے تو اس میں میرا کیا قصور ہے میں نے تو کسی کا

نام نہیں لیا ۔

مرزا جی ۔ حکمت عالم کا ۔ . . . . . .

قسمر ۔ (بات کاٹ کر) میں نے تو حکمت عالم کا نام نہیں لیا تھا وہ تو آپ نے جڑ دیا ۔

مرزا جی ۔ میں نے جڑ دیا ؟ وہی اس کے روح رواں ہیں ظاہر ہے سارا گمان ان ہی کی

طرف جائے گا ۔

قسمر ۔ جایا کرے ۔

مرزا جی ۔ اچھا خیر چھوڑو ان تذکروں کو ۔ یہ بتاؤ کہ جلسہ میں جب چندہ کے لئے اپیل ہو تو میں

کیا کروں ۔

قسمر ۔ جو سب کرتے ہیں وہی آپ بھی کریں ۔ یہی کہ بس خاموش رہیں ۔

مرزا جی ۔ یہ تم نے خوب کہا جیسے دوسرے خاموش ہی رہیں گے ۔ ارے وہاں تو ہر ایک

اپنی بساط کے موافق چندہ دے گا ۔

قسمر ۔ تو آپ ان جھگڑوں میں پڑتے ہی کیوں ہیں ۔

مرزاجی ۔ بھئی اب ہم تمھیں کس طرح سمجھائیں ۔ کہہ تو رہے ہیں کہ ہمارا جانا ضروری ہے اور ہم ضرور جائیں گے ۔

قمر ۔ ایسا ہی اگر ضروری ہے تو چندہ کی اپیل کے بعد جائیے ۔

مرزاجی ۔ بیوی تم نے تو کمال کر دیا ۔

قمر ۔ اے ہے اس میں کمال کی کیا بات ہے ۔ لوگ دعوتوں میں دیر سے آتے ہیں اگر آپ جلسہ میں دیر سے چلے جائیں تو کون سا جرم یا گناہ ہو جائیگا ۔

مرزاجی ۔ تم تو غور کرنا چاہتی ہی نہیں ارے یہ بھی تو سوچو کہ میں اس جلسہ کا صدر ہوں ۔ دیر سے کس طرح جاؤں گا ۔ اور اگر دیر سے جاؤں گا تو جلسہ شروع ہی کیسے ہوگا ۔

قمر ۔ سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ آپ اس سے کسی طرح پیچھا چھڑا لیجئے ۔

مرزاجی ۔ بیوی بخدا نیک کام کرنے سے نہ روکو ۔ دین بھی خراب اور دنیا بھی خراب ۔

قمر ۔ اب آپ جائیں اور آپ کا جلسہ اور حکمت عالم ۔ مجھ سے کچھ نہ کہیے ۔

مرزاجی ۔ تم تو بگڑنے لگیں ۔ بتاؤ ہم نے تمھارے مشورہ بغیر کون سا کام کیا ہے جو یہ کریں گے ۔

قمر ۔ تو پھر میں جو کہتی ہوں اس پر عمل کیجئے گا ۔

مرزاجی ۔ نہیں بیوی تمھیں میرے سر کی قسم ایک مرتبہ پھر غور کر لو دیکھنا معاملہ بہت چھوٹا ہے مگر اس میں بے حد شہرت ہو گی اب تم ہی دیکھ لو نا کہ شہر کے بچہ بچہ کی زبان پر میرا نام ہوگا ۔

قمر ۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں خواہ مخواہ ہر ایک آپ ہی کا وظیفہ پڑھتا رہے گا ۔

مرزاجی ۔ یقین نہ آئے تو کہو ۔ حلفیہ کہتے ہیں جب تو اطمینان ہوگا ۔

قمر ۔ اچھا صاحب ہوگا ۔ اب آپ یہ فرما دیجئے کہ چاہتے کیا ہیں ۔

مرزاجی ۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ آٹھ سو روپیہ جو میں نے حکمت عالم کو چندہ کے نام سے دئے ہیں اس میں دو سو روپیہ کا اضافہ کر کے پورے ایک ہزار کر دوں ۔

قمر ۔ آٹھ سو روپیہ کیسے ۔

مرزا جی ۔ میں نے حکمت عالم کو آٹھ سو روپیہ دئے ہیں ۔
قمر ۔ آپ نے ان کو آٹھ سو روپیہ دیدیئے !!! ۔
مرزا جی ۔ دے کیا دئے ہیں امانتاً رکھوادئے ہیں ۔ جلسہ کے دن وہ مجھے دے دیں گے
مگر میں یہ چاہتا ہوں کہ پورے ایک ہزار کے چندہ کا اعلان ہو ۔
مرزا جی ۔ میں آپ سے یہ پوچھتی ہوں کہ کیا آپ نے آٹھ سو روپیہ ان کو دیدے !!!
مرزا جی ۔ کہا نا کہ امانتاً رکھوائے ہیں ۔
قمر ۔ ہاں ہاں امانتاً ۔ مگر ان ہی کے پاس نا ۔
مرزا جی ۔ ہاں ہاں ان ہی کے پاس محفوظ ہیں ۔
قمر ۔ آپ نے غضب کردیا ۔
مرزا جی ۔ غضب کی کیا بات ہے ۔ یہ سمجھ لو کہ میرے ہی پاس رکھے ہیں ۔
قمر ۔ یہ آپ کو سوجھی کیا تھی ۔ کیا میں روپیہ رکھنے والی مرگئی تھی جو آپ نے ان کو دیدئے
یہ آخر آپ کو ہو کیا گیا تھا ۔
مرزا جی ۔ تمھیں خواہ مخواہ شبہ ہو رہا ہے ۔
قمر ۔ آپ شبہ ہی کو رو رہے ہیں میں پوچھتی ہوں آپ نے اتنی بڑی رقم ان کو کیوں دیدی ۔
مرزا جی ۔ بیوی تم ذرا میری بھی تو سنو ۔
قمر ۔ بس اب آپ سنا دنا رہنے دیجئے ۔
مرزا جی ۔ میری جان کی قسم پہلے پوری بات سن لو بعد میں جو کچھ کہنا ہے کہہ لینا ۔ اصل معاملہ
یہ تھا کہ چندہ کی رقم پہلے سے ان کے پاس نہ پہنچ جاتی . . . .
قمر ۔ آپ نے آٹھ سو روپیہ !! اور چندہ میں دیدے ۔
مرزا جی ۔ بھئی اگر میں رقم نہ دیتا تو وہ مجھے جلسہ کا صدر نہ بناتے ۔
قمر ۔ تو روپیہ حکمت عالم کو رشوت میں دیا گیا ۔ یہی نا ۔

مرزاجی ۔ رشوت کیوں ہوئی ۔ امانت ہے امانت ۔ جلسہ کے دن بلکہ اس سے کچھ پہلے ہی مجھے وہ واپس کردیں گے ۔ نہ دیتا تو وہ کبھی صدر نہ بناتے ۔

قمر ۔ نہ بناتے تو وہ اپنے گھر خوش رہتے ہمارا کیا بگڑتا ۔ یہ آپ پر آخر آفت کیا آئی تھی ۔ "صدر نہ بناتے" اور اب تو شاید آپ کو جاگیر یا خزانہ ملجائے گا ——— اور ان کو دینا کیا فرض تھا ۔

مرزاجی ۔ واہ یہ خوب کہا ۔ یعنی ہم آٹھ سو روپیہ کے لئے ان کا اعتبار نہ کرتے اور وہ ہم کو.....

قمر ۔ بس بس میں سمجھ گئی ۔ اب جھک جھک نہ کیجئے جب آپ نے ان کو آٹھ سو روپیہ اعتبار کرکے دے ئے ہیں تو اب اس میں مجھ سے مشورہ کرنے کی کیا ضرورت ہے ۔ صدر تو بن گئے نا ۔ اب کیا ہے سارا معاملہ ختم ہوگیا ۔

مرزاجی ۔ معاملہ کہاں ختم ہوا ۔ انھوں نے دو گھنٹے قبل کہلا بھیجا تھا کہ نواب ابراہیم خان بھی ایک ہزار چندہ دینے کے لئے تیار ہیں بشرطیکہ ان کو صدر بنایا جائے ۔ چونکہ حکمت عالم میرے پرانے دوست ہیں اس لئے وہ کہتے ہیں کہ اگر میں دو سو روپیہ اور بھیج دوں تو وہ مجھ ہی کو صدر بنائیں گے ۔

قمر ۔ سرکار اب بھی کچھ نہیں گیا ہے ۔ آپ ان کو خط لکھ دیجئے کہ بعض اسباب کی بنا پر آپ شریک جلسہ نہ ہوسکیں گے ۔

مرزاجی ۔ بیوی تم زمانہ کے نشیب و فراز سے واقف نہیں ہو ۔ تمھارا کیا ہے سارے شہر میں ڈنکہ پٹ جائیگا کہ مرزا صاحب دو سو روپیہ کی خاطر پیچھے ہٹ گئے ۔ ساری دنیا میں بدنامی ہوگی ۔

قمر ۔ اجی ہاں ہاں دو سو روپیہ کی خاطر صدر نہ بن سکے نہ سہی یہاں کسی کے باپ کا کچھ دھرا ہے ۔ سارے شہر میں ڈنکہ پٹ جائے گا تو ہمارا کیا جائے گا ۔ دنیا کو ماریئے گولی آپ ہمیشہ دنیا ہی کا رونا روتے ہیں ۔ دنیا نہ ہوئی عذاب جان ہوگئی ۔ اُٹھو تو دنیا کا ڈر ۔ بیٹھو تو دنیا کا ڈر ۔ کیا آپ نے دنیا کو بچوں کا کھیل بنا رکھا ہے ۔

مرزا جی ۔ بیوی دو دمڑی کی بات ہے اور تم بلا وجہ برہم ہوئی جا رہی ہو ۔ دو سو روپیہ اگر تم نہیں دینا چاہتیں تو نہ دو مگر بگڑتی کیوں ہو ۔

قمر ۔ میرا کیا ہے میں دئے دیتی ہوں آپ جانیں آپ کے حکمت عالم جانیں ۔ مجھے اس سے کیا (زور سے پاندان کھولتے ہوئے) یہ لیجئے سو سو کے دو نوٹ ۔ اب مجھ سے نہ کہئے گا ۔

مرزا جی ۔ تم خفا ہو کر دوگی تو ہم نہ لینگے ۔

قمر ۔ میں کیوں خفا ہونے لگی ۔ مجھے بھلا کیا سروکار ۔

مرزا جی ۔ بیوی تم کو میری جان کی قسم کہو خفا تو نہیں ہوئیں ۔

قمر ۔ بس کہہ دیا ایک مرتبہ . . . .

مرزا جی ۔ میری بیوی واللہ کہو تم خفا تو نہیں ہوئیں ۔

قمر ۔ بھئی اب ہمیں آپ چھیڑئے نہیں ۔ کپڑے سینے دیجئے ۔

مرزا جی ۔ اگر تم خفا ہو تو میں یہ روپیہ واپس کئے دیتا ہوں اور ان سے وہ آٹھ سو روپیہ بھی منگوا لیتا ہوں ۔

قمر ۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ اس میں آپ کی بدنامی ہوگی تو پھر میری وجہ سے کیوں ۔ . . . .

مرزا جی ۔ ہاں بدنامی تو ہوگی ۔ اب ہی دیکھو نا اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے تو میرے متعلق وہ کیا رائے قائم کریں گے ۔ اچھا اس میں تمھاری بھی سبکی ہے ۔ تم جس محفل میں جاؤ گی تم پر انگلیاں اٹھیں گی ۔ عورتیں کہیں گی ان ہی کے میاں نے دو سو روپیہ کا منہ دیکھ ذلت اٹھائی ۔

قمر ۔ تو آپ کی مرضی ۔ ساری ذمہ داری آپ ہی پر ہے ۔

مرزا جی ۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم خفا تو نہیں ہو ۔

قمر ۔ میری خفگی سے اب کیا ہونے والا ہے ۔ آپ یہ رقم بھجوا دیجئے ۔

مرزاجی ۔ واقعی تم ناراض تو نہیں ہو۔
قمر ۔ دیر ہو رہی ہو گی بھجوا دیجئے۔
مرزاجی ۔ تو میں شینجو کو بلاتا ہوں تم ہی اپنے ہاتھ سے اُس کو دیدو۔
قمر ۔ اب میں کیوں دوں آپ ہی دیدیجئے۔
مرزاجی ۔ نہیں بیوی تمھیں میری جان کی قسم اپنے مبارک ہاتھوں سے دو۔ بڑا نام ہوگا۔ شینجو
ابے او شینجو۔
شینجو ۔ جی سرکار (شینجو آتا ہے)
مرزاجی ۔ ادہر آ بھی تو۔
شینجو ۔ جی فرمائیے۔
مرزاجی ۔ دیکھنا وہ چوک کی مسجد ہے نا۔
شینجو ۔ جی۔
مرزاجی ۔ وہاں ہمارے دوست حکمت عالم صاحب رہتے ہیں۔ وہی جو آج صبح یہاں آئے تھے۔
شینجو ۔ جی ہاں جی ہاں۔
مرزاجی ۔ بیگم صاحبہ یہ دوسو روپیہ دے رہی ہیں انھیں دیدے اور ان سے کہدے کہ
۲۷ر تاریخ جلسہ کے لئے مناسب ہے۔ میرا نام وہ کل کے اخباروں میں بھی چھپوا سکتے
ہیں۔ اتنا کہدے وہ سب سمجھ جائیں گے بلکہ تو انہیں بلا لا۔
شینجو ۔ جی بہت مناسب۔
مرزاجی ۔ تاریخ کیا بتائیگا۔
شینجو ۔ ابھی جو آپ نے بتائی۔
مرزاجی ۔ کیا بتائی۔
شینجو ۔ جی اس مہینہ کی ۲۴ تاریخ۔

مرزاجی - تیرا سر ــ بے وقوف کہیں کا - میں کہہ رہا ہوں ۲۷ اور تو بکتا ہے ۳۰۔ تیرے داوا کے زمانہ میں ۳۰ تاریخ ہوتی ہو گی - ۲۷ تاریخ کہہ ۲۷ تاریخ ـ سُنا -

شیخو - ۲۷ تاریخ بہت ٹھیک -

قمر - رسید منگوالینا زیادہ مناسب ہو گا -

مرزاجی - بیوی ایک ہزار روپیہ کے لئے ان سے رسید کا مطالبہ تو مجھے کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔

قمر - آپ کی مرضی -

مرزاجی - ہاں ہاں حکمت عالم سے رسید مانگنا گویا خود سے رسید لکھوالینا ہوا - ہاں تو بھئی جلدی ہو آ -

شیخو - میں ابھی آتا ہوں (شیخو جاتا ہے)

مرزاجی - بیوی واللہ تم بڑی دل والی ہو - قسم ہے میں اس جلسہ میں اعلان کروں گا کہ یتیم خانہ کے قیام میں تم نے بھی ان تھک کوشش کی ہے اور تم کو نیک کاموں سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے -

قمر - غیر مردوں میں آپ میرا نام تو نہ لیجئے -

مرزاجی - کیوں نہ لوں اس میں چھپانے کی بات ہی کیا ہے - میں تو تمھارا نام ڈنکہ کی چوٹ لوں۔

قمر - لوگ ہنسیں گے آپ پر -

مرزاجی - خوب ہنسیں گے کیوں -

قمر - سب یہی کہیں گے کہ مرزا صاحب نے رقم بیوی سے خوشامد کر کے لی ہے -

مرزاجی - ارے کہنے بھی دو لوگوں کو - ان کے کہنے سے کیا ہوتا ہے اور کیا میں کسی سے ڈرتا ہوں مگر بیوی یہ تو کہو کہ اس جلسہ کے بعد جب تم کسی محفل میں جاؤ گی تو عورتیں تمھاری خوب آؤ بھگت کریں گی نا -

قمر - اب میں یہ کیا جانوں -

مرزا جی ۔ قسم ہے عورتوں کی مجلسوں میں ہر ایک تمھارا ہی ذکر کریگا تم جا بھر جاؤ گی تمھارے قدم چومے جائیں گے اور واللہ جب میں نکل جاؤں گا تو ہر مرد یہی کہے گا دیکھنا صاحب صاحب آرہے ہیں ۔ ہر ایک جھک جھک کر ملیگا اور چاروں طرف سے مبارکباد کے پیامات آئیں گے ۔

قمر ۔ اب ان فضول تذکروں کو ختم کیجئے ۔

مرزا جی ۔ فضول تذکرے کیسے ۔

قمر ۔ فضول اس طرح کہ ابھی جلسہ ہوا نہیں اور آپ لگے خواب دیکھنے ۔

مرزا جی ۔ اچھا بیوی کہو تو میرٹھ بڑے آکا کے پاس تار بھیج دیں ۔ ان کو تاریخ معلوم ہو جائے تو دورہ کے بہانہ سے یہاں آجائیں ۔ اچھا ہے جلسہ بھی دیکھ لینگے ۔ نہ معلوم پھر کب ایسا موقع ہاتھ آئے ۔

قمر ۔ آپ کی مرضی ۔ بلانا ہے تو بھابی جان کو بھی بلوا لیجئے ۔

مرزا جی ۔ یہ تم نے ٹھیک کہا ۔ دونوں کو آنا چاہئے ۔ میں ابھی تار دیتا ہوں ۔ عورتوں کے لئے بھی اچھا خاصا انتظام ہوگا واللہ بیوی میں اس سے بڑا خوش ہوا ۔ قسم ہے ابھی سے میری آنکھوں میں جلسہ کا نقشہ پھر رہا ہے ۔ بڑا شامیانہ ہوگا ہزارہا حاضرین.... بیچ میں ایک تخت ـــــ اور اس پر ہم بیٹھے ہوئے تقریریں کرنے کا حکم دیں گے اور چلمن کی اس جانب تم عورتوں کی صدر بنی ہوئی بیٹھی ہوگی ۔

قمر ۔ تو کیا عورتوں کی صدر میں بنوں گی ۔

مرزا جی ۔ اور نہیں تو کیا صدر کی بیوی صدرہ ۔ واللہ خوب لطف آئیگا ۔ بڑے آکا اس منظر کو دیکھ کر بہت خوش ہوں گے ۔

قمر ۔ سرکار یہ دیکھئے شیخو کیوں ہانپتا کانپتا آرہا ہے ۔

مرزا جی ۔ بے وقوف ہے حکمت عالم نے اس جلسہ کا اشتہار وغیرہ دیدیا ہوگا اس میں میرا نام پڑھکر

جامہ سے باہر ہوگیا ہے۔ بیوی دیکھنا تو کر بھی خوش ہیں۔ (شینو ھانپتا ہوا آتا ہے اور اسی طرح گفتگو کرتا ہے)

شینو ۔ سرکار سرکار۔

مرزاجی ۔ ابے دم کیوں نکلا جارہا ہے۔ کیا کوئی تیرا گلا دبا رہا ہے۔

شینو ۔ سرکار میں حکمت عالم صاحب . . . . . . کے گھر . . . . گیا تھا . . . .
انھوں نے رقم لے لی اور مجھے اپنی گاڑی میں بٹھلا کر اسٹیشن لے گئے . . . .
جہاں ان کے بچے . . . . وغیرہ . . . . پہلے ہی سے
. . . . موجود تھے . . . . جب ریل آگئی اور وہ اس میں . . . .
. . . . بیٹھ گئے تو مجھ سے کہا . . . . . . کہ . . . . ان کے پاس تار آیا
ہے . . . . . . انکی سالی کی شادی ہونیوالی ہے اس لئے وہ لکھنو جارہے
ہیں وہاں سے آنے کے بعد جلسہ کریں گے۔

مرزاجی ۔ کیا کہا۔

شینو ۔ جی ہاں اور وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ شادی کے دو چار روز بعد شاید انہیں پٹنہ اور پھر کلکتہ بھی جانا پڑے۔ چونکہ ان کے آنے میں بہت دیر لگے گی اس لئے اب ابھی اپنی تقریر تیار نہ کریں۔

قمر ۔ مجھے تو اس میں . . . .

مرزاجی ۔ بیوی پہلے مجھے بات کرلینے دو۔ حکمت عالم اس وقت کہاں ہیں۔

شینو ۔ سرکار وہ اپنے بال بچوں سمیت ریل میں بیٹھے ہیں جو شاید پانچ سات منٹ میں چھوٹ جائے۔

قمر ۔ میں نے آپ سے جب ہی کہا تھا کہ . . . .
۔ مجھے اس وقت پریشان نہ کرو۔ ارے ریل چھوٹنے میں کتنی دیر ہے۔

قمر ۔ اس نے کہہ تو دیا کہ پانچ سات منٹ باقی ہیں ۔ آپ ایک ایک سوال کو بار بار کیوں پوچھ رہے ہیں ۔

مرزاجی ۔ بیوی تم دخل نہ دو ۔ سارا معاملہ بگڑ جائیگا ۔

قمر ۔ معاملہ میں اب دھرا کیا ہے جو بگڑیگا ۔

مرزاجی ۔ ارے شیخو تو ڈرائیور سے تو کہہ دے کہ موٹر تیار رکھے ۔

شیخو ۔ جی اس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ پٹرول بالکل نہیں ہے ۔

قمر ۔ آپ پیدل بھی چلے جا سکتے ہیں ۔ جلدی کیجئے ۔ دو قدم پر تو اسٹیشن ہے ۔

مرزاجی ۔ بیوی تمھیں میری جان کی قسم اب کوئی گفتگو نہ کرو ۔

قمر ۔ یہ تو آپ کا بڑا ظلم ہے ۔ ہزار روپیہ پر پانی پھر جائے اور میں کچھ نہ بولوں ۔

مرزاجی ۔ بھئی واللہ مجھے مت چھیڑو ۔ خواہ مخواہ لڑائی ہو جائیگی مجھے اسٹیشن جانے دو میں ان سے سارا حال معلوم کر لوں گا ۔

قمر ۔ ہاں ہاں جائیے آپ کو کون روک رہا ہے مگر معاملہ صاف ہے وہ آپ کے ہزار سے اپنی سالی کی شادی کر رہے ہیں اور کیا ۔

مرزاجی ۔ ارے شیخو میری تلوار کہاں رکھدی ۔

(کسی کے باہر جانے کی آواز سنائی دیتی ہے)

قمر ۔ خدا کے لئے تلوار تو نہ لیجائیے ۔ اسٹیشن پر کیا ان سے دنگہ فساد کیجئے گا ۔

مرزاجی ۔ ارے شیخو تلوار لاتا ہے یا نہیں ۔

قمر ۔ پھر آپ نے تلوار کا نام لیا ۔

مرزاجی ۔ بھئی تم میرے معاملہ میں نہ بولو ۔ شیخو ابے کیا مر گیا کہاں رکھدی تلوار میری ۔

قمر ۔ میں نے کہا نا کہ تلوار نہ لیجائیے ۔

مرزاجی ۔ بیوی تمھیں میری جان کا واسطہ پہلے مجھے تلوار دیدو وقت ضائع ہو رہا ہے ۔ ریل چھوٹ جائیگی

شیخو ۔ سرکار موٹر میں پٹرول ڈلوادیا گیا ہے ۔
مرزاجی ۔ ابے تو نے میری تلوار کہاں رکھی ۔
شیخو ۔ بیگم صاحبہ ہی کے پاس تو ہے ۔
مرزاجی ۔ لاؤ بیوی خدا کے لئے تلوار دیدو ورنہ جھگڑا ہو جائے گا ۔
قمر ۔ آپ کو ایمان کی قسم تلوار نہ لیجائیے ۔
مرزاجی ۔ تم بلاوجہ وقت ضائع کر رہی ہو ریل چھوٹ جائے گی ۔ تلوار دیدو ۔
قمر ۔ جی نہیں میں آپ کو تلوار نہیں لیجانے دونگی ۔
مرزاجی ۔ نہیں تم اس کو نہیں سمجھتیں ۔ نہ معلوم اسکی کب ضرورت پڑے ۔
قمر ۔ ضرورت پڑے یا نہ پڑے میں آپ کو تلوار نہیں لیجانے دونگی ۔
مرزاجی ۔ دیکھو اگر دو چار منٹ میں اسٹیشن نہ پہنچا تو ریل روانہ ہو جائیگی ۔
لاؤ تلوار دیدو ۔
قمر ۔ ﷲ آپ تلوار نہ لیجائیے ۔ ایسا ہی ہے تو ہاتھ میں چھڑی رکھ لیجئے ۔
مرزاجی ۔ خدا کی قسم دیر ہو رہی ہے ۔
قمر ۔ نہیں میں نہیں دونگی ۔
مرزاجی ۔ تمھیں دینا پڑے گا ورنہ جھگڑا ہو جائے گا ۔
قمر ۔ میں نہیں دونگی ۔
مرزاجی ۔ دیکھو ہم کہہ رہے ہیں دیدو ۔
قمر ۔ میں قسمیہ کہتی ہوں نہیں دونگی ۔
مرزاجی ۔ لاؤ دو ۔
قمر ۔ جی نہیں ۔
مرزاجی ۔ دیدو ۔

قمر ۔ جی نہیں ۔

(مرزا جی کی زبان سے "ریل" "دیدو" "لاؤ" اور "تلوار" وغیرہ اور بیوی کی زبان سے "نہیں" "میں نہیں دونگی ۔ آپ کو میری جان کی قسم" "نہ جائیے" "مت لیجائیے" آہستہ آہستہ سنائی دیتا ہے دونوں کی آواز کا حجم کم ہوتا جاتا ہے اور ریل کے روانہ ہونیکی آواز آتی ہے ۔ آواز کے حجم میں اضافہ کے ساتھ ساتھ دونوں کی آوازیں غائب ہوتی جاتی ہیں اور آخر میں صرف ریل کی آواز سنائی دیتی ہے)

ختم شد

مرزا ظفر الحسن بی ۔ اے (عثمانیہ)

غزل

نوید زندگی پہونچی ہوا بدلی سحاب آیا
چمن والے اُٹھے انگڑائیاں لیکر شباب آیا

رسائی تو وہاں تک ہوگئی آگے مقدر تھا
ترے کوچہ سے جو ناکام آیا کامیاب آیا

نہ آنے کو وہ لکھتے ہیں لکھیں پھر بھی غنیمت ہے
دل بیتاب کچھ تو نے سنا ان کا جواب آیا

زمانہ کا فقط اک فرق رہجاتا ہے دونوں میں
وگرنہ ایک ہیں دراصل موت آئی کہ خواب آیا

یہ ہاتھوں کی لکیریں ہوں کہ پیشانی کی تحریریں
ازل میں اک دعا مانگی تھی دنیا میں جواب آیا

پرستش حسن عالم سوز کی منظور تھی یارب
اسی دہوکہ میں کس کس پر دلِ خانہ خراب آیا

سعیدؔ آیا سوئے مرقد فرشتونکی ندائیں ہیں
زمیں تعظیم کو اُٹھے غلام بوترابؑ آیا

میر عابد علی سعیدؔ

(میلاد کمیٹی نے اس مضمون کو ۱۳۵۱ف کے مقابلے میں "پروفیسر سبارا ؤ پرائز" کا مستحق قرار دیا۔)

(مجلۂ عثمانیہ)

ایک مشہور فیلسوف نے مذاہب عالم کے متعلق نہایت دلچسپ بات بتائی ہے۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ "ہر مذہب اپنے پیروؤں کو سیدھے راستے پر ہی چلاتا ہے" اور اس دعوی کی توضیح یوں کرتا ہے کہ "اگر منزل مقصود کو مرکز اور تمام مذاہب کو محیط کے مختلف نقاط فرض کرلیا جائے تو یقیناً محیط کے ہر نقطہ کو مرکز سے ملانے والے کم سے کم فاصلے کا خط، خطِ مستقیم ہی ہوگا لیکن ایک خط پر حرکت کرنے والے کو دوسرے خط پر حرکت کرنے والا خط ٹیڑھے راستے پر نظر آئے گا اور اپنے راستے کو سیدھا سمجھنے میں وہ کوئی غلطی نہ کرے گا حالانکہ حقیقتاً دونوں سیدھے راستوں پر ہوں گے"۔ اگر اس فلسفی کے خیال کو صحیح تسلیم کرلیا جائے تو یقیناً ہر وہ شخص جو کسی غیر مذہب والے کو اپنے مذہب کی دعوت دے، غلطی پر ہوگا اور اس کی مثال ایسی ہی ہوگی جیسے کوئی بچہ دوسرے بچہ کو اس کے بجائے اپنے والدین سے محبت کرنے کی دعوت دے کیونکہ وہ فطرتاً اپنے والدین سے محبت کرتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام بچوں کی فطری محبت کی طرح اکثر مذاہب کی فطرت بھی یکساں ہے اور ان میں بہت سے امور مشترک ہیں۔ نبیوں، پیغمبروں اور ناصحوں کی تعلیم مختلف زمانوں، قوموں، اور مقاموں کے لحاظ سے ایک دوسرے سے کچھ مختلف نظر آتی ہے لیکن ان سب کی روح ایک ہی ہوتی ہے۔

اسلام اور دوسرے مذاہب میں سب سے پہلی چیز جو نمایاں طور پر مشترک نظر آتی ہے د

یہ ہے کہ جس طرح آفتابِ اسلام عرب کے انتہائی تاریک دور اور عیش پرستی و فحاشی کے عہد میں طلوع ہوا اسی طرح دوسرے مذاہب بھی جن قوموں میں آئے وہ اس وقت نہایت تاریک دور سے گزر رہی تھیں۔ اور جس طرح پیغمبرِ اسلام نے گذشتہ پیغمبروں کی تعلیم کو اصلاح یافتہ شکل میں پیش کیا یعنی مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق اسلام کی تکمیل کردی اسی طرح تمام مذاہب کے پیشواؤں نے سچائی اور راستی کے وہی اصول پیش کئے جو ان سے پہلے پیش کئے جا چکے تھے فرق صرف اتنا تھا کہ ان کی خصوصیات مقام باشندوں، اور وقت کے لحاظ سے مختلف تھیں اور وہ سابقہ تعلیم پر بعض اضافے اور اصلاحات عمل میں لائے۔

مسلمانوں کا بنیادی عقیدہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے یعنی اللہ ہی ایک الٰہ ہے اس کے سوائے کوئی الٰہ نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اس عقیدہ کے پہلے جزو میں اللہ کے الٰہ واحد ہونے اور کسی دوسرے کے الٰہ نہ ہونے کا عقیدہ پیش کیا گیا ہے ـــ اسی طرح مسیحیت بھی عقیدۂ تثلیث کے باوجود خدا کی واحدانیت کی قائل ہے" تمام احکامات الٰہی سے پہلے 'اواسرائیل! کہدے کہ ہمارا خدا ایک ہے" (مرقس ۱۲ : ۲۹) " اور جان لو کہ جس کی ذات لافانی ہے' سوائے خدا کی ذات کے کوئی اور نہیں اور اسی نے عیسیٰ کو تمہارے لئے بھیجا" (یوحنا ۱۷ : ۳) انجیل کی ان آیتوں سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ مسیحیت نے توحید سے انکار کبھی نہیں کیا۔ ہندومت میں بھی توحید کا تصور پایا جاتا ہے۔ رگ وید میں لکھا ہے" ہستی واحد کو (عقلمند) لوگ بہت سے ناموں سے پکارتے ہیں" بہرحال واحدانیت کے متعلق دنیا کے اکثر مذاہب کے خیالات ایک ہیں اور دنیا کا ہر شخص اپنے اوپر ایک خاص ہستی کے وجود کا تصور رکھتا ہے اور البتہ اس کی عبادت اور اس کا تصور مختلف طریقوں سے کرتا ہے۔

جہاں قرآن مجید نے اپنے اس نظریہ کو پُرزور طریقہ سے پیش کیا کہ خدا اور آخرت پر یقین رکھنے والے خواہ عیسائی ہوں یا یہودی یا کسی اور قوم سے تعلق رکھتے ہوں اگر ان کا کردار نیک ہوگا تو وہ ضرور خدا کی طرف سے اس کا پھل پائیں گے اور ان میں خوف کھانے یا مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور ہر شخص کے اعمال اس کے ساتھ ہیں۔ منوجی نے بھی ہندومت کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا ہے کہ" ہر شخص تنہا پیدا ہوا ہے اور تنہا مرے گا۔ وہ تنہا اپنے اچھے کرموں کا بدلہ لے گا اور تنہا اپنے بُرے کاموں کا پھل پائیگا۔

مرنے کے بعد آدمی کا دوست سوائے افعال حسنہ 'تقدس' نیکی اور تقویٰ کے کوئی نہیں ہوتا"۔ بدھ مت نے راستی سچائی اور نیکی کے متعلق نہایت عمدہ تعلیم دی ہے اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہی چیزیں بدھ مت کی روح ہیں۔ مسیحیت بھی خدا کو انہی لوگوں کا ساتھی بتاتی ہے جو راستباز سچے اور نیک کردار ہوں۔ مختصر یہ کہ تقریباً تمام بڑے مذاہب کے احکام سچائی اور راستبازی کے باب میں اسلام سے زیادہ ملتے جلتے ہیں اور یہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ کوئی مذہب اپنے پیرؤں کو جھوٹ اور دہوکہ بازی اور ظلم و زیادتی کی تعلیم نہیں دیتا۔

مذہب اسلام میں خدا کی طرف سے مسلمانوں پر یہ ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں کہ وہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں' اپنے والدین سے اچھا برتاؤ اور ان کی عزت کریں' گناہ سے دور رہیں' کسی کو بلا وجہ نہ ماریں۔ بدنیتی سے کسی یتیم کی دولت کے قریب نہ جائیں' ناپ تول میں ایمانداری سے کام لیں اور سچ بولا کریں خواہ کسی عزیز یا رشتہ دار کا ہی معاملہ کیوں نہ ہو وغیرہ وغیرہ ــــ یہاں بھی دیگر تینوں بڑے مذاہب یعنی ہندومت بدھ مت اور عیسائیت اس سے قریبی مشابہت رکھتے ہیں۔ ہندومت میں حکم دیا گیا ہے کہ۔ برائیوں اور جھوٹ سے گریز کرو سچے اور راستباز و پاکباز بنو' چوری نہ کرو' اور اپنے نفس پر قابو رکھو۔ منو نے حکم دیا ہے کہ ان اصولوں پر عمل درآمد سارے فرقوں کے ساتھ ہونا چاہئے بدھ مت میں بتایا گیا ہے کہ جو شخص برائی کرتا ہے وہ سزا پاتا ہے اور جو نہیں کرتا وہ نیک اور پاک رہتا ہے۔ کوئی کسی کو پاکباز نہیں بناسکتا انسان کو اپنی مدد آپ کرنی چاہئے ۔ اسی طرح مسیحیت میں حکم دیا گیا ہے کہ کوئی شخص منہ سے بیہودہ لفظ نہ نکالے کیونکہ اس کا مواخذہ آخرت کے دن ہوگا اور اسی شخص کے الفاظ سے اس کا انصاف ہوگا اور انہی کی وجہ سے اسے سزا دی جائیگی گویا انسانی ذمہ داریاں بھی مذاہب اربعہ میں تقریباً ایک ہی ہیں ــــ

اسی طرح عورتوں کے متعلق اسلام حکم دیتا ہے کہ مسلمان اپنے رشتہ مناکحت کا نہایت احترام کریں اور عورتوں کے متعلق بدگوئی نہ کریں اور پیغمبر اسلام جہاں' "جنت ماں کے قدموں کے نیچے" بتاتے ہیں وہاں منو نے بھی باوجود انتہائی بدگمانیوں کے کہا ہے کہ "عورت کی عزت سے بھگوان خوش ہوتے ہیں"۔ اور بدھ مت میں حکم دیا گیا ہے کہ "عورت کی طرف دیکھنے سے پرہیز کرو اور جب اس سے گفتگو کرو تو صاف دلی کے ساتھ کرو" ــــ مسیحیت عورت کی طرف بری نظر دیکھنے کو "گناہ" کا مرتکب ہوجانے کے برابر سمجھتی ہے۔

گویا عورت کی عزت کے معاملہ میں جو اخلاقی اصول تمام مذاہب کی تعلیم میں مضمر ہیں عملی طور پر بالکل یکساں معلوم ہوتے ہیں۔

عفو کرم سے متعلق تمام مذاہب کے احکام میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اسلام جنت کو ان لوگوں کے لئے بتاتا ہے جو غصہ پر قابو پاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں اسی طرح قرآن مجید مساوی بدلے کی اجازت دیتے ہوئے معاف کر دینے کو سراہتا ہے۔ ہندومت کی ہدایت ہے کہ "برافروختہ آدمی کے ساتھ غصہ سے پیش نہ آؤ بلکہ اسے معاف کر دو تاکہ وہ خود نادم ہو جائے"۔ بدھ مت محبت اور نرمی کو غصہ پر فتحیاب کرنے، اور نیکی کو برائی پر غلبہ دینے کی ترغیب دیتا ہے۔ اور مسیحیت نے تو یہ کہہ کر عفو و کرم اور درگذر کی انتہا کر دی ہے کہ اگر کوئی ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا گال بھی پیش کر دینا چاہئے"۔ بہرحال عفو و درگذر کے ان مختلف احکام میں بہتر اور قابل عمل کوئی ہی سہی لیکن اتنا ضرور ہے کہ ان تینوں مذاہب کی طرح اسلام میں بھی عفو و درگذر کی تعلیم دی گئی ہے۔

سزا اور جزا کے مسئلہ میں تمام مذاہب اسلام سے متفق ہیں کہ نیکی اور اچھائی جزا کی مستحق ہے اور گناہ اور برائی سزا کی، جس کا جلد یا بدیر ملنا ضروری ہے۔ اور تمام مذاہب نے یہ چیز پیش کی ہے کہ ہر شخص جو بوئے گا وہی کاٹے گا۔ اور دنیا میں جزا و سزا کا یہی قانون کام کر رہا ہے۔ یہ چیز یقینی ہے کہ اگر کوئی کسی کو تکلیف پہنچائے تو خود بھی تکلیف اُٹھائے گا اور اگر کسی کو خوش کرے تو اس کا بدلہ مسرت و انبساط کی شکل میں ضرور پائے گا اس کے علاوہ تمام مذاہب آپس میں بیر رکھنے سے منع کرتے اور آپس میں مل جل کر رہنے اور دوسرے مذاہب اور ان کے پیشواؤں کی عزت کرنے کی تلقین کرتے ہیں، چنانچہ قرآن مجید میں ہے کہ اگر کوئی خدا کو چھوڑ کر کسی اور کو معبود بناتا ہے تو ایسے جھوٹے معبودوں کو تک بُرا نہ کہو تاکہ ان جھوٹے معبودوں کے پیرو کہیں جہالت سے خدا ہی کو برا بھلا نہ کہنے لگیں۔

گناہ اور انسان کا ہمیشہ کا ساتھ ہے کیونکہ انسان تحریص و ترغیب پر ہمیشہ غالب نہیں رہتا اور بعض اوقات اس کے دل و دماغ پر پردہ پڑ جاتا ہے اور وہ گناہ پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اسلام نے گناہ گار کے لئے توبہ و استغفار کے بعد کچھ کفارہ بھی رکھا ہے۔ یہ چیز بھی دوسرے مذاہب میں مشترک ہے

یعنی ہندو مت اور مسیحیت وغیرہ میں بھی یہی چیز دوسرے ناموں سے موجود ہے ــــ کفارہ تو خیر ایسی چیز ہے جسے سوائے کبھی کبھار کے مستقل طور پر ادا نہیں کیا جاتا لیکن اسلام نے بعض گہرے مقاصد کی بنا پر اپنے پیرؤں کو اپنے مال کا چالیسواں حصہ مستقلاً زکواۃ کے طور پر نکالنے کا حکم دیا ہے ۔ اسی قسم کی چیزیں ہندو مت میں پوتر دان، اور مسیحیت میں خیرات، اور دوسرے مذاہب میں بعض دوسرے ناموں سے موجود ہیں ۔ صرف یا تو مقدار میں اختلاف پایا جاتا ہے یا ترغیبی اور لازمی ہونے میں ۔ گویا تمام مذاہب اسلام سے اس بارے میں متفق ہیں کہ ایسے لوگوں کو خیرات دی جائے جو اس کے مستحق ہیں ۔

بعض اوقات انسانی دل حد سے تجاوز کرنا چاہتا ہے اور ایسا کرنے میں وہ کسی نیک کام کو بُرے کام سے بدل دیتا ہے ۔ اسلام کی طرح تمام مذاہب نے بزرگوں کی عزت اور احترام کی ہدایت کی ہے لیکن بعض جاہل پیرو ضرورت سے زیادہ احترام اور عزت کرنے میں پرستش سے بھی دریغ نہیں کرتے مثلاً بعض جاہل مسلمان قبر پرستی کرتے اور قبر پر سجدہ کرتے ہیں ۔ اسی طرح ہندو مت میں بتوں کی پوجا کی جاتی ہے اور بدھ مت کے پیرو خود گوتم بدھ کی پرستش کرنے لگے ہیں ۔ گویا اس طرح بعض بُری باتیں جو مذاہب کا جزو نہیں، ان کے پیرؤں میں رائج ہوگئی ہیں اور مشترک ہیں ۔ اور اب حالیہ زمانے میں معقولیت کی ترقی ہر مذہب کے پیروؤں میں پرانے اصلی مذہب کی طرف عود کی تحریک قوت پکڑ رہی ہے اور ان برائیوں میں کمی کے آثار نظر آرہے ہیں ۔

مذاہب کے عبادت خانوں کے متعلق بھی بعض مذاہب کے احکام اسلام سے ملتے جلتے ہیں مثلاً اسلام میں ہے کہ مسجدیں ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر بنائی جائیں کہ ایک موذن کی آواز دوسری مسجد تک نہ پہنچ سکے ۔ اسی طرح ہندو مت ایک نیا مندر بنانے سے بہتر پرانے مندر کی تعمیر و ترمیم کو بتاتا ہے یہ احکام محض اس لئے ہیں کہ عبادت خانوں کی بے حرمتی نہ ہو اور یہ ویران نہ پڑے رہیں ۔

نفس کشی کے لئے اسلام کی طرح تمام مذاہب میں روزہ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اسی طرح تہجد اور شب بیداری کی قسم کی عبادتیں بھی تمام مذاہب میں مشترک ہیں ۔ اس کے علاوہ تمام مذاہب میں اسلام کی طرح بعض عبادات میں دلی ارتکاز کے لئے تسبیح کی طرح کچھ نہ کچھ مادی وسیلہ اختیار کیا جاتا ہے مثلاً

ہندو مت میں مالا اور عیسائیت میں بھی اسی قسم کی ایک چیز ہوتی ہے ۔

جس طرح اسلام میں مسلمانوں کو حج کرنے کا حکم دیا گیا ہے اسی طرح ہر مذہبی رہنما نے اپنے عقیدت مندوں اور پیروں کو اپنے مقدس مقامات کی زیارت کا حکم دیا ہے ۔ اس کی تہ میں سب سے بڑا مقصد جو پنہاں ہے وہ اخوت، باہمی ہمدردی اور ایک جگہ پر اجتماع کے مواقع پیدا کرنا ہے ۔ بدھ مت نے کرشنا گڈھ کے قریب کے علاقے کو مذہبی مرکز قرار دیا ہے ۔ ہندو مت نے کاشی کو مقدس مقام بنایا اور مسیحیت نے بیت المقدس اور بعض دوسرے مقامات کو زیارت گاہ قرار دیا تاکہ تمام لوگ سال میں ایک خاص موقع پر ایک جگہ جمع ہوں اور آپس میں باہمی ہمدردی، اخوت اور محبت کے پیمان باندھیں اور تبادلہ خیالات کر سکیں ۔ نیز ہر سال اپنے تعلقات اور پیمان ہائے محبت کی تجدید کر سکیں اور ایک ہی ضابطہ حیات میں منسلک رہیں تاکہ مذہبی استحکام حاصل ہو اور دین سر بلند ہو ۔

بہر حال اسلام اور دیگر بڑے مذاہب میں بہت سی چیزیں مشترک ہیں اور موجودہ متمدن دنیا میں توقع ہے کہ معقولیت پسندی کی تعلیم و تربیت سے وہ تعصبات سائنس اور سائنس، سائنس اور مذہب، اور مذہب اور مذہب کے درمیان باقی ہیں روز بروز ٹوٹتے اور کم ہوتے جائیں گے اور خیال کیا جاتا ہے کہ تعصبات کی روز افزوں کمی اور انسانی ضروریات تمام مذاہب کو کسی ایسے مذہب میں ضم ہو جانے پر مجبور کر دیں گی جو ایک عالمگیر مذہب بننے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اسے " دین فطرت " کا نام دیا جا سکے فقط

گوپال راؤ (سال دوم)

شاعر

میرے خونِ دل سے بزمِ خلد کی تکمیل ہے
خوابگاہِ عرش میرا دامنِ تخئیل ہے

رازدارِ رازہائے خُلد ہے میری نگاہ
آسمانِ شعر کا ہوں تاجدارِ کجکلاہ

میری آہوں کا تنفّس نغمۂ داوٗد ہے
میرے نغموں کا ترنم مسکنِ معبود ہے

میرے اشکوں میں نہاں ہے نورِ یزدان کی چمک
عرشِ اعلیٰ سے چراتا ہوں میں رنگین دھنک

میرے دم سے کائناتِ ارض ہے بزمِ حسین
میرے دم سے بربطِ فردوس بھی ہے آتشین

میری آنکھوں میں جہانِ عشق آرامیدہ ہے
میری دنیا عرش کے تاروں سے بھی پوشیدہ ہے

میرے فانوسِ تخیّل سے شفق ہے لالہ رو
رِس رہا ہے عالمِ فردوس سے میرا لہو

کائناتِ حُسن میرے خونِ دل سے شعلہ رو
میری آہوں کے شرارے ہیں ستاروں کے سبو

میرے دل کا نور گویا جلوۂ رنگین طور
کہکشانِ نور افشان میرے گیتوں کا سرور

میری شہ پانوں میں رقصاں ہے طہورِ جانفزا
میرے سازِ دل کے زیر و بم پہ جنت ہے فدا

کوثر و تسنیم کے پانی سے کرتا ہوں وضو
لامکاں والوں سے ہوتا ہوں میں محوِ گفتگو

میرے ہی زیرِ نگیں یہ عالمِ ناسوت ہے
میرا شہبازِ تخیل طائرِ لاہوت ہے

میری دنیا میں شراب و شعر و مستی اور شباب
میری دنیا ہے بہارِ عشق کی رنگین کتاب

مجھ کو قدرت سے ملی ہے بے پناہ تابندگی
سینۂ گیتی میں میرے دم سے روحِ زندگی

نکتہ ہائے معرفت ہیں میرے سینہ میں نہاں
میری پروازِ تخیّل سے ہیں نیچے آسماں

بزمِ ہستی میں سکون ناآشنا پارا ہوں میں
محفلِ فردوس کا ٹوٹا ہوا تارا ہوں میں

آفتاب و ماہ کو زیرِ نگیں رکھتا ہوں میں
زندگی کے ہر نفس کو آتشیں رکھتا ہوں میں

سید محمد یوسف ناظم متعلم ام۔اے (ابتدائی)

جنگ عظیم اور تحریک اشتراکیت

۲۸ / جون ۱۹۱۴ء کو ولی عہد سلطنت اسٹریا آرچ ڈیوک فرانسز فرڈینینٹ کو بمقام سراجیو قتل کردیا گیا۔ اس قتل نے عالمی بارود خانہ میں آگ لگادی نصف درجن سلطنتیں تباہ ہوئیں اور پانچ سال تک تحریک اشتراکیت پر امید و بیم کا عالم طاری رہا۔

۲۳ / جولائی کو آسٹریا ہنگری نے سربیا کو الٹی میٹم دیدیا۔ جرمنی، اسٹریا، فرانس و برطانیہ عظمی نے جلسے کئے اور جنگی دھمکیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ یورپی ممالک کے تمام اشتراکی قائدین جنگ کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن روس، جو مستقبل میں ان سب کا امام بننے والا تھا خاموش رہا۔

۱۴ / ۱۵ / ۱۶ / جولائی کو متحدہ اشتراکیوں کی ایک قومی کانفرنس پیرس میں منعقد ہوئی اور اس کے ایک مہینہ بعد بین قومی کانگرس ویانا میں منعقد ہونیوالی تھی۔ پیرس کانفرنس میں مختلف ممالک کے نمایندے شریک رہے۔ بلجیم سے انسیل اور واڈرسن انگلستان سے بروس گلیشلر، اسمتھ اور کینیڈ ہی، روس سے پلی خانو اور ربانوچ، جرمنی سے کارل لیب نچٹ، الساک لورین سے جارجس ویل، ہالینڈ سے ویبی جن اور اٹلی سے الیس ڈای اور ریتوپسی شریک تھے۔ اس کانفرنس میں اہم مسئلہ زیر بحث یہ تھا کہ جنگ استعماریت کے خلاف کون سے طریقے اختیار کئے جائیں۔ ویلانت نے عام ہڑتال کی تجویز پیش کی۔ جارس اور مارسل سمباتھ نے اس کی تائید کی لیکن دیگر مندوبین نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ ان کی رائے میں عام ہڑتال کا سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ اشتراکی اقوام کو نیم اشتراکی اقوام کے قبضہ و اقتدار میں دیدینا پڑتا تھا بالآخر کانگرس نے ویلانت کی تائید کی اور ایک قرارداد

منظور ہوئی۔ جس کو جارس نے نہایت ہوشیاری سے مرتب کیا تھا اس قرارداد کو دونوں گروہوں نے قبول کرلیا۔

۲۸ جولائی کو آسٹریا نے سربیا کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔ اب چونکہ ایک عام یورپی جنگ کا خطرہ پیدا ہو چلا تھا اس لئے اسٹریا، بلجیم، فرانس، اور برطانیہ عظمی کے اشتراکیوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا لیکن روس پھر بھی ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس زمانہ میں جنگی زہر تمام ممالک میں سرایت کرگیا تھا اشتراکیوں نے امن کے جلوس نکالے لیکن نوجوانوں نے جنگ کے نعرے بلند کئے۔ کئی مقامات پر ان دونوں میں تصادم بھی ہوا۔

دوسرے دن بیورو آف دی انٹرنیشنل کے ایک اجلاس میں تمام یورپی ممالک کے اشتراکی قائدین بمقام برسلز جمع ہوئے۔ جارس گیس ڈی، ولانت، مارسل سمباۃ اور لانگے نے فرانس کی نمایندگی کی۔ ہیس، ملر اور شیدمن نے جرمنی کی روسا لکسمبرگ نے پولستانی اشتراکیوں کی نمایندگی کا فرض ادا کیا۔ وکٹر اور فریڈرک اڈلر نے اسٹریا کی نمایندگی کی۔ بروس گلیشلر ارونگ اور ہارڈی نے برطانیہ عظمی کی جانب سے شرکت کی۔ بلجیم، روس سوئزرستان، ڈنمارک، ہنگری، اسپین کے نمائندوں نے بھی شرکت کی۔ لیکن سربیا نے اپنا کوئی نمائندہ نہیں بھیجا۔

اسٹریا میں اشتراکیت کے بانی وکٹر اڈلر نے اعلان کیا کہ اسٹریا کی داخلی نازک صورت حال کے مدنظر اسٹروی اشتراکیوں کو اپنی حکومت کے جنگی کاموں میں ہاتھ بٹانا چاہیئے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ بین قومی کانگرس ویانا میں منعقد نہیں ہوسکتی۔ چیکوں کی جانب سے نیمات نے اڈلر کے اس اعلان کی توثیق کی۔ مندوبین کو حیرانی ہوئی۔ جنگ کے ابتدائی مراحل ہی میں اسٹروی طاقتور جماعت جنگ کی حمایت کررہی تھی ہیس نے اعلان کیا کہ جرمن اشتراکین جنگ کو روکنے کی حتی الامکان کوشش کرینگے۔ دیگر مندوبین نے بھی حلف اٹھایا کہ ان کی جماعتیں جنگی قرضوں کی تائید نہیں کریں گی۔ بیورو نے طے کیا بین قومی کانگرس ویانا کی بجائے پیرس میں ۹ اگسٹ کو منعقد کی جائے۔

ادھر جرمنی میں یہ خیال عام ہوگیا کہ جنگ ناگزیر ہے۔ تمام جماعتیں متحد ہوگئیں۔ قومی جذبہ بیدار ہوگیا تھا۔ نوجوان مارنے مرنے پر تیار تھے۔ لیکن سوشل ڈیموقراط خاموشی سے حالات کا مطالعہ کررہے تھے۔ یکم اگسٹ کو اشتراکی قائدین نے ایک منشور جاری کیا انہوں نے اپنے پیرؤں کو یقین دلایا کہ مستقبل میں اشتراکیت ہی کا بول بالا ہوگا۔ اور اشتراکیت ہی تمام قوموں کے مابین ایک مضبوط ربط قائم کریگی۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن فضا اب بھی ناسازگار تھی۔

یکم اگسٹ کو پیرس کے متحدہ اشتراکین کی پارلیمانی جماعت سے ہرملر نے ملاقات کی۔ جو جرمن ریشتاغ کے ایک اشتراکی رکن تھے۔ ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ انہوں نے بیان کیا کہ ان کے ساتھی دو جماعتوں میں منقسم ہوگئے ہیں۔ ایک جماعت جنگی قرضوں کی موافقت کرنا چاہتی ہے اور دوسری مخالفت۔ لیکن انہیں یقین تھا کہ ان کے ساتھی بہرحال جنگ کی تائید نہیں کریں گے۔ ملر اسی شام پیرس سے روانہ ہوگئے۔ برلن آنے کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ جرمنی نے روس و فرانس کے خلاف اعلان جنگ کردیا ہے۔ وہ ٹھیک اس وقت پہنچے جبکہ ان کے ساتھی اشتراکیوں نے جنگ کی تائید میں رائے دیدی تھی۔ انہوں نے بھی چاروناچار جنگ کی تائید کی۔ دو دن قبل اشتراکیوں نے اپنے چانسلر سے کہدیا تھا کہ وہ جنگی قرضوں کے خلاف رائے دینگے۔ لیکن وقت پر انہوں نے جنگ کی تائید کی۔ ایک دن قبل اشتراکی جماعت کے ایک جلسہ میں کاٹسکی نے ووٹ دینے سے احتراز کرنے کی تجویز پیش کی لیکن ۱۴ آرا کے مقابل میں ۷۸ آرا سے پارٹی نے جنگ کی تائید میں رائے دینے کا فیصلہ کیا۔ ہیس نے جماعتی نظم و ضبط کے آگے سر جھکا دیا۔ اور ریشتاغ میں پارٹی کے فیصلہ کو پڑھ کر سنایا۔ سوشل ڈیموقراط نے اپنے تمام اصول و عقائد پس پشت ڈال دیے اور بین الاقوامیہ پامال ہوگیا وہ وطن پرستی کے نشہ سے سرشار تھے۔ جنگ کے بعد والے شاندار مستقبل کے تصور نے ان کے دماغوں کو ماؤف کردیا اور بالآخر انہوں نے اپنے مخالفین کے شانہ بہ شانہ جنگی قرضہ کی تائید میں پہلی مرتبہ رائے دی۔ جرمن اشتراکیوں کے اس رویہ نے تمام اشتراکیوں کو حیرت میں ڈالدیا اشتراکیت کے بین قومی اصولوں پر قومی جذبہ کی یہ پہلی فتح تھی۔ اسٹروی اشتراکیوں نے جرمن اشتراکیوں کی اتباع کی۔ جارجس کو پیرس میں قتل کردیا گیا تھا۔ ۴ راگسٹ کو اس کی تدفین عمل میں آئی۔ اس موقع پر Reneviviani صدر کونسل نے تمام فرانسیسیوں کو متحد رہنے کی تلقین کی۔ اسی دن دوپہر میں اشتراکین نے L'union-sacree میں بالاتفاق جنگی قرضوں کی تائید کی۔ رائے دیتے وقت انہوں نے اپنے اپنے موقف کی وضاحت میں ایک لفظ بھی نہیں کہا عام ہڑتال کا ذکر تک نہیں کیا گیا۔ اب تو وہ نئی وزارت میں عہدے ڈھونڈ رہے تھے۔ ۱۶ راگسٹ کو Viviani نے اپنی وزارت کی توسیع کی اور تین اشتراکیوں کو اس میں جگہ دی مارسل سمباتھ کو کار ہائے عام البرٹ ٹامس کو اسلحہ کی تیاری و تنظیم کے قلمدان دئے گئے۔ جولس گسڈی کو وزیر بے قلمدان بنایا گیا۔ اشتراکین نے بورژوازی وزارت میں شرکت کی اور علانیہ اس امر کا اظہار کیا کہ جرمنی کو کچل کر رکھ دیا جائیگا۔ اور اس وقت تک تمام سیاسی سماجی اختلافات دریا برد کردئے گئے۔

ویلیانتے اور رہرڈی سب سے زیادہ وطن پرست بن گئے۔ ویلیانتے نے ۱۹۱۵ئہ میں وفات پائی۔

اسی دوران میں انگلستان کی مزدور جماعت نے ایک نہایت ہی عمدہ منشور شائع کیا جس میں بتلایا گیا تھا کہ ۱۰ لاکھ کے جرمن اشتراکین اور اراکین ٹریڈ یونین نے جنگ کے خلاف احتجاج کیا ہے اور اپیل کی گئی تھی کہ برطانیہ عظمی کے مزدور فرانس کے مزدوروں سے اشتراک کرے۔ "ہمیں ان مزدوروں کے ساتھ ملکر یہہ اعلان کردینا چاہئے کہ ہماری حکومتیں لڑتی ہیں تو لڑیں لیکن ہم امن چاہتے ہیں" ۲ ر اگسٹ کو جنگ کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے مزدور ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوئے۔ کیر ہارڈی اور میکڈانلڈ نے دو اجتماعات کو مخاطب کیا۔

ایک طرف اشتراکین کی یہ جدوجہد جاری تھی لیکن دوسری طرف مورخ کا قلم کچھ اور ہی لکھنے کو تھا دوسرے دن جرمنی نے بلجیم کو الٹی میٹم دیدیا۔ برطانیہ اب خاموش کیسے رہ سکتا تھا۔ اُس نے بھی جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کردیا۔ نیتجۃً لارڈ مارلے مسٹر جان برنس کابینہ سے مستعفی ہوگئے۔ برطانوی اشتراکین کی اکثریت اور فبیون نے جنگ کی تائید کی۔ ۴۲ مزدور اراکین پارلیمان میں سے صرف چند نے اپنے دامن کو آلودہ ہونے نہ دیا۔ میکڈانلڈ اور پانسن بی۔ اور اسنوڈن ان میں نمایاں تھے۔ مزدور جماعت کی اکثریت نے جس میں ارتھر ہنڈرسن اور جی۔ ین برنس شریک تھے ہر ممکنہ طریقہ سے حکومت کی امداد کرنے کا ارادہ کرلیا۔ اور پانچ اگسٹ کو جنگی قرضوں کی تائید میں رائے دیدی۔ اور اسی طرح جرمنی، اسٹروی، فرانسیسی اشتراکین نے اشتراکیت کو وطن پرستی پر قربان کردیا۔

اسی زمانہ میں میگڈانلڈ اور اُن کے بعض ساتھیوں نے عجیب و غریب عزم و جرأت کا مظاہرہ کیا۔ اور جنگ کی تائید نہیں کی۔ ۱۹۱۴ئہ میں میگڈانلڈ نے نہ صرف برطانوی عوام کے جذبات کی مخالفت کی بلکہ مزدور جماعت کے ایک گروہ سے جس کے وہ صدر تھے اختلاف کیا۔ بالآخر انہیں اس سے مستعفی ہونا پڑا۔ انہوں نے ی۔ ڈی مورل ماٹریولین اور نارمن اینجل کو ساتھ لیکر یونین آف ڈیموکراٹک کنٹرول قایم کی۔ اس جماعت نے بڑی جرأت کیساتھ امن کا پرچار شروع کیا۔

اسی طرح ہر ایک متحارب ملک میں اشتراکی قائدین اور اراکین کو اسی کشمکش کا سامنا کرنا پڑا کہ آیا وہ اپنے بین قومی امن کے اصولوں پر قائم رہیں یا جنگ میں اپنی قوم کا ساتھ دیں۔

بلجیم میں اشتراکی جماعت نے اپنی حکومت کو غیر مشروط امداد دینے کا فیصلہ کیا۔ اسٹریا میں تمام جماعتوں اور نسلوں نے شہنشاہ اسٹریا سے وفاداری کا اظہار کیا اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ولیعہد کا خون ہوگیا تھا اور یہ خیال عام

ہو چلا تھا کہ سلطنت پارہ پارہ ہو جائیگی۔ سوشل ڈیموقراط نے اپنے بلجمی ساتھیوں کے مانند حکومت کی ساعی جنگ میں امداد کا فیصلہ کیا۔

اس طرح جنگ کے آغاز ہی میں یہ ثابت ہو گیا کہ قومی جذبات بین قومی جذبات سے کہیں زیادہ مستحکم ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ سربیا (جس پر سب سے پہلے حملہ ہوا تھا) کی اشتراکی جماعت نے جنگی قرضوں کی مخالفت کی اور بین الاقوامیہ کی آخر وقت تک تائید کرتی رہی لیکن برطانیہ، فرانس، بلجیم کے وطن پرستوں نے اشتراکی اصولوں سے انحراف کیا اور اپنی جماعتوں کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا۔ ان ممالک میں چھوٹی چھوٹی اقلیتوں نے مخالفت ضرور کی یہ مخالفت کرنے والے یا تو انتہا پسند اشتراکین تھے یا پرامن اشتراکین لیکن جنگ کے نقار خانے میں ان طوطیوں کی آواز کون سنتا تھا!

جنگ کا لازمی اثر یہ ہوا کہ بین الاقوامیہ دو حصوں میں بٹ گیا۔ ایک حصہ جنگ کے مؤیدین کا تھا دوسرا مخالفین کا۔ بین الاقوامیہ کی معتمدی کا دفتر برسلیز سے ہالینڈ میں منتقل کر دیا گیا اور عاملہ میں ولندیزی اراکین کو شریک کر لیا گیا اور اس کے بعد جماعت واری کانفرنسیں منعقد ہونے لگیں۔ جنوری ۱۹۱۵ء میں غیر جانبدار اراکین کا ایک جلسہ کوپن ہیگن میں منعقد ہوا اور متحارب اشتراکین کے نام ایک اپیل جاری کی گئی کہ وہ قیام امن کی کوشش کریں فروری ۱۹۱۵ء میں اشتراکی قائدین لندن میں جمع ہوئے اور ایک قرارداد منظور کی جس میں جنگ جاری رکھنے کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا۔ اپریل ۱۹۱۵ء میں وسطی ممالک کے اشتراکین ویانا میں جمع ہوئے اور مابعد جنگ کے مسائل کے متعلق قراردادیں منظور کیں۔

یہ تمام کانفرنسیں بین الاقوامیہ کی عاملہ کی منظوری سے منعقد ہوئی تھیں۔ ستمبر ۱۹۱۵ء میں مخالف جنگ اشتراکین نے بزعم خود جنگ کے بعد پہلی بین قومی اشتراکی کانفرنس بمقام Zimmerwald (سوئزرستان) منعقد کی۔ ۳۲ مندوبین شریک تھے جرمنی، فرانس سے غیر سرکاری مندوبین نے شرکت کی۔ اور اٹلی، سوئزرستان، روس، پولینڈ، لیتھونیا، رومانیہ، بلغاریہ، سوئیڈن، ناروے اور ہالینڈ سے سرکاری مندوبین شریک ہوئے۔ بروس گلیشر، جو بیٹ برطانوی مندوبین کی حیثیت سے شریک ہونا چاہتے تھے لیکن انہیں پاس پورٹ دینے سے انکار کر دیا گیا۔

زمروالڈ منشور پر اکثریت نے دستخط کئے۔ اس میں جنگ کی مذمت کی گئی تھی اور بتلایا گیا تھا کہ یہ جنگ استعماریت کی آفریدہ ہے۔ اور سرمایہ داروں کی حرص و ہوس کو پورا کرنیکے لئے لڑی جا رہی ہے۔ انسانی محنت اور فطرت کے خزانوں کا استحصال کیا جا رہا ہے" آخر میں قیام امن کی اپیل کی گئی تھی۔

زمروالڈ کانفرنس میں ایک اشتراکی کمیشن قائم کیا گیا تھا یہ کمیشن ولندیزی بیورو کا حریف بن گیا جب ایک دوسری کانفرنس اسی کمیشن کی سرپرستی میں بمقام کین تھال اپریل ۱۹۱۶ء میں منعقد ہوئی تو انکی یہ رقابت نمایاں ہوگئی۔

جنگ کے چند ابتدائی مہینوں میں جرمن سوشل دیموقراط کے رویہ میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ وہ ابتک اس جنگ کو روس کے خلاف ایک دفاعی جنگ سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے بین قومی اشتراکی بیورو کے مخالف جرمن رویہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ اور یوں اپنے آپ کو دشمن ممالک کے اشتراکین سے جدا کرلیا۔ ڈسمبر ۱۴ ۱۹ء میں انہوں نے دوبارہ جنگی قرضوں کی تائید کی اور ان کے لیڈ رہیں کو یقین تھا کہ فتح ان ہی کی ہوگی۔ دوسرے سال ۱۹۱۵ء میں ہیں نے بہادر جرمن فوجوں کا ملک کی جانب سے شکریہ ادا کیا۔ شہنشاہی حکومت اشتراکین کے اس رویہ سے بہت خوش ہوئی اور ان کے مطالبات کو قبول کرنے کا تہیہ کرلیا" لیکن مئی ۱۹۱۵ء میں حالات نے پلٹا کھایا انتہاپسند اشتراکین کے ایک گروہ نے لیبک نچٹ ( ) اور روزا لکسم بورگ Rosa luxembeourg کی سرکردگی میں جنگی قرضوں کی مخالفت کے لئے ایک مجاہرہ اور عام ہڑتال کا انتظام کیا۔

مئی ۱۹۱۵ء میں اٹلی بھی جنگ کی آگ میں کود پڑا۔ جرمنی کو اس کی توقع پہلے ہی سے تھی اس لئے اس کو کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ روپیہ کی مزید ضرورت تھی اس لئے قرضہ کی تحریک منظور کی گئی۔ سوشیل ڈیموکراٹس نے اسکی مخالفت نہیں کی حالانکہ کارل لیپ نچٹ Karlich knecht نے اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ ایک طرف تو پارلیمانی سوشیل ڈیموقراط پارٹی تھی اور دوسری طرف انتہاپسند اشتراکین مثلاً کارل لیپ نچٹ (Karlich knecht) اور روزا لکسم برگ تھے ان دونوں جماعتوں کے مابین بہت کم مشترک چیزیں تھیں۔

(نیا پان) اقلیتی جماعت میں جون ۱۹۱۵ء میں منشور امن شایع لیا۔ اکثریتی جماعت نے اس منشور کی سخت مخالفت کی اور اپنا ایک علیحدہ منشور ۲۳ر جون کو شائع کیا جس میں انہوں نے جرمن حکومت کو مشورہ دیا کہ صلح کی گفت وشنید کا آغاز کرے۔ اخبار (Vorwaerts) میں یہ منشور شائع ہوا تھا۔ حکومت نے اس اخبار کو بند کردیا۔ یہیں سے حکومت اور اشتراکین کے درمیان کشمکش کا آغاز ہوتا ہے۔

اگسٹ ۱۹۱۵ء میں ایک دوسری اپیل کی گئی۔ اور دسمبر ۱۹۱۵ء میں جنگی قرضوں کے لئے منظوری لینی پڑی تو ایک سو دس اشتراکی نمایندوں میں سے انیس ۱۹ نے جس میں کارل لیپ نچٹ اور برنس ٹائن

Bernsteine شامل ہیں نہ صرف پارٹی کے جلسہ میں بلکہ ریشتاغ کے کھلے اجلاس میں اسکی مخالفت کی۔ پارٹی نے اس اقلیتی جماعت کو پارٹی کے ضبط و نظم کو توڑنے کی سزا دی۔ اسی طرح سوشل ڈیمو قراط پارٹی جو ۱۹۱۴ء میں نہایت مضبوط اور طاقتور جماعت تھی اب ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھی۔

جنگ کے دوسرے سرما یعنی ۱۹۱۵ء تا ۱۹۱۶ء میں جرمن عوام نے غذا کی کمی محسوس کی اور حکومت کو روپیہ کی قلت محسوس ہوئی۔ پوری قوم جنگ سے بیزار ہو چلی تھی۔ حکومت نے جوش و خروش پیدا کرنے کی بساط بھر کوشش کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ اور جرمن پارلیمان کے اشتراکیوں میں انتشار خیال پیدا ہو چلا تھا۔ آب دوزی لڑائیوں کے مسئلہ پر بحث کیا چھڑی گویا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا گیا۔ مارچ ۱۹۱۶ء میں قدامت پسندوں نے ایک قرارداد پیش کی کہ یو بوٹوں کا استعمال اس وقت تک نہیں کیا جائے جب تک کہ دیگر دول سے گفتگو نہ کر لی جائے اس قرارداد میں بیان کیا گیا تھا کہ برطانوی جنگی طریقوں کے خلاف یو بوٹیں بہت کامیاب ثابت ہوئی ہیں اور یہ کہ قیام امن اور جرمنی کے تحفظ کے لئے اس حربے کا استعمال ضروری تھا۔ سوشیل ڈیمو قراطی پارٹی کے ان انیس ساتھیوں کو اب ایک بہانہ مل گیا اور انہوں نے ریشتاغ کی سرکاری جماعت سے قطع تعلق کر لیا اور قرارداد کی مخالفت میں رائے دی انہوں نے ایک علحدہ جماعت بنائی جس کا نام انڈپینڈنٹ سوشلسٹ پارٹی سوشل ڈیمو قراط کا سابق صدر ہیس Hasse اس پارٹی کا قائد بن گیا۔

اپریل ۱۹۱۶ء میں اشتراکیوں نے محسوس کیا کہ انکی صفوں میں رخنے پڑتے جا رہے ہیں۔ لیپ نچٹ اور Ruhle ان سے علحدہ ہیں۔ اگرچہ انہوں نے آزاد جماعت میں شرکت نہیں کی تھی اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے خیال میں یہ جماعت ابھی اتنی انتہا پسند نہیں تھی جتنے کہ خود یہ تھے۔

۱۹۱۶ء کے وسط سے جرمن اشتراکین کی ایک اقلیت نے باقاعدہ مخالف جنگ پالیسی اختیار کی اور ۱۹۱۶ء کے اواخر میں انتہا پسند اشتراکی اور انقلابی تحریکات عوام میں پھیلنے لگیں۔ ان تحریکات کو دبانے میں پولس کو کامیابی نہ ہوئی۔

سوشل ڈیمو قراط کی ایک کانگرس ۱۹۱۶ء میں منعقد ہوئی اس میں تمام مملکت کے نمائندے

شریک تھے ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں انہوں نے دفاعی جنگ کی تائید کی لیکن جارحانہ اقدام کی مذمت کی اور بین الاقوامی تعلقات کے دوبارہ قیام کی اپیل کی۔ اسی دوران میں کارل لیپ نچٹ کو برلن میں امن کے مظاہروں کی قیادت کرنے کے جرم میں گرفتار کرلیا گیا اور اس کو دو سال کی سزا دی گئی۔

اشتراکین کی اکثریتی جماعت کے لیڈر فلپ شیڈمن اور Philipp scheilemam فریڈرک ایبرٹ Friedrich Ebert تھے۔ ایبرٹ ایک درزی کا لڑکا تھا اور سنہ ۱۹۱۳ء میں سوشل ڈیموقراط پارٹی کا صدر بن گیا۔ سنہ ۱۹۱۶ء کے ایسٹر تک جرمن اکثریتی اشتراکین کا کافی اثر تھا اور ان کی تنظیم بھی بڑی اچھی تھی۔ ان کی قوت کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ انہوں نے شہنشاہ کے پیام ایسٹر کو نظرانداز کردیا اور بلجیم پر قبضہ کرنے اور تاوان جنگ وصول کرنیکی مخالفت کی۔

مئی سنہ ۱۹۱۷ء میں اب دوزہی لڑائیوں کے مسئلہ کو پھر چھیڑا گیا شیڈمن نے سوشل ڈیموقراط کے قائد کی حیثیت سے حکومت اور اس کے جنگی مقاصد پر حملہ کیا۔ ارزبرگر (Erzherger) اب امن کا بہت بڑا داعی بن گیا تھا۔ سوشل ڈیموقراط، ڈیموقراط، اور کیتھولک مرکزی جماعت کی اس نے تائید کی۔ سوشل ڈیموقراط کے تائید کرنیکی ایک دوسری وجہ یہی تھی وہ ہال وگ (Hollweg) کو چانسلری سے معزول کردینا چاہتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں ہال وگ کی موجودگی میں امن ناممکن تھا۔ اور ہال جنرل انڈنڈراف (Inden droff) کے اشارۂ چشم و ابرو پر ناچتا تھا۔ اشتراکین آہستہ آہستہ اپنے مقاصد حاصل کر رہے تھے۔ بالآخر ہال وگ کا دور ختم ہوگیا۔ اس نے اپنا استعفیٰ پیش کردیا اس کے بعد ڈاکٹر میکیلس Michaelis چانسلر بنا۔

ڈاکٹر میکیلس کی نئی کابینہ میں صرف ایک سوشل ڈیموقراط اگسٹ مولر (August muller) تھا۔ اس کو جنگی محکمۂ غذا کا انڈر سکرٹری بنایا گیا تھا۔ سوشل ڈیموقراط پیپلس پارٹی اور کیتھولک سنٹر نے جولائی سنہ ۱۹۱۷ء میں متفقہ طور پر امن کی ایک قرارداد پیش کی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اس امر کا بھی اعلان کیا کہ اگر کوئی حکومت سمندروں کی آزادی یا بین قومی قانون کے دوبارہ نفاذ پر رضامند نہ ہو تو وہ جنگ جاری رکھیں گے۔ یہ قرارداد ایک سو چھبیس (۱۲۶) کے مقابل دو سو سولہ (۲۱۶) آرا سے کامیاب ہوگئی۔

فرانس میں بھی جنگ کے پہلے سال میں اشتراکین جنگ کے مویّد تھے ۱۹۱۵ء میں آلبرٹ تھامس کو جو ایک اشتراکی لیڈر تھا کابینہ میں لیا گیا۔ لیکن مئی ۱۹۱۵ء میں امن کی تحریک شروع ہوئی جین لانگے Jaulesguesde اور پال فارے Paul faure اس اقلیتی جماعت کے سرگروہ بن گئے۔ جولس گسڈی Jean longuet مارسل سمیاتھ (Marcel sembat) آلبرٹ تھامس پارٹی کی مخالفت کے بغیر کابینہ میں حصہ لے رہے تھے۔ لیکن جب سے امن کی تحریک شروع ہوئی۔ حالات بدل گئے۔ اپریل ۱۹۱۶ء میں قومی کانگریس نے بین الاقوامیہ کے مختلف شعبہ جات میں ربط قایم کرنے کی قرارداد منظور کی۔ اس دن سے اقلیتی گروہ زور پکڑتا گیا لیکن اس گروہ میں بھی ایک چھوٹی سی جماعت بہت انتہا پسند تھی یہہ جماعت زمّر والڈین (Zimmer waldian) کا تھی اس جماعت نے ۱۹۱۶ء ہی میں جنگی قرضوں کے خلاف رائے دی۔ زمروالڈین کو متحدہ اشتراکیوں سے بڑی تائید حاصل ہوئی اور اس جماعت کی ایک کانگریس دسمبر ۱۹۱۶ء میں بمقام پیرس منعقد ہوئی۔ اس وقت اس جماعت کی تعداد دو سو انیس تھی۔

چند ماہ بعد اشتراکین کا حکومت سے تعاون عمل ختم ہوگیا۔ ستمبر ۱۹۱۷ء میں ربّاط (Rihot) وزارت ختم ہوگئی اور نئی پین لیو (Pain leve) وزارت میں ایک بھی اشتراکی نہیں تھا۔

۱۹۱۷ء کے موسم گرما میں اسٹاک ہوم میں بین قومی صلح کانفرنس منعقد کرنے کی بڑی سرگرم کوششیں کی گئیں۔ یہہ تجویز ولندیزی۔ اسکینڈنیوی کمیٹی کے اشتراکیوں کی تھی۔ جن کا صدر برانگٹن تھا تمام متحارب اور غیر جانب دار یورپی ممالک کو دعوت نامے روانہ کئے گئے۔ جرمن اور آسٹروی حکومتوں نے مشکلات نہیں پیدا کیں۔ روسی اشتراکی جماعت نے اس تحریک کا خیر مقدم کیا۔ لیکن امریکی نفاق مزدوران اور بلجی اشتراکیوں نے اس میں حصہ لینے سے انکار کردیا۔ برطانوی، فرانسیسی، اطالوی حکومتوں نے اپنی اشتراکی جماعتوں کو پاسپورٹ دینے سے انکار کردیا اس طرح یہہ کانفرنس منعقد نہ ہوسکی لیکن تمام اشتراکی جماعتوں میں شرایط امن کے متعلق اپنے خیالات لکھ بھیجے۔

اسی زمانہ میں زمروالڈ کمیشن نے ایک علحدہ جلسہ اسٹاک ہوم میں کیا اور بالآخر تیسری بین الاقوامیہ یا اشتمالی بین الاقوامیہ کے بنانے کا فیصلہ کیا۔

برطانیہ عظمیٰ نے پاسپورٹ دینے سے جو انکار کیا تھا اس کے بہت ہی اہم نتائج برآمد ہوئے۔ کیونکہ آٹھ اگسٹ کو مسٹر آرتھر انڈرسن جنگی کابینہ سے مستعفی ہو گئے اور انکی جگہ مسٹر جی۔ ین بارنس G. N. Barnes نے لی اس واقعہ کی وجہ سے برطانوی مزدور پارٹی متحد ہو گئی اور اس نے مسٹر ہنڈرسن پر اعتماد کی قرارداد منظور کی۔ ۲۱ اگسٹ کو مزدور کانفرنس ہوئی جس میں طے پایا کہ اسٹاک ہوم کانفرنس میں حصہ لیا جائے۔

ڈسمبر ۱۹۱۷ء میں برطانوی مزدور تنظیموں نے مطالبہ شروع کیا کہ حکومت اپنے مقاصد جنگ کا دوبارہ اعلان کرے۔ انہوں نے حسب ذیل مطالبات بھی پیش کئے:۔

(۱) مجلس اقوام کا قیام۔

(۲) بین قومی عدالت کا قیام۔

(۳) بین قومی مقننہ کا قیام۔

(۴) قوموں کے مابین جبری ثالثی فیصلہ۔

(۵) تمام ممالک کو عمومیایا جائے۔

(۶) ڈپلومسی کھلی ہوئی ہو۔

(۷) تخفیف اسلحہ۔

(۸) جبری فوجی خدمت کو برخاست کرایا جائے۔

(۹) بلجیم کی حکومت کو قائم کردیا جائے۔

(۱۰) الکساک لورین کو اپنے سیاسی مستقبل کا فیصلہ کرنے دیا جائے۔

(۱۱) افریقہ کی یوروپی نوآبادیات کو مجلس اقوام کے سپرد کردیا جائے۔

مندرجہ بالا مطالبات میں سے سات مطالبات کو پہلے ہی قبول کیا جاچکا تھا اور ان مطالبات

کے پیچھے تحریکِ مزدوران کی پوری قوت کام کر رہی تھی ۔

اسی دوران میں آسٹریا میں ڈاکٹر اڈلر اور سوشل ڈیموقراط امن کے لئے جد و جہد کر رہے تھے انہیں ڈاکٹر اڈلر کے بیٹے فریڈرک سے بڑی مدد ملی ۔ جنگ کے زمانہ میں جب اشتراکی بین الاقوامیہ ٹوٹ گیا تو فریڈرک اس نتیجہ پر پہونچا کہ کونٹ استر وزیر اعظم آسٹریا کو قتل کر دینا چاہئے ۔ چنانچہ ۲۱ ر اکتوبر ۱۹۱۶ء کو اس نے وزیر اعظم کا خون کیا ۔ ابتدا میں اس کو پھانسی کی سزا دی گئی ۔ لیکن بعد میں اٹھارہ سال کی سزا کے قید پر اکتفا کیا گیا ۔ ۱۹۱۸ء کے موسم خزاں میں شہنشاہ نے اس کو رہا کر دیا ۔ ۱۹۱۹ء میں وہ رکن پارلیمان منتخب ہوا اور آسٹروی سوشل ڈیموقراطی پارٹی کا نائب صدر بن گیا ۔

جرمنی میں ۱۹۱۷ء میں ہرٹ لنگ نے ڈاکٹر میکے لس کی بحیثیت چانسلر جگہ لی ۔ اس نے سوشل ڈیموقراط کو مزید مراعات عطا کئے ۔ پہلے تو اس نے ایوان مزدوران کی اجازت دی پھر انجمن مزدوران کو سیاسی مقاصد کے لئے باہم ملنے کی اجازت بھی عطا کر دی ۔ جرمنی نے ابھی تک جنگ جاری رکھی تھی یہہ بڑے تعجب کی بات ہے لیکن سوشل ڈیموقراط کو ابھی اتنا اقتدار حاصل نہیں تھا کہ وہ جنگ کو روکنے کیلئے حکومت پر دباؤ ڈالے ۔

نومبر ۱۹۱۷ء میں روسی بالشویکی انقلاب ہوا ۔ اس کا فرانس اور جرمنی پر تقریباً یکساں اثر پڑا ان ممالک کے اشتراکیین دو جماعتوں میں بٹ گئے ۔ جرمنی میں عام مزدوروں کا خیال تھا کہ یہہ انقلاب جنگ کو ختم کرنے کا پیش خیمہ ہے اس کے بعد ہی اسلحہ سازی کے کارخانوں میں ہڑتالیں ہونے لگیں ۔

۱۹۱۸ء میں جنگ کے لئے جد و جہد کا آغاز ہو گیا ۔ ولسن صدر جمہوریہ متحدہ امریکہ نے اپنے مشہور چودہ نقاط پیش کئے ۔ اب جرمنی میں پارلیمانی جنگ شروع ہو گئی کہ آیا ان نقاط کو امن کی بنیاد بنانا چاہئے یا نہیں ۔ سوشل ڈیموقراط اس کی تائید کر رہے تھے اور سرحدی حلقے اس کے مخالف تھے اَزیر گ امن کا خواہش مند تھا ۔ لیکن چانسلر ہرٹ لنگ چاہتا تھا کہ آسٹریا ' ہنگری کے مطالبات کو تسلیم کیا جائے اس کا خیال تھا کہ ان چودہ نقاط کی بنیاد پر صلح کی گفت و شنید کی جا سکتی تھی ۔

۱۹۱۸ء کے موسمِ بہار میں ہرٹ لنگ نے خیال کیا کہ اشتراکیوں کو مزید مراعات عطا کرنیکا

اچھا موقع ہے اوّلاً اس نے ریشتاغ کے ارکین کی تنخواہ میں تین ہزار مارک سے بڑھا کر پانچ ہزار مارک کردی۔ اس کی وجہ سے اکثر سوشل ڈیمو قراط کو بہت فائدہ ہوا۔ دوسرے یہہ کہ ہرٹ لنگ نے ریشتاغ کی توسیع کی۔ ان تمام اسباب کی وجہ سے سوشل ڈیمو قراط میں ایک نئی قوت پیدا ہوگئی۔ وہ مزید مطالبات کرنے لگے یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو وزارتی جماعتوں سے سودا کرنیکے قابل سمجھنے لگے۔ اب انہوں نے یہہ مطالبہ کیا کہ کم از کم داخلی امور میں تبدیلیاں کی جائیں بلجیم کی حکومت کو قائم کیا جائے برسٹلیٹو سک (Brest litovsk) اور بخارسٹ کے معاہدات کو رد کردیا جائے۔

ستمبر ۱۹۱۸ء میں بلغاریہ نے صلح کی خواہش ظاہر کی سوشل ڈیمو قراط نے یہہ سمجھا کہ اس کھیل کے سارے پتے ان ہی کے ہاتھ میں ہیں اس لئے انہوں نے اپنی امداد کی قیمت طلب کی کہ ملک میں پارلیمانی نظام قائم کیا جائے۔ ہرٹ لنگ اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس کو مستعفی ہونا پڑا اس کے بعد شہزادہ میاکس آف بیڈن کو پارلیمانی طریقے کے مطابق چانسلر بنایا گیا۔

شہزادہ میاکس نے ابتدا ہی میں یہہ اعلان کیا کہ وہ صلح کرنی نہیں چاہتا بلکہ صدر ولسن سے بعض امور کے متعلق اپیل کرے گا۔ یہ اعلان نہیں تھا، میکس کی چانسلری کے لئے موت کی گھنٹی تھی۔ عہدہ داران فوج بھی صلح کا مطالبہ کررہے تھے۔ نتیجہ یہہ ہوا کہ کیل Kiel اور ول ہل شیون Wilhelmshaven میں غدر ہوا۔

سوشل ڈیمو قراط نے اب حکومت کو دھمکی دی جس کا نتیجہ یہہ ہوا کہ میونچ کو ایک جمہوریہ بنا دیا گیا میاکس اپنے عہدے سے چمٹا ہوا تھا۔ اس نے ایک آخری چال یہہ چلی کہ سوشل ڈیمو قراط کو کابینہ میں شریک کرنا چاہا لیکن اشتراکیین اڑے ہوئے تھے کہ ان کے گذشتہ شرائط کو تسلیم کرلیا جائے۔ میاکس نے ان شرائط کو تسلیم کرلیا۔ گستاؤ بوائیر Gustavaurer شیڈمن اور ڈیوڈ ۳ر اکتوبر ۱۹۱۸ء کو کابینہ میں شریک ہوئے اب انہوں نے دستور کو عمومی بنانا چاہا۔

یکم نومبر کو سوشل ڈیمو قراط نے شیڈمن کی قیادت میں میاکس کو مجبور کیا کہ وہ بادشاہ کو تخت سے اتار دے۔ میاکس نے بادشاہت کو برقرار رکھنے کے لئے لاکھ جتن کئے مگر اس کی ایک نہ چلی ۹ر نومبر کو

قیصر تخت پر جلوہ فگن تھا۔ میاکس نے اپیلیں کیں لیکن شیڈمن نے کابینہ میں استعفا دیدیا۔ ایک بے چینی پھیل گئی۔ جس نے انقلاب کی صورت اختیار کرلی۔ اور اس انقلاب میں سپاہی بھی شریک تھے۔ ۹ر نومبر کی صبح کو اشتراکی قائدین کا ایک جلسہ ہوا اور بالاتفاق یہہ طے پایا کہ قیصر کو تخت سے اتار دیا جائے فوجی عہدیدار پہلے ہی سے آگاہ ہوگئے انہوں نے برلن میں فوجی پڑاؤ ڈالدیا تاکہ تخت کی حفاظت کی جائے اوٹوولز (Ottowels) کی تقریروں نے سحر کا کام کیا۔ چند گھنٹوں کے اندر برلن کی ساری فوجیں عوام کے ساتھ ہوگئیں اور جب یہہ خبر برلن سے سپا (Spa) پہنچی تو ولیم دوم فرار ہوگیا اور جمہوریہ قائم کردیا گیا۔

میاکس نے ریشتاغ میں اعلان کردیا کہ شہنشاہ نے تخت سے دست برداری کرلی ہے حالانکہ یہہ خلاف واقعہ تھا۔ قیصر اٹھائیس نومبر سے پہلے تخت سے علیحدہ نہیں ہوا۔ میاکس کو بھی بالآخر مستعفی ہونا پڑا اور اس کی جگہ ایبرٹ سوشل دیموقراط کا لیڈر چانسلر بن گیا خطرہ اب بھی باقی تھا۔ لیپ نچٹ ایک اشتمالی جمہوریہ کے قیام کی فکر کررہا تھا اور شیڈمن جرمن جمہوریہ قایم کرنا چاہتا تھا۔ ایبرٹ دستوری بادشاہت کے قیام کی کوشش کررہا تھا۔ ایک طرف یہ منصوبے تھے اور دوسری طرف قدرت جرمنی کی تاریخ بنا رہی تھی۔ جرمن ریاستوں کے حکمرانوں کو معزول کردیا گیا تھا یا وہ خود تخت سے دست بردار ہوگئے تھے شہنشاہی پارلیمان تحلیل کردی گئی تھی۔ قومی اسمبلی کے انعقاد کے انتظامات کئے جارہے تھے دستوراً جمہوریت کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ اور شیڈمن اس کا پہلا وزیر اعظم تھا۔

یہہ انقلاب دراصل آزاد اشتراکیوں کا کرا دھرا تھا انہیں روس سے مالی امداد ملی اور ان انقلابیوں نے تمام ذرائع حمل ونقل پر قبضہ کرلیا۔ دارالسلطنت کا محاصرہ کرلیا گیا اُس موقع پر اشتراکیین کی اکثریتی جماعت نے مداخلت کی اور آزاد خیال اشتراکیوں سے گفت وشنید ہونیکے بعد حالات کو سنبھال لیا۔ ۱۰ر نومبر کو ایک کونسل آف کمشنرز قایم کی گئی اس میں تین سوشل دیموقراط ایبرٹ، شیڈمن اور لیانڈبرگس تھے، اور تین آزاد خیال اشتراکی ہیس، ڈیٹ من اور بارتھ تھے۔ طرفہ ماجرا یہ ہوا کہ تمام وزارتی عہدیدار اس نئی ہیئت حاکمیہ کے تحت کام کرنے کے لئے تیار ہوگئے۔ کونسل نے سب سے پہلا

کام یہہ کیا کہ ایک کابینہ بنائی اور اس کی سخت ضرورت بھی تھی۔ اس لئے کہ مقامی حکومت پر فوج نے قبضہ کر رکھا تھا اور عام رعایا ان کے ظلم وستم کا شکار بنی ہوئی تھی۔ یہہ نئی کابینہ بھی عجیب وغریب تھی چونکہ اسمیں صرف ایک شخص وارم (Warm) اشتراکی تھا۔ ان اشتراکیوں کے اقتدار کا بہرحال بول بالا تھا انہوں نے آناً فاناً وہ سب کچھ کیا جس کے لئے وہ بیس سال سے کوشش کر رہے تھے۔ حالت محاصرہ کو برخاست کردیا گیا۔ اجتماعات اور جلسوں پر جو پابندیاں عائد تھیں وہ اٹھالی گئیں۔ پریس کو آزادی دی گئی۔ سیاسی قیدیوں کو معافیاں عطا کی گئیں۔ خانگی ملکیت کے تحفظ کے لئے قانون منظور کیا گیا۔ زرعی فردوروں کے لئے خاص احکام نافذ کئے گئے۔ خانگی ملازموں پر جو پابندیاں عائد کی گئیں تھیں انہیں اٹھالیا گیا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہہ ہے کہ بیس سال سے زائد عمر والوں کو حق رائے دہی عطا کیا۔ مارچ ۱۹۱۸ء میں بین اتحادی اشتراکی اور بین قومی فردور کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ ان کانفرنسوں نے جنگی مقاصد کے متعلق ایک بیان شائع کیا اور دول وسطیٰ کی اشتراکی جماعتوں کے پاس اس کو روانہ کیا۔ ان جماعتوں نے اس کے جوابات بھی دیدئے یہہ گفت وشنید ہو رہی تھی کہ ۱۹۱۸ء کے موسم گرما میں عارضی سمجھوتہ کا اعلان ہوگیا۔

فرانس میں جنگ کے آخری چند مہینوں میں انتہاپسند اشتراکیوں نے بڑی طاقت حاصل کرلی۔ سالانہ کانگریس میں جین لونگے نے یہہ تحریک پیش کی کہ ایک بین قومی کانفرنس منعقد کی جائے۔ یہ تحریک ایک ہزار پانچسو چوالیس کے بمقابل ۲۷،۱۱ آرا رسے کامیاب ہوگئی۔ اس طرح یہہ جماعت جو پہلے اقلیت میں تھی اب اس کی اکثریت ہوگئی۔ فبروری ۱۹۱۹ء میں پیرس کی قومی کانگریس نے یہہ فیصلہ کیا کہ جنگی قرضوں کی تائید میں رائے نہ دی جائے لیکن جنگ تو کب کی ختم ہوچکی تھی!۔

اشتراکی تحریک پر جنگ کے چار اثرات مترتب ہوئے۔

(۱) تقریباً ہر متحارب ملک کے اشتراکی جنگ کے موید ہوگئے تھے

(۲) ۱۹۱۵ء میں ان میں پھوٹ پڑگئی ایک جماعت جنگ کی موید تھی اور دوسری مخالف۔

(۳) ۱۹۱۶ء و ۱۹۱۷ء میں اشتراکیوں میں مزید اختلافات پیدا ہوگئے۔ زمروالدمین اور اشتمالی فریق پیدا ہوگئے۔

(۴) پہلی دو جماعتوں نے جنگ کے آخری سال میں تیسری جماعت کے خلاف ایکا کیا۔ لیکن اس وقت تک وہ عوام کی ہمدردیاں کھو چکے تھے۔

اشتراکیت ایک عالمگیر اور بین قومی تحریک ہے۔ قوم، مذہب، نسل اور رنگ کی بنیاد پر وہ انسانیت کی تقسیم نہیں کرتی۔ اس کے فلسفہ اجتماعیت میں صرف دو ہی طبقوں کا تصور ہے بورژوازی اور پرولتاری یا دارندے اور نادار۔ پرولتاری، خواہ کسی قوم کے ہوں یا کسی ملک کے وہ سب ایک ہیں کیونکہ ان کا معاشی مفاد ایک اور ان کی معاشی منزل مقصود ایک ہے۔ "دنیا کے مزدورو! ایک ہو جاؤ" کارل مارکس نے اپنے اس نعرہ میں اشتراکیت کے سارے فلسفہ اجتماعیت کا نچوڑ بیان کر دیا ہے۔ جنگ عظیم نے پہلی مرتبہ یہ بتلایا کہ انسانی فطرت بڑی کج مج واقع ہوئی ہے۔ انسان نے ابھی جذبات کے دھارے پر بہنا نہیں چھوڑا ہے۔ جنگ عظیم میں اشتراکیت کے بین قومی اصولوں اور قومی حسیات، جذبات وتوہمات کے درمیان ٹکر ہوئی۔ اور قومی جذبات کے طوفان میں یہ سطحی اشتراکی اصول بہہ گئے!! تحریک کے اصول اپنی جگہ کتنے ہی سچے کیوں نہ ہوں، لیکن تحریک کی کامیابی کا انحصار صرف ان ہی پر نہیں ہے، تحریک کے کارپردازوں کی استقامت، اور ایثار در اصل اس کی کامیابی کے ضامن ہیں۔ اور جن تحریکات میں انسانی فطرت کے تنوع کا خیال نہیں رکھا جاتا ان تحریکات کو چلانا گویا پانی پر نمک کی دیواریں بنانا ہے۔ جنگ عظیم نے اشتراکیت کے بین قومی، عالمگیر اصولوں کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا ——— اور موجودہ جنگ میں تو اشتراکیت نے سرمایہ داری کا دامن تھام لیا ہے!! اشتراکیت و سرمایہ داری کے اس معانقہ سے کیا نتائج برآمد ہوں گے؟ ان میں سے کون آگے بڑھ کر دوسرے کو اپنائے گا" یا ان دونوں کے امتزاج سے ——— اگر ایسا امتزاج ممکن ہو سکے ——— کون سے نظام نو کی تخلیق ہوگی؟ قدرت کے نامعلوم قلم نے اس کا فیصلہ کر دیا ہے ——— مستقبل کا مورخ اسی فیصلہ کو سنائے گا۔

احمد خان بی۔ اے (عثمانیہ)
سابق مہتمم مدیر مجلہ عثمانیہ

خواب کی تصویر

(۱)

" تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے " زارکوف نے اخبار میز پر رکھتے ہوئے کہا
" کیوں ؟ " میں نے پوچھا
" کہتے ہیں کسی زمانے میں مرد گھر کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے اور عورتیں شکار اور کھیتی باڑی کرکے خاندان کی پرورش کیا کرتی تھیں "
" خیر تو ہے ؟ " میں نے شرارت سے پوچھا " کیا مادام زارکوف سے پھر لڑائی ہوئی ؟ "
" نہیں یار ! " اس نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا " یہ دیکھو کیا لکھا ہے اخبار میں "
میں نے اخبار اٹھایا ... ایک حسین عورت کی تصویر کے نیچے لکھا تھا " مدموازل جولیا رولان "
اور ساتھ ہی یہ خبر تھی کہ مدموازل جولیا کو رودین کے سائنس کالج میں نظریہ روانیات پر لکچر دینے کے لئے بلوایا گیا ہے اور وہ کل صبح وہاں پہنچنے والی ہیں ۔
" دیکھا ؟ " زارکوف نے اپنے مخصوص انداز میں کہا " کیا کر رہی ہیں لڑکیاں "
" بات دراصل یہ ہے " میں نے کہنا شروع کیا " عورتوں کے پاس سکونِ قلب بہ نسبت مردوں کے زیادہ ہوتا ہے ۔ اس لئے وہ آسانی سے عالم فاضل نہ جانے کیا کیا بن جاتی ہیں "
" نہیں " اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا ۔ اس کے بشرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کوئی بیوقوفی کی بات کرنے والا ہے " یہ بات نہیں ۔ اگر ایسا ہوتا تو ہمیشہ عورتیں ہی قابل اور لائق ہوا کرتیں ۔ یہ تو اس دور کی کرامت ہے

اصل میں اس جنگ نے بہت سے قابل مرد مار ڈالے ہیں اس لئے اب عورتیں شہرت پا رہی ہیں"
میں ہنستے ہوئے اٹھا اور جیب سے بٹوہ نکالا لیکن حسب عادت زارکوف نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کافی کے دام خود ادا کئے ـــــ ہم دونوں ہوٹل سے باہر نکل گئے۔

(۲)

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور میں نے ریسور اٹھایا۔ زارکوف بول رہا تھا۔
"سنا تم نے" اس نے کہا "مدموازل جولیا نے روین میں کوئی لکچر نہیں دیا"
"تمہیں اس عورت سے اتنی دلچسپی کیوں ہے ؟" میں نے سوال کیا" ان چھ دنوں میں کیا تم اسی کے نام کی مالا جپ رہے تھے ؟"
"اخبار میں لکھا ہے" اس نے حسب عادت میرے اعتراض کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا " وہ روین گئی ہی نہیں"
"نہ گئی ہوں نہ سہی" میں نے قدرے درشتی سے کہا" ان عورتوں کا کوئی اعتبار ہے ؟"
"واہ !" اس نے اپنی سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے جواب دیا" مدموازل جولیا کا اعتبار نہیں ؟ وہ تو ڈی۔ ایس سی ہیں ..... کیمیا کی"
مجھے غصہ آگیا
"مجھے اس وقت بہت کام کرنا ہے زارکوف" میں نے غصہ کو ضبط کرتے ہوئے کہا" یہ مہمل گفتگو پھر کبھی کرلینا"
میں نے فون رکھ دیا اور کام میں مشغول ہوگیا۔ ایک مقدمہ عدم سراغ میں ختم کرو یا جا رہا تھا۔ ایک پولس کے عہدہ دار کے لئے اس سے زیادہ کوفت کا اور کونسا موقعہ ہوسکتا تھا۔ ایسے وقت زارکوف کی بکواس میرے لئے اور تکلیف دہ ثابت ہو رہی تھی۔ دفتر برخاست کرکے میں باہر نکلا ہی تھا کہ زارکوف مل گیا اور ہم دونوں رستوران میں داخل ہوئے۔

زارکوف میرے ان عزیز ترین دوستوں میں سے ایک تھا جن سے مجھے بے حد محبت تھی۔ اسکا موروثی تمول اس کی بیکاری اور فضول خرچی کا باعث تھا۔ اس کی گفتگو ہمیشہ بے ربط اور بظاہر مہمل معلوم ہوتی تھی

لیکن اکثر مجھے محسوس ہوتا تھا کہ اس کی تیز نگاہ سربستہ رازوں کی تہ تک نہایت کامیابی کے ساتھ پہنچ جانیکی صلاحیت رکھتی ہے گو اسکی روز روشن کی طرح واضح بیوقوفیاں میرے اس اعتقاد کو بسا اوقات متزلزل کر دیا کرتیں لیکن اس کے باوجود اپنے تفتیشی معاملات میں میں اس سے اکثر گفتگو کر لیا کرتا۔ اس کے لئے یہ وقت گذاری کا ایک مشغلہ تھا جس پر وہ نہ صرف مسرور بلکہ نازاں رہا کرتا۔

"ہاں.. تو.. مادموازل جولیا.... اس نے کافی کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہنا شروع کیا

"آخر بات کیا ہے؟" میں نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا "کیا تمہیں مدموازل جولیا سے عشق ہو گیا ہے؟"

"بات یہ ہے" اس نے کافی کا ایک گھونٹ لیکر ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "مجھے اس میں بو آرہی ہے"

"کافی میں؟" میں نے پوچھا

"نہیں یار!" اس نے کہا "مادموازل جولیا کے روین نہ پہنچنے میں"

"کاہے کی بو؟" میں نے سوال کیا

"جرم کی" اس نے کہا

"کوئی لازمی امر تو نہیں" میں نے کافی ختم کر کے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا "ممکن ہے مدموازل کی طبیعت خراب ہو گئی ہو۔

"لیکن وہ گھر پر نہیں ہے" اس نے نہایت رازدارانہ انداز میں کہا

"گھر پر نہیں ہے!!!" میں نے حیرت سے پوچھا "کب سے؟"

"جس دن سے وہ روین جانے کے ارادے سے گھر سے نکلی"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"میں نے فون کر کے اس کی ماں سے دریافت کیا تھا"

زارکوف نے بل ادا کیا اور ہم تیزی سے باہر نکل گئے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ زارکوف اتنا بیوقوف نہیں ہے جتنا کہ اکثر میں سمجھتا رہا ہوں۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" زارکوف نے پوچھا
"مادام رولان سے گفتگو کرنی چاہیے" میں نے جواب دیا
"میں نے اس کے گھر کا پتہ معلوم کر لیا تھا" اس نے کہا "چلو اس سے مل لیں"
"فون کر لیں گے" میں نے کہا اور ایک پبلک فون کی طرف چلا
"نمبر کیا ہے؟" میں نے پوچھا "تمہیں یاد ہو گا نا"
"۲۹۰۵ ـ ۷" اس نے اپنی نوٹ بک دیکھ کر کہا
یکے بعد دیگرے کئی سکے میں نے فون کی نذر کر دئیے لیکن مادام رولان سے فون نہ مل سکا
"بیکار ہے" میں نے تھک کر کہا "معلوم ہوتا ہے مادام کسی سے طویل گفتگو میں مصروف ہیں"
"پتہ تو معلوم ہے نا" اس نے کہا "میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ اس کے گھر چلیں"
"تم دور اندیش بھی ہو اور کارآمد بھی۔ ۔ زارکوف" میں نے اسے خوش کرنے کے لئے کہا اور اس نے دانت دکھا دیئے۔

کارڈ بھیجنے پر ہمیں فوراً اندر بلوا لیا گیا۔ یہ ایک اعلیٰ پیمانہ پر سجایا ہوا مکان تھا جس سے صاحبِ خانہ کے تمول کا بخوبی اندازہ ہو سکتا تھا۔ مادام رولان ملاقاتی کمرے میں ہماری منتظر تھیں۔ پاس ہی ٹیلیفون دھرا تھا۔

"مجھے اس وقت آپ ہی کی ضرورت تھی" مادام رولان زارکوف سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا
زارکوف نے اپنی اہمیت کا اظہار مادام کی زبان سے سن کر دانت دکھانے شروع کئے لیکن معاً غلط فہمی کے خیال سے وہ سنجیدہ ہو گیا

"موسیو لارل آپ ہیں" اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا
"اوہ معاف فرمانا" مادام رولان میری طرف متوجہ ہوئیں "تشریف رکھئے نا"
ہم لوگ بیٹھ گئے۔
"خیریت سے تو ہیں آپ؟" زارکوف نے استفسار کیا

"سخت پریشانی میں ہوں صاحب" مادام رولاں کی آنکھوں میں آنسو آرہے تھے "میری بچی لاپتہ ہے"

"ہم اسی سلسلے میں آپ سے کچھ پوچھنے آئے ہیں" میں نے کہا

"میں خود نہیں جانتی کہ واقعہ کیا ہے" مادام نے جواب دیا "سارے پیرس اور اس کے نواح میں، جہاں جہاں جولیا کے جانے کے امکانات تھے فون کرکے پوچھا۔ دن بھر فون کرتی رہی۔ پیرس اور روین کے درمیان سارے اسٹیشنوں پر جوابی تار بھیجے جن میں سے اکثر کے جواب بھی آچکے ہیں.... کہیں کوئی پتہ نہیں۔ خود مجھے بھی اس کی گمشدگی کی اطلاع اس وقت ملی جب کسی نے مجھ سے فون پر کہا"

"جی وہ میں ہی تھا" زارکوف نے کسی قدر فخر کے ساتھ کہا

"آپ کو کیسے اطلاع ملی؟" مادام نے پوچھا

"میرا تعلق پولس سے ہے"

"آپ کیا... انسپکٹر ہیں"

"نہیں... میں موسیو لاآرل کا دوست ہوں"

مادام روان کے متفکر چہرے پر تھوڑی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ میری طرف متوجہ ہوگئیں۔

"ہوا یہ موسیو" مادام نے کہنا شروع کیا "کہ روین کے سائنس کالج میں جولیا کو لکچر دینے کے لئے بلوایا گیا تھا۔ اس کو ایسی دعوتیں اکثر آتی رہتی ہیں اسی لئے ہمارے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ مغرب کے قریب وہ تیار ہوئی اور اسٹیشن چلی گئی۔ عموماً میں اس کے ساتھ اسٹیشن تک جایا کرتی تھی لیکن اس دفعہ زکام کی وجہ سے نہ جاسکی۔ بس اتنا مجھ سے قصور ہوا موسیو۔ آج اسے گئے ہوئے چھٹا دن ہے اور اس کی کوئی اطلاع نہیں"

"قطع کلامی معاف" میں نے پوچھا "اس دوران میں مدموازل کا کوئی خط یا تار آیا تھا؟"

"کوئی نہیں موسیو ... نہ میں نے ہی اس کو کوئی خط لکھا کیونکہ مجھے اس کا پتہ نہیں معلوم تھا ہمیشہ وہ کسی مقام پر پہنچنے کے بعد اپنے پتہ سے مجھے مطلع کر دیا کرتی ہے۔ اس کا خط نہیں آیا تو میں نے خیال کیا کہ شاید اسے جلد لوٹ آنا ہے۔ بس روز یہی انتظار رہتا تھا موسیو .. اور ہر روز میں سمجھتی تھی کہ وہ آرہی ہے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے میرے دل پر کیا گذر رہی ہے۔ میری اکلوتی بچی اس قدر قابل۔ اس قدر نامور۔ اتنی حسین۔ اتنی کمسن۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے موسیو۔ پاک مریم اسے بہ عافیت لائے۔ مشکل سے پچیس سال کی ہوگی۔"

"مدموازل کے ساتھ قیمتی سامان تو نہیں تھا؟" میں نے پوچھا

"سامان تھا ہی کیا موسیو" مادام نے کہا "چند کتابیں۔ کچھ کپڑے ..... ہاں کچھ روپیہ ساتھ تھا"

"کتنا" میں نے پوچھا

"کوئی دس ہزار فرانک" مادام نے سادگی سے کہا

"دس ہزار فرانک!؟؟" حیرت کے مارے میری اور زارکوف کی زبان سے بیک وقت نکلا" اتنا روپیہ ساتھ رکھنے کی کیا ضرورت تھی"

"اس کا خیال کالج کو عطیہ دینے کا تھا" مادام نے جواب دیا "وہ اکثر اداروں کو دیا کرتی ہے۔ بڑی فیاض ہے موسیو"

"لیکن اتنی رقم ساتھ لیجانے کی کیا ضرورت تھی؟" زارکوف نے کہا "چک بک لیجا سکتی تھیں"

"بنک کا کاروبار میرے نام سے چلتا ہے" مادام نے جواب دیا

"اچھا یہ تو بتائیے" میں نے پوچھا "مدموازل کے ساتھ اسٹیشن کون گیا تھا؟"

"صرف شوفر" مادام نے کہا "اور شوفر کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ اسٹیشن پر ڈاکٹر کارلو اور ڈاکٹر زیران بھی آئے تھے"

"یہ کارلو اور زیران کون ہیں؟"

"یہ جولیا کے بہت گہرے دوست ہیں۔ جولیا ان کی ہم جماعت رہ چکی ہے۔"

"کیا آپ نے ان دونوں کو فون کیا تھا؟"

"ہاں۔ کیا تھا۔ مگر دونوں نے جولیا سے لاعلمی ظاہر کی۔ دونوں کو اس کا اعتراف ہے کہ وہ اسٹیشن تک گئے تھے۔ اور ان کے سامنے جولیا نے ٹکٹ خریدا اور ریل میں سوار ہوئی"

"ہو سکے تو ان دونوں سے کہدیجئے کہ وہ مجھ سے مل لیں" میں نے کہا" بس ان سے کچھ سوالات کرونگا"

"بہت اچھا موسیو" مادام نے جواب دیا" آپ جو کہیں میں کرنے کو تیار ہوں مگر میری جولیا کو کسی طرح ڈھونڈ نکالئے"

"خدا نے چاہا تو وہ بہت جلد آپ سے آملینگی" میں نے مادام کو تسلی دینے کے لئے کہا اور ہم باہر نکل آئے

(۳)

دوسرے دن سارے اخبارات میں مدموازل جولیا رولان کی گمشدگی کی خبر تھی۔

دفتر میں داخل ہوا ہی تھا کہ مجھے اطلاع ملی کہ مادام رولان نے مجھے دو دفعہ ٹیلیفون کیا تھا۔

میں نے اپنے کمرے میں پہنچتے ہی مادام کو فون کیا۔

میں بڑی دیر سے آپ سے گفتگو کرنیکی منتظر تھی" مادام نے فون پر کہا" ساور سے ٹیلگرام کا جواب آیا ہے کہ چھ روز قبل ایک نوجوان عورت ٹرین میں بیہوش ہو گئی تھی۔ دو آدمیوں نے جو مسافر تھے اور غالباً خاتون کے ساتھ تھے انہیں ایک قلی کی مدد سے اسٹیشن کے باہر ٹکسی تک پہنچایا اور شاید دواخانے لے گئے۔ مگر وہاں کے دواخانے میں وہ نہیں ہیں ..... میں نے یہاں کے دواخانوں کو بھی فون کر کے پوچھ لیا۔ کہیں جولیا کا پتہ نہیں ہے"

"یہ بہت قیمتی اطلاع ہے" میں نے مادام کو یقین دلاتے ہوئے کہا" اب ہم بہت جلد کھوج لگا لینگے"

میں نے بھی اپنی طرف سے پیرس اور ردبن کے درمیان واقع ہونے والے تمام اسٹیشنوں کے تھانوں پر تار بھیج دیئے کہ مدموازل جولیا رولان سے متعلق کوئی اطلاع ہو تو فوراً مجھے آگاہ کر دیا جائے۔

سہ پہر کے قریب ساور سے تار وصول ہوا کہ ایک شخص دو روز قبل ایک سونے کی گھڑی جس پر لفظ "جولیا" کھدا ہوا ہے فروخت کرتا ہوا پکڑا گیا اور زیر حراست ہے۔ میں نے جواب دیا کہ اسے فوراً میرے پاس روانہ کر دیا جائے۔

(۴)

"ہولآرل!" زارکوف نے میرے آفس میں داخل ہوتے ہوئے کہا "کہو کہاں تک پہنچے؟"

"مادام رولان کے پاس ساور سے تار وصول ہوا ہے کہ ایک خاتون ٹرین میں بیہوش ہوگئی تھیں جنھیں دو مسافروں نے جو سمجھا جاتا ہے کہ ان کے ساتھی تھے اتار ااور ایک قلی کی مدد سے ٹکسی میں ڈال کر دواخانہ لے گئے۔ اور میرے پاس ساور کے تھانے سے ایک شخص گرفتار ہوکر آیا ہے جو ایک گھڑی فروخت کرتا ہوا پکڑا گیا۔ اس گھڑی پر لفظ "جولیا" کندہ ہے۔ ملزم سے دریافت کیا جارہا ہے کہ اس نے گھڑی کہاں سے پائی"

"کچھ پتہ چلا" اس نے پوچھا

"اب چل جائیگا" میں نے جواب دیا "گرفتار شدہ شخص ایک عادی مجرم ہے۔ پاریلی اس کا نام ہے۔ اس سے قبل بھی سرقہ کے الزام میں سزا پاچکا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہیں ابکی بار اس نے قتل نہ کیا ہو"

"قتل!!!" زارکوف نے تعجب سے کہا "نہیں جی۔ قتل کر کے کہیں کوئی شخص صرف گھڑی چراتا ہے؟"

"صرف گھڑی کیوں؟" میں نے پوچھا "اور سامان بھی تو تھا۔ ممکن ہے اس نے کہیں چھپا رکھا ہو"

"واہ" اس نے کہا "نقد دس ہزار فرانک جس چور نے چرائے ہوں کیا وہ گھڑی بیچنے بازار میں جائیگا۔ اگر بازار میں جائے بھی تو موٹر خریدنے جاسکتا ہے۔ کچھ بیچنے تو نہیں جاسکتا۔"

میں لاجواب ہوگیا

"مدموازل کے ساتھ جو رقم تھی اس کے نوٹوں کے نمبر معلوم کئے تم نے؟" اس نے پوچھا

"نمبر خود مادام رولان کو یاد نہیں . . . اور نہ کوئی دوسرا ان سے واقف ہے"

"آخر یہ پاریلی کہتا کیا ہے؟" کچھ سوچ کر اس نے سوال کیا

"کہتا ہے اس نے گھڑی ساور کے اسٹیشن پر پڑی ہوئی پائی"

"ذرا چلو تو اس کے پاس" زارکوف نے کہا

پاریلی کے ساتھ پورا تفتیشی برتاؤ کیا جارہا تھا لیکن وہ یہی کہتا تھا کہ اس نے گھڑی اسٹیشن پر پڑی ہوئی پائی۔"

" دیکھو " میں نے کہا " اگر تم اس گھڑی کی مالکہ کا پتہ نہ بتلاؤ گے تو تمہارے ساتھ بہت برا برتاؤ کیا جائیگا "

" مجھے نہیں معلوم " اس نے کہا " میں سچ کہتا ہوں مجھے نہیں معلوم "

" سنو پاریلی " زارکوف نے نہایت نرمی سے کہنا شروع کیا " تم اصل واقعہ سے ناواقف ہو۔ تم چوری کے الزام سے تو بچ نہیں سکتے کیونکہ مال مسروقہ تمہارے پاس سے برآمد ہوا ہے اور تم اسے فروخت کرتے ہوئے پکڑے گئے ہو مگر اصل بات یہ ہے کہ اس گھڑی کی مالکہ لاپتہ ہے اور سمجھا جارہا ہے کہ اسے مار ڈالا گیا۔ تم جس قدر اصل واقعات کے اخفا کی کوشش کروگے اپنے آپ کو قاتل ثابت کرتے جاؤ گے "

پاریلی سوچنے لگا

" تم اگر واقعات سچ سچ بتلادو گے تو ہم تمہارے ساتھ رعایت کریں گے " میں نے کہا

" سنئے موسیو " بالآخر پاریلی نے کہنا شروع کیا " اب میں سب کچھ بتلادوں گا۔ ساآدر کے اسٹیشن پر ایک صاحب اسٹیشن سے اترے۔ میں بھی اتر کر کھڑا ہوا تھا اور ٹکٹ چیکر کی نظر بچا کر باہر نکلنے کا موقعہ ڈھونڈ رہا تھا۔ انھوں نے ٹرین سے ایک خاتون کو اتارا جو بیہوش تھیں۔ میں ان کی مدد کے لئے بڑھا انھوں نے ایک کانسٹبل سے کچھ کہا۔ وہ باہر چلا گیا۔ اس کے بعد ایک قلی کے ذریعے اپنا سامان اتروایا۔ پھر میرے پاس آئے۔ ہم دونوں نے مل کر خاتون کو اسٹیشن کے باہر پہنچایا۔ کانسٹبل نے ٹکسی تیار کر رکھی تھی۔ خاتون کو لیکر وہ صاحب ٹکسی میں بیٹھ گئے اور ٹکسی چلی گئی مجھے خبر نہیں وہ کون تھے اور کہاں گئے البتہ یہ گھڑی خاتون کے ہاتھ پر بندھی ہوئی تھی جو میں نے نکال لی "

" پھر جھوٹ کہہ رہے ہو تم " میں نے ڈانٹ کر کہا

" قسم ہے یسوع مسیح کی میں سچ کہہ رہا ہوں موسیو " پاریلی نے انگلی سے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے کہا " اگر میں جھوٹ کہہ رہا ہوں تو مسیح میرا کفارہ نہ ہوں "

" اعتبار کرنا بھی تو سیکھو " بڑے ہی بزرگانہ انداز سے زارکوف نے کہا

" اعتبار ؟ " میں نے ہنس کر کہا " چور پر "

" تم پولس والوں نے کبھی خود اپنے آپ پر بھی اعتبار کیا ہے ؟ " اس نے کہا

" اُن لوگوں کو پہچان سکتے ہو" میں نے زارکوف کی بات اڑاتے ہوئے پاریلی سے پوچھا۔
" اگر آپ اُن دونوں کو سامنے لائیں تو ممکن ہے پہچان سکوں" اس نے کہا "اس وقت میں ان دونوں سے زیادہ گھڑی کی طرف متوجہ تھا۔"
" مرد کا حلیہ بیان کرسکتے ہو ؟"
" صرف اتنا یاد ہے کہ عینک لگائے ہوئے تھا "
" وہ بھی شاید اس لئے یاد رہگیا تھیں، کہ اس عینک کا فریم یا زنجیر سونے کی تھی" زارکوف نے کہا
" جی ہاں موسیو" اس نے اتنی سادگی سے کہا کہ ہم ہنسی ضبط نہ کر
فی الحال اسے حوالات میں رکھنے کی ہدایت دیکر ہم چلے آئے

(۵)

" کافی کڑیاں مل گئی ہیں زارکوف " میں نے کہا
" ممکن ہے" اس نے بے نیازی سے جواب دیا
" باقی کڑیاں ڈاکٹر کارلو اور ڈاکٹر زیران سے ملاقات کے بعد مل جائیں گی "
" کیسے ؟" اس نے معصومیت سے استفسار کیا
" ان سے معلوم ہوجائیگا کہ مدموازل کیسا تھ ٹرین میں کون تھا "
" وہ کس طرح ؟"
" وہ جب مدموازل کو چھوڑنے کیلئے گئے تھے تو کافی دیر تک ڈبہ کے پاس ٹھیرے ہوں گے اور لازمی بات ہے کہ ڈبہ کا انہوں نے جائزہ لیا ہوگا اور ہر اس آدمی کو جو ڈبے میں بیٹھا ہوا تھا دیکھا ہوگا"
" دیکھا تو ہوگا " زارکوف نے کہا
" لیکن اگر ڈبے میں بہت سے آدمی تھے تو . . . "
" لاارل !" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا "تم پولس والے ہو۔ اپنی صفات کو بڑی سختی کے ساتھ برقرار رکھتے ہو . . . اگر ڈبہ میں زیادہ آدمی ہوتے تو کیا اس قسم کا واقعہ ہوسکتا تھا ؟"

" ممکن ہے، موازل واقعی بیہوش ہو گئی ہوں" میں نے جواب دیا" اور کوئی بدمعاش ان کا ساتھی بن کر انہیں معہ سامان کے اُتار لے گیا ہو"

" اگر ڈبے میں زیادہ آدمی ہوتے تو ما.و کے لئے پارلی کیوں آتا۔ خود ڈبے میں کا کوئی معزز آدمی اس فریضہ کو انجام دیتا"

" تمہارا استدلال ٹھیک تو ہے" میں نے اعتراف کیا

" غلط بھی ہو سکتا ہے" اس نے کہا" اگر کسی درمیانی اسٹیشن پر لوگ سوار ہو گئے ہوں تو وہ اُن ڈاکٹروں کی نظروں سے بچے ہوئے رہیں گے۔ ان کے بارے میں ہم کوئی قیاس نہیں قائم کر سکتے۔"

" خیر" میں نے گفتگو کو مختصر کرنیکے لئے کہا" یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے ہمیں ان ڈاکٹروں سے مل لینا چاہئے"

(٦)

کارڈ بھیجنے پر ڈاکٹر زیران نے ہمیں فوراً اندر بلوا لیا۔ رسمی ملاقات اور کچھ غیر ضروری گفتگو کے بعد ہم اصل معاملہ کی طرف متوجہ ہوئے

" آپ ڈاکٹر ہیں ؟" زارکوف نے پوچھا

" ہاں" ڈاکٹر زیران نے جواب دیا

" آپ ملازم ہیں ؟" زارکوف نے پھر سوال کیا

" ہاں" ڈاکٹر زیران نے جواب دیا

" کس دواخانے میں ؟"

" میں کالج میں سائنس پڑھاتا ہوں"

" تو یوں کہئے آپ پروفیسر ہیں"

" آپ، موازل جولیا کو کب سے جانتے ہیں ؟" میں نے پوچھا

" بہت دنوں سے" اس نے جواب دیا" ہم چھوٹی جماعتوں سے ہم جماعت رہے ہیں"

"آپ مدموازل سے اکثر ملتے رہتے ہوں گے" زارکوف نے سوال کیا

"ہاں" ڈاکٹر نے کہا "تقریباً روز ہی"

"کیا آپ کسی ایسے شخص سے واقف ہیں جس سے مدموازل کو کبھی خطرہ محسوس ہوا ہو" میں نے پوچھا

"ایسا تو کوئی شخص میری نظروں میں نہیں ہے" اس نے قدرے سوچ کر جواب دیا "وہ ایسے اچھے صفات کی لڑکی ہے کہ اس سے کسی کو عداوت ہو ہی نہیں سکتی"

"آپ غالباً مدموازل کو چھوڑنے کے لئے اسٹیشن تشریف لے گئے تھے" میں نے پوچھا

"جی ہاں" ڈاکٹر نے جواب دیا "میں اور کارلو اسٹیشن تک گئے تھے"

"آپ لوگ گاڑی کے چلنے تک رہے؟"

"میں آخر تک رہا لیکن کارلو کچھ دیر قبل ہی واپس ہوگیا۔ اس کو شاید کچھ ضروری کام تھا"

"کیا آپ کو یاد ہے کہ ڈبے میں مدموازل کے ساتھ کس قسم کے آدمی تھے؟"

"ڈبہ خالی تھا" ژیران نے جواب دیا اور زارکوف میری طرف دیکھ کر مسکرایا

"ڈاکٹر کارلو کیا آدمی ہے؟" میں نے پوچھا

"فرشتہ ہے" ڈاکٹر ژیران نے کہا "اس کے لئے ہر نیکی ممکن اور ہر بدی ناممکن ہے۔ بے انتہا سنجیدہ اور پرخلوص آدمی ہے۔ جھوٹ تو کیا شاید مبالغہ کا بھی اس کی باتوں میں شائبہ نہیں ہوتا۔ اسکی راست گوئی اور ایثار کالج میں ضرب المثل تھے"

"ضرورت ہو تو ہم آپ کو پھر تکلیف دیں گے" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "اگر آپ کو کوئی کارآمد خبر ملے تو ہمیں مطلع کر دیجئے"

"اسی قسم کے ایک اور آدمی سے ملنا رہ گیا" زارکوف نے باہر نکلتے ہوئے کہا

"چلو ابھی چلیں" میں نے جواب دیا — اور ہم کارلو کے گھر کی طرف چلے

جیسا کہ ڈاکٹر ژیران نے بیان کیا تھا، ڈاکٹر کارلو بے انتہا سنجیدہ اور پرخلوص آدمی تھا

"ڈاکٹر!" میں نے سوال کیا "آپ اسٹیشن پر مدموازل کے ساتھ کب تک رہے"

" مجھے کچھ کام تھا " ڈاکٹر نے جواب دیا " اس لئے میں گاڑی کے روانہ ہونے سے بہت پہلے ہی لوٹ آیا "

" آپ کسی ایسے شخص کو جانتے ہیں جسے کسی بنا پر مدموآزل سے عداوت ہوسکتی ہے۔ وہ ایک مجسمۂ حسن ومحبت اور سراپا نیکی ہے ۔ آپ نہیں جانتے جولیا کن اوصاف کی لڑکی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

" اچھا اب ہم چلتے ہیں " میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا " ضرورت ہو تو پھر مل لیں گے ۔ ہاں اگر آپ کو کوئی کارآمد خبر ملے تو ہمیں مطلع کردیجئے " ہم باہر نکل آئے

" نہ جانے وہ کتنی دیر تک جولیا کی تعریف کرتا رہتا " زارکوف نے کہا " اگر ہم اسے خدا حافظ نہ کہتے "

" ایک چیز مجھے کھٹک رہی ہے " میں نے کہا " اس کے آنکھوں پر عینک تھی "

" تھی تو سہی "

" اس کی زنجیر سونے کی تھی "

" تو کیا ہوا ؟ "

" یاد ہے " میں نے کہا " پارلی کہتا تھا کہ مادموازل کے اتارنے والے کی آنکھوں پر عینک تھی جس کی عینک سونے کی تھی "

" اس نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ اس کی زنجیر سونے کی تھی "

" اس نے یہی کہا تھا " میں نے کہا " مجھے تو ڈاکٹر صاحب کچھ مشتبہ معلوم ہوتے ہیں "

" تمہاری نظر میں تو دنیا کا ہر شخص مجرم ہے " اس نے قدرے سخت لہجہ میں کہا " ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ خواہ مخواہ تمہارے سامنے آکر اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرے ۔ اور خود تم سب سے بڑے مجرم ہو۔ بے گناہوں کو پھانس لیتے ہو۔ بلاوجہ شریف آدمیوں کو پریشان کرتے ہو۔ انتہا یہ ہے کہ عدالت سے قتل کا جرم سرزد کرادیتے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بیگناہ کو پھانسی دینا قتل نہیں تو کیا ہے ۔ یہ تو ہے خود آپ کی داستان۔ چلے ہیں ڈاکٹر کارلو کو مجرم ٹھیرانے "

" کیوں ! " میں نے پوچھا " کیا وہ مجرم نہیں ہوسکتا

" اتنا سیدھا۔ اتنا پرخلوص۔ اتنا قابل . . . . . "

" خیر میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا " پھر ملیں گے۔ خدا حافظ "

(۷)

" ہلو لارل!" زارکوف نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور میرے دفتری کمرے میں داخل ہوگیا

" ہلو زارکوف!" میں نے جواب دیا " اچھے تو ہو "

" میں ہمیشہ اچھا ہی رہتا ہوں" اس نے کہا " اور تم ہمیشہ یہی پوچھتے رہتے ہو . . . اچھا یہ بتاؤ کہاں تک پہنچے؟"

" قریب الختم ہے" میں نے جواب دیا " ہر چیز کا پتہ لگ گیا "

" وہ کیسے؟"

" سنو" میں نے کہنا شروع کیا " تمہیں یاد ہے پرسوں جب ہم ڈاکٹر کارلو سے ملنے گئے تھے تو میں نے تمہیں بتلایا تھا کہ سنہری زنجیر والی عینک مجھے شبہ میں ڈال رہی ہے۔ ڈاکٹر کارلو پر شبہ کرنے سے پہلے مجھے وجہ تحریک دریافت کرنی تھی۔ تمہیں رخصت کرکے میں سیدھے مادام رولان کے مکان پر پہنچا۔ اور ان سے مجھے وہ سب کچھ معلوم ہوگیا جس کا خود انھیں بھی علم نہیں۔ اصل قصہ یہ ہے کہ مدموازل جولیا سے ڈاکٹر کارلو اور ڈاکٹر ژیران دونوں بے انتہا محبت کرتے ہیں اور دونوں شادی کے خواہشمند۔ مادام رولان نے بتلایا کہ مدموازل جولیا ڈاکٹر ژیران کی طرف زیادہ مائل ہے حالانکہ مادام کو کارلو پسند ہے۔ ژیران زیادہ حسین، زیادہ دولتمند اور بہت خوش مزاج آدمی ہے۔ ممکن ہے کہ دونوں میں شادی کا عہد و پیمان بھی ہوگیا ہو۔ چونکہ یہ تینوں ہمیشہ ساتھ رہا کرتے تھے اس لئے ناممکن ہے کہ کارلو کو اس کی اطلاع نہ ہو جوش رقابت میں ایک دل شکستہ انسان سے جو حرکت سرزد ہوسکتی ہے وہ یہ ہے کہ یا تو رقیب کو نقصان پہنچائے یا محبوبہ کو۔"

" نہ رہے بانس نہ بجے بانسری" زارکوف نے لقمہ دیا

" یہی وجہ تحریک تھی۔ اسٹیشن سے کارلو گاڑی کے روانہ ہونے سے پہلے ہی چلا گیا۔ دراصل

وہ کہیں گیا نہیں بلکہ کسی دوسرے ڈبہ میں سوار ہوگیا۔ چونکہ مدموازل کے ساتھ اور کوئی نہ تھا اس لئے جب کسی دوسرے اسٹیشن پر کارلو ان کے ڈبہ میں آکر سوار ہوا تو یہ امر مدموازل کے لئے باعث اطمینان ہی ہوسکتا تھا کیونکہ ان کے نزدیک کارلو سے خائف ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس کے بعد کارلو نے کلوروفارم کی دستی سنگھا مدموازل کو بیہوش کیا اور ساورے کے اسٹیشن پر اُتار لے گیا۔ اگر کارلو کا ارادہ قتل کرنیکا ہوتا تو وہ ٹرین ہی میں اس کام کو بخوبی انجام دے سکتا تھا اور نعش کو چھوڑ کر کسی اسٹیشن پر اتر جاتا۔ رات کا وقت تھا کوئی شبہ پیدا نہ ہوتا۔ چونکہ وہ اتار لے گیا اس لئے میرا قیاس ہے کہ وہ کہیں مقید ہے۔

جب ہم پہلی دفعہ کارلو سے ملنے گئے تھے تو میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ مدموازل کے تذکرے کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ وہ بہت سنبھل سنبھل کر بول رہا تھا۔ حالانکہ مدموازل کو چاہنے والا ڈاکٹر ژیران بھی ہے لیکن چونکہ وہ مجرم نہیں اس لئے پولس کی آمد سے اس کے چہرے پر کوئی تردد کے آثار نمایاں نہیں ہوئے۔ ساتھ ہی یہ کہ اس نے ڈاکٹر کارلو کے کردار کی دل کھول کر تعریف کی۔ اگر وہ مجرم ہوتا تو اس خیال سے کہ ہمارا ذہن کارلو کی طرف منتقل ہوجائے اس کی مذمت کرتا اور اسے مشتبہ ٹھیراتا۔

اس کے بعد میرا دوسرا اقدام کارلو کے مکان کا معائنہ تھا۔ میں نے اس انداز سے اس کا گھر دیکھا کہ اسے تلاشی کا شبہ نہ ہو۔ اس کے پاس مدموازل کی کئی چیزیں تھیں جن کے بارے میں وہ کہتا تھا کہ خود مدموازل نے اسے یہ چیزیں تحفتاً دی تھیں۔ لیکن ایک قلم بھی اس کے پاس ہے جو مدام دولان کہتی ہیں کہ مدموازل جولیا روین جاتے ہوئے اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔

اسٹیشن سے کارلو جو گاڑی کے روانہ ہونے سے پہلے لوٹ آیا اس کی وجہ پہلے تو اس نے یہ بتلائی کہ کام تھا۔ جب میں نے پوچھا کہ اسٹیشن سے لوٹ کر کہاں گئے تو جواب دیا کہ پارک میں بیٹھا رہا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ پارک میں بیٹھنا کوئی ایسا اہم کام نہیں جس کے لئے وہ اپنی محبوبہ کے ساتھ گذرنے والی گھڑیوں کو قربان کرے تو کہتا تھا کہ اس نے ژیران اور جولیا کو تنہائی میں گفتگو کرنیکا موقعہ دیا۔ یہ کسی محبت کرنے والے سے ممکن ہی نہیں کہ وہ رقیب کے لئے محبوبہ سے ملنے کے مواقع پیدا کرے دوسری چیز یہ کہ اسکے پاس اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ وہ پارک میں بیٹھا رہا۔"

" تم بڑے اچھے قصہ گو بن سکتے ہو لارل " زارکوف نے سب سن کر آہستہ سے کہا

" میرے لئے واحد صورت یہ ہے کہ ڈاکٹر کارلو کو گرفتار کر لوں ۔ ممکن ہے ڈرانے دھمکانے سے وہ پتہ دیدے ممکن ہے گرفتاری اور رسوائی کا خیال اسے مدموازل کا پتہ بتلانے پر مجبور کردے ۔ ایسے تو وہ نہیں مانتا ...... اس پر میں نے نگرانی مقرر کردی ہے ... فرار تو کسی صورت نہیں ہو سکتا وہ "

" اگر تم ڈاکٹر کارلو کو گرفتار کرنے والے ہو تو بڑی غلطی کر رہے ہو" زارکوف نے کہا " محض شبہ پر تم ایک بڑے آدمی کو ۔ یعنی ایک ڈی ایس سی کو گرفتار نہیں کر سکتے ۔"

" یہ گرفتاری کی دھمکی بڑی کارآمد ہوگی " میں نے جواب دیا " ہم ڈاکٹر کو سمجھائیں گے کہ اگر تم صحیح صحیح پتہ بتلادو تو ممکن ہے کہ تمہیں سزا نہ ہو ۔ ممکن ہے ہم سمجھوتہ کرادیں ۔ ورنہ اغوا، حبس بیجا اور نہ جانے کیا کیا الزام قائم کردئے جائیں ۔"

" کیسی باتیں کرتے ہو لارل ! " زارکوف نے کہا " اتنا سنجیدہ، اتنا پرخلوص اور نیک آدمی کہیں مجرم ہو سکتا ہے "

" تم نہیں جانتے زارکوف " میں نے کہا " کہ لوگ اپنے کتنے چہرے رکھتے ہیں "

" خدا حافظ " زارکوف نے یکایک اٹھتے ہوئے کہا

" کیوں ؟ " میں نے کہا " کارلو کے گھر نہیں چلتے ۔ اسے گرفتار کرنا ہے نا "

میرے سوال کا جواب دئے بغیر وہ چلا گیا

(۸)

پولس کے دو جوانوں کو لیکر میں ڈاکٹر کارلو کے مکان پر پہنچا ۔ ڈاکٹر گھر میں موجود تھا

" میں آپ کو مدموازل جولیا رولان کے اغوا کے الزام میں گرفتار کرنے کیلئے آیا ہوں " میں نے کارلو سے کہا " کارلو کی پریشانی ناقابلِ بیان تھی ۔ تھوڑی دیر تک تو وہ نیچی نظریں کئے کچھ سوچتا رہا ۔ پھر یکایک لپک کر میری کمر سے پستول نکال لیا ۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور میرے ساتھیوں نے پھرتی سے اس کو قابو میں کر لیا ۔

" مجھے چھوڑ دو، مجھے چھوڑ دو" وہ چلا رہا تھا۔
ہم نے اسے ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آرہے تھے اور ہونٹ کانپ رہے تھے"
" مجھے مرنے کا موقعہ بھی نہیں دینا چاہتے" قدرے توقف کے بعد اس نے تھرائی ہوئی آواز میں کہا
میں نے ہر چیز قربان کر دی۔ اب زندگی کی میرے پاس کیا حقیقت ہے ... کیا یہ زندگی موت سے اچھی ہے؟"
اب مجھے معلوم ہوا کہ اس کا ارادہ خودکشی کا تھا۔
" میں ٹیلیفون استعمال کرنا چاہتا ہوں" اس نے کہا۔ ہم اسے ٹیلیفون کے پاس لے گئے
" ہلو" اس نے کہنا شروع کیا" میں کارلو ہوں۔ ۔ ژیران! مجھے پولس گرفتار کر رہی ہے...
..... جولیا کی گمشدگی کے سلسلے میں.... خیر اب ان باتوں کو چھوڑو..... دیکھو۔ جولیا مل جائے
تو اسے اچھی طرح رکھنا۔ جو کچھ میرے پاس ہے وہ بطور تحفہ اپنی شادی میں اسے دینا.....
میری طرف سے ... روکے رکھوں؟ ... کیوں ... کیوں آرہے ہو..... ہلو ... ہلو"
" ڈاکٹر ژیران آرہے ہیں" اس نے فون رکھتے ہوئے کہا" آپ سے ملنے کے لئے"
" ہم انتظار کرتے ہیں" میں نے کہا اور سوچنے لگا کہ کارلو آخر کیا ڈرامہ کرنا چاہتا ہے تھوڑی
دیر بعد ڈاکٹر ژیران شور مچاتا ہوا اندر داخل ہوا۔
" کون بیوقوف ہے وہ" اس نے کہنا شروع کیا" کون کارلو کو گرفتار کرنا چاہتا ہے؟"
" میں گرفتار کرنا چاہتا ہوں" میں نے اپنے آپ کو پوری طرح پولس کا عہدہ دار تصور کرکے کہا
" کیا فرمائیں گے آپ؟"
" کیوں گرفتار کرنا چاہتے ہیں آپ؟"
" مدموازل جولیا کے اغوا کے الزام میں"
" احمق ہو ..... پاگل ہو ....."
" میرے پاس اس کا ثبوت موجود ہے"
" ثبوت تمہارے پاس کیا خاک ہے۔ ثبوت میرے پاس ہے"

"... کس بات کا ثبوت — کیا ثبوت ہے آپ کے پاس"

"مدموازل جولیا باہر میری موٹر میں بیٹھی ہوئی ہیں"

"جولیا !!!" کارلو چلایا اور باہر دوڑا۔ ہم سب کے سب باہر چلے۔ موٹر کے قریب کارلو بیہوش پڑا ہوا تھا اور ایک حسین لڑکی اس کا سر تھامے ہوئے تھی۔ یہی مدموازل جولیا تھیں جن کی تصویریں میں دیکھ چکا تھا۔ ہم سب کارلو کو اٹھا کر اندر لے آئے اور ایک کوچ پر لٹا دیا۔ تھوڑی دیر میں اسے ہوش آ گیا۔

"تم آرام کرو کارلو!" ڈاکٹر زیران نے کہا "ہم پھر آتے ہیں"

ہم لوگ وہاں سے ہٹ گئے۔ صرف کارلو کے ملازم کو وہاں چھوڑ دیا گیا۔ بوکھلاہٹ مجھ پر شدت سے طاری تھی

"آخر معاملہ کیا ہے ڈاکٹر" میں نے ڈاکٹر زیران سے سوال کیا

"میں آپ کو سب سمجھا دوں گا" زیران نے جواب دیا "آپ کی جسارت چونکہ غلط فہمی پر مبنی تھی اس لئے آپ کو درگذر کیا جا سکتا ہے۔ چلئے میرے مکان پر، میرے ساتھ"

ہم چلنے لگے۔ میں نے کارلو سے حسب استطاعتِ ذہنی، معافی چاہی

"کارلو" زیران نے کہا "میرے گھر چلو گے .... ایجاد کا پہلا نتیجہ دیکھنے کے لئے"

"نہیں زیران" اس نے کمزور آواز میں جواب دیا "میں چلنے کے قابل نہیں ہوں نتیجہ اچھا ہی ہوگا" ساتھیوں کو تھانے پر واپس جانے کا حکم دیکر میں ڈاکٹر زیران اور مدموازل جولیا کے ساتھ موٹر میں سوار ہو گیا۔ اور موٹر چل پڑی۔

"ہماری داستان یہ ہے" ڈاکٹر زیران نے کہنا شروع کیا "کہ مدموازل جولیا میری اور کارلو کی ہم جماعت تھیں۔ آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ جولیا کے جمال کا ہم پر کس قدر اثر تھا ہوگا۔ جولیا کے لئے مشکل یہ تھی کہ وہ ہم دونوں سے مساوی محبت رکھتی تھی۔ ہم دونوں شادی کے طلبگار تھے۔ جولیا دفعتہً واحد میں دونوں کی بیوی بننے سے تو رہی اس نے تصفیہ ہم دونوں پر ہی چھوڑ دیا۔ ہم آپس میں کچھ طے

کرہی نہ سکتے تھے۔ قربانی اور خود غرضی ہر دو کے لئے ہم دونوں بیک وقت تیار ہوتے۔ اس سے معاملہ طے نہ ہوتا۔ آخر جولیا نے اس کو ایک شرط کے ذریعہ سے حل کردیا جو ہم دونوں نے منظور کرلی یعنی یہ کہ ہم دونوں سائنس میں کوئی کارنامہ پیش کریں۔ جس کا کام قابل قدر ہوگا جولیا کا وہی مستحق ہوگا اور پھر دوسرے کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ کارلو نے ایک تجربہ شروع کیا تھا مگر۔۔۔ نہیں معلوم اسکا نتیجہ کیا ہوا۔۔۔ میرے دماغ میں ایک نظریہ تھا جس کو میں تجربات سے ثابت کرنا چاہتا تھا مختلف منازل طے کرنیکے بعد میرا تجربہ مکمل ہوگیا لیکن عملی طور پر نتائج حاصل کرنیکے لئے مجھے ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو میرے پاس زیر تجربہ رہے۔ جو کچھ کامیابی کہ مجھے حاصل ہوچکی تھی میرے لئے اتنی کافی تھی کہ میں جولیا کو اپنی تصور کرنے لگا تھا۔ اس لئے کچھ فطری شرارت کے زیر اثر میں نے خود جولیا ہی کو منتخب کیا۔ جولیا کو اپنے تجربہ خانے میں لانے کے لئے بھی مجھے سیدھا سادھا طریقہ پسند نہ آیا اور میں نے جدت یوں دکھائی کہ جب یہ ٹورین جانیکے لئے نکلیں تو میں بھی ٹرین میں سوار ہوگیا اور کلوروفارم سے انہیں بیہوش کرکے اگلے اسٹیشن پر اتار لیا۔ ایک ٹیکسی لی اور انہیں اپنے گھر لے آیا۔ ٹیکسی والے کو خوب انعام دے کر تاکید کردی کہ پتہ کسی کو نہ بتائے۔ اس طرح وہ تجربہ خانہ میں پہنچ گئیں۔

اس اثنا میں ہم ڈاکٹر زیران کے مکان تک پہنچ گئے۔ ڈاکٹر ہمیں سیدھے تجربہ خانہ کی طرف لے چلا "آپ مجرم تو بہرحال ہیں" میں نے ڈاکٹر سے کہا

"ہاں" ڈاکٹر نے جواب دیا "ہاں مجرم ہوں بشرطیکہ جولیا میرے خلاف مقدمہ چلانا چاہے"

"آپ کا کیا خیال ہے مدموازل" میں نے پوچھا

مدموازل جولیا نے جواب دینے کے بدلے کاغذ قلم لیا اور لکھنا شروع کیا

"مجھے ڈاکٹر زیران سے کوئی شکایت نہیں حالانکہ وہ مجھے بلا میری اجازت کے اپنے ہاں لے آئے تھے" نیچے اس نے اپنے دستخط کردئے اور کاغذ میرے ہاتھ میں دیدیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک شوخ مسکراہٹ اس کے لبوں پر کھیل رہی تھی۔ میں نے کاغذ کو تہ کرکے جیب میں رکھ لیا۔ میری بوکھلاہٹ ابھی برقرار تھی۔

" ڈاکٹر " میں نے کہا " کیا آپ کے پاس کوئی عینک ہے "

" ہاں " ڈاکٹر نے جواب دیا " کبھی کبھی میں لگا لیا کرتا ہوں "

" کیسی ہے " میں نے پوچھا

" جیسی آپ نے کارلو کے پاس دیکھی " اس نے جواب دیا " ہم دونوں نے ایک ہی ساتھ خریدی تھی ۔ اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو دکھائے دیتا ہوں "

" نہیں نہیں " میں نے کہا " آپ اپنا تجربہ بیان کیجئے "

" پہلے میرا نظریہ سن لیجئے " ڈاکٹر نے سلسلہ کلام جاری کیا " اس کے بعد آپ کو اس تجربہ سے کچھ دلچسپی پیدا ہو جائیگی ۔ کسی چیز کو آپ دیکھتے ہیں تو اس کا عکس آپ کی آنکھ کے اندرونی پردہ پر پیدا ہوتا ہے ۔ اس پردہ کو شبکیہ کہتے ہیں ۔ اس کے سامنے ایک عدسہ ہوتا ہے اور عدسہ کے مقابل ایک سوراخ دار سیاہ پردہ جس کا سوراخ چھوٹا بڑا ہو سکتا ہے جسے آپ آنکھ کی پتلی کہتے ہیں ۔ آپ کی آنکھ بالکل ایک کیمرہ کی سی ہے جس میں ہر اس چیز کا عکس پیدا ہوتا ہے جو سامنے آتی ہے ۔ اب رہا یہ سوال کہ دیکھنا اگر صرف آنکھ کا فعل ہوتا تو آنکھ ہر چیز سے بے تعلق ہو کر بھی دیکھ سکتی ۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا ۔ آنکھ کا تعلق جونہی دماغ سے منقطع ہوتا ہے وہ دیکھ نہیں سکتی ۔ حالانکہ پردۂ شبکیہ پر برابر عکس پیدا ہوتا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس عکس کا اثر کسی دوسری شکل میں دماغ پر پڑتا ہے جسے دماغ محسوس کرتا ہے ۔ آنکھ کے پیچھے دماغ تک پہنچی ہوئی ایک نس ہوتی ہے ۔ یہ مجموعہ ہے چند رگوں اور شریانوں کا ۔ اس نس کا وہ سرا جو آنکھ سے ملا ہوا ہوتا ہے موٹائی میں اتنا ہوتا ہے جتنا کہ آنکھ کے حساس پردے کا احاطہ کر سکے ۔ جب پردہ پر کوئی عکس پیدا ہوتا ہے تو اس کی وضاحت کی بنیاد دو چیزوں پر ہوتی ہے ۔ نور و تاریکی ، جتنا زیادہ فرق نور و تاریکی کے عکس میں ہوگا اسی قدر پورا عکس واضح ہوگا ۔ یہ نور اور تاریکی کا امتزاج برقی رویں اور پیچ پیدا کرتا ہے ۔ یہ رو جس کی نوعیت عام طور پر استعمال ہونے والی برق سے کسی قدر مختلف ہے ان شریانوں اور رگوں میں چلتی ہے ۔ جو رگیں تاریکی کے عکس کو چھو رہی ہوں وہاں سے کمزور رو پیدا ہوتی ہے اور جہاں نور کی حدت زیادہ ہو وہاں سے

طاقتور رو پیدا ہوتی ہے دماغ، رو کی حدت کی اونچ نیچ کو محسوس کرتا ہے اور آپ کسی چیز کو دیکھتے ہیں اسی طرح مختلف رنگ اپنا اثر مختلف رکھتے ہیں اور ان مختلف اثرات کو دماغ نہایت آسانی کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔

یہاں تک تو کوئی نئی بات نہیں۔ مجھے ان بنیادوں پر ایک نئے نظریہ کو کھڑا کرنا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جب انسان کچھ نہ دیکھتا ہو اور محض یہ تصور کرتا ہو کہ اسے کچھ دکھائی دے رہا ہے تو بھی آنکھ کے پردے پر عکس پیدا ہوتا ہے۔ اس کی معمولی مثال یہ ہے کہ آپ کسی جنگل میں تنہا رات کے وقت کھڑے ہوں اور کسی چیز سے خائف ہوں۔ آپ اس چیز کا خاکہ اپنے دماغ میں جس قسم کا بھی کھینچیں گے بالکل وہی خاکہ آپ کو کسی طرف جدھر کہ آپ کی نظر ہو دکھائی دیگا۔ سب سے اہم مثال جو میرے تجربے کی جان ہے خواب ہے۔ آپ خواب دیکھتے ہیں بالکل ایسے جیسے آپ واقعی کوئی چیز دیکھ رہے ہوں۔ وہی اشکال اتنی واضح نہیں ہوتیں جتنی خواب کی حالت میں دماغ خود سکون میں ہوتا ہے اور وہ بآسانی اپنی قوت احساس کو کسی ایک جانب مرکوز کر سکتا ہے۔

اس صورت میں جبکہ دماغ میں نور و تاریکی کی ترکیب کا احساس پیدا ہو رہا ہو، اس نس میں جو آنکھ کو دماغ سے ملاتی ہے رو پیدا ہوتی رہتی ہے۔ ان برقی رؤں کا مبداء بجائے پردۂ شبکیہ کے دماغ ہوتا ہے۔ اور ان کے اثر سے پردہ پر وہ شکلیں بنتی رہتی ہیں جو دماغ کو دکھائی دے رہی ہیں۔ یعنی یہ عمل انسان کے دیکھنے کے عمل کا الٹا ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے جب انسان خواب دیکھ رہا ہو تو جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے سینما کی طرح پردہ پر بنتا جاتا ہے۔

میں کوشش میں تھا کہ ان تصویروں کو محفوظ کر سکوں۔ میری کامیابی کا ثبوت یہ آلہ اور یہ ریل ہیں۔" اس نے ایک آلہ کی طرف اشارہ کیا جو بالکل کیمرہ کی شکل کا تھا اسمیں فلم لگا ہوا تھا۔ کئی برقی تار اس آلے سے ملے ہوئے تھے۔ اور بہت سے باریک پرزے اس میں لگے ہوئے تھے۔

"یہ آلہ" اس نے پھر سلسلہ کلام جاری کیا "ایک کیمرہ ہے۔ یہ ان تصویروں سے جو آنکھ کے پردے پر پیدا ہوتی ہیں شعاعیں حاصل کرتا ہے۔ یہ شعاعیں ایک شیشہ کی تختی پر جو اس کے اندر لگی ہوئی ہے

جس کے اطراف برقی شراروں کا حلقہ پیدا ہوتا رہتا ہے وہ تصویریں پیدا کرتی ہیں جو آنکھ کے پردے پر بنتی رہتی ہیں۔ ان تصویروں کا عکس فلم پر بہ آسانی اترتا رہتا ہے۔ اس طرح خواب کو فلمایا جاسکتا ہے۔ مشکل یہ پیش آرہی تھی کہ عکس بہت دھندلے اور غیر واضح اُترتے تھے۔ شیشہ کے عدسے میں سے یہ شعاعیں لاشعاعوں کی موجودگی کی وجہ سے پوری طرح منحرف نہ ہوسکتی تھیں برقی قوس کو بطور عدسہ استعمال کیا گیا تو شراروں کی مثبت اور منفی خاصیت کی وجہ سے شعاعوں کا انتشار بہت زیادہ ہونے لگا۔ بالآخر برقی قوس اور عدسوں کے مجموعہ سے وضاحت پیدا کی جاسکی۔ پردے کا آنکھ سے فاصلہ معین کرنے میں بھی کسی قدر مصیبت کا سامنا ہوا لیکن بالآخر اس پر قابو پالیا گیا۔

میں نے مدموازل جولیا کے چند خوابوں کی مسلسل تصویریں تیار کی ہیں آج میں انہیں ادویات میں دھو کر دیکھوں گا کہ یہ واضح ہیں یا نہیں۔ اس سے پیشتر کی تصویریں اتنی غیر واضح تھیں کہ سمجھ میں نہیں آسکتا تھا کہ کیا منظر ہے۔

آپ کی گڑبڑ کی وجہ سے مجھے اس کا اتنی جلد انکشاف کر دینا پڑا ورنہ میرا خیال تھا کہ جب تک پوری طرح تصویریں عوام میں پیش نہ ہوسکیں میں اسے راز ہی میں رکھوں۔ لیکن میرا راز میرے عزیزترین دوست کے لئے وبالِ جان بن رہا تھا۔ اور آپ اپنی پوری نامعقولیت کے ساتھ اس کے سر پر مسلط تھے۔"

ڈاکٹر نے ملازم کو آواز دی اور اسے چائے لانے کو کہا

"اگر آپ کچھ وقت دے سکتے ہیں تو ان فلموں کے صاف ہونے تک ٹھیریئے تاکہ انہیں قندیلِ مناظر Magic Lantern پر چڑھا کر دیکھ لیا جائے۔"

چائے پینے کے بعد ہم لوگ کمرۂ تاریک میں چلے گئے۔ وہاں ڈاکٹر نے فلم کو دوائیوں میں دھونا شروع کیا

"خواب کی تصویریں خود دیکھنے والے کی شکل نظر نہیں آسکتی کیونکہ دماغ دیکھنے والے کی شکل وصورت کا تصور نہیں کرتا۔ اس لحاظ سے ان تصویروں کو یہ فرض کرکے دیکھنا چاہئے کہ یہ سب واقعات جولیا کے ساتھ پیش آرہے ہیں۔"

" یہ دیکھو " ڈاکٹر نے کہا " عکس ابھر رہے ہیں۔"

" وہ مارا " تھوڑے سے وقفہ کے بعد ڈاکٹر چلا اٹھا " بالکل صاف اور واضح تصویریں ہیں بالکل جیسے کیمرے کی "

تھوڑی دیر میں فلم دھل کر تیار ہو چکا تھا۔ خشک کرنے کے لئے اسے ایک برقی آلہ میں رکھدیا گیا اور ہم لوگ وہاں سے ہٹ گئے

مغرب کے قریب فلم کی چھپی ہوئی یعنی مثبت کاپی تیار ہو گئی۔ اشتیاق کے ساتھ ہم لوگ تاریک کمرے میں پہنچے۔ ڈاکٹر نے قندیل مناظر پر فلم چڑھایا۔ سامنے دو گز کے فاصلے پر ایک سفید پردہ جو لکڑی کے چوکھٹے میں تانا ہوا تھا کھڑا کر دیا گیا۔ روشنی گل ہوئی اور فلم شروع ہوا۔ پردہ پر مادام رولان نہایت واضح طور پر حرکتیں کرتی ہوئی نظر آرہی تھیں۔

" یہ جولیا کی والدہ صاحبہ ہیں " ڈاکٹر نے کہا " غالباً خواب میں جولیا انکی گالیاں سن رہی ہے "

مدموازل جولیا نے اس پر ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا

تھوڑی ہی دیر میں مادام رولان غائب ہو گئیں کچھ دیر دھندلے سائے نظر آئے ایک سیاہ نقطہ درمیان میں نمودار ہوا جو بڑھتے بڑھتے ایک چھوٹے بچے کی شکل میں تبدیل ہو گیا۔ یہ بچہ آہستہ آہستہ پورے پردے پر چھا گیا

" یہ کوئی بچہ ہے " ڈاکٹر نے کہا " جسے جولیا اپنی گود میں لئے ہوئے ہے۔ یہ جولیا کی آرزو کا خواب ہے ..... ماں بننے کی آرزو .... ایک عورت کے لئے اس سے بہتر اور کیا آرزو ہو سکتی ہے۔

(۹)

" دعوت نامہ نہیں ملا تمہیں ؟ " زارکوف نے بانداز قدیم کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا

" ملا تو سہی مگر ....

" مگر کیا ؟ " اس نے بات کاٹتے ہوئے کہا " تم نے چلنے کی ابھی تک تیاری نہیں کی "

" مگر زارکوف " میں نے کہنا شروع کیا " یہ معمہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مدموازل جولیا کی شادی

کارلو سے کیسے ہو رہی ہے "
" تمہاری سمجھ میں نہیں آتا تو میری سمجھ میں کب آتا ہے " زارکوف نے کہا
" وہیں چل کر کچھ راز کھلے گا " میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور ہم روانہ ہوئے
شادی پر اہتمام طریقہ پر انجام پا رہی تھی مدموازل جولیا نے جواب مادام کارلو بن چکی تھیں بڑھ کر ہمارا استقبال کیا اور ہم کارلو کو مبارکباد دینے کے بعد بیٹھ گئے
" آپ کی شادی ڈاکٹر کارلو سے کیسے ہو رہی ہے مادام ؟" زارکوف نے سوال کیا
" یہ ایک دلچسپ داستان ہے " مادام نے جواب دیا " بہرصورت یہ میرا اپنا انتخاب تھا "
" لیکن آپ کی شرائط ؟" زارکوف نے پھر پوچھا
" میں نے اپنی شرائط کا پورا خیال رکھا ہے " مادام نے کہا۔
" یہی تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا " میں نے کہا
" یہ پھر کبھی سن لیجئے۔"
" اگر اس محفل کے لائحہ عمل میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا تو ابھی سنا دیجئے " زارکوف نے نہایت عاجزی سے کہا " ہم اس قدر بےچین ہیں کہ اس مسرت کا لطف نہیں اٹھا سکیں گے "
" خیر آپ کا اصرار ہے تو سنائے دیتی ہوں " مادام کارلو نے اٹھتے ہوئے کہا " مگر یہاں نہیں۔ میرے ساتھ آئیے۔ ہم علیحدہ کمرے میں گفتگو کریں گے "
ہم اٹھ کر چلنے لگے تو ڈاکٹر کارلو نے خاص نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا
" اس معاملہ میں یہ کوئی غیر نہیں ہیں کارلو " مادام نے اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر کہا اور ہم لوگ ایک علیحدہ کمرے میں پہنچے۔ تینوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔
" قصہ یہ ہے " مادام نے کہنا شروع کیا " شرط میں ژیران نے کامیابی حاصل کرلی گو اس تجربے کے سلسلے میں میرے ساتھ اس کی خلافِ قانون حرکت مجھے بری معلوم ہوئی تھی لیکن اس کی کامیابی نے مجھے درگذر کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے چند روز بعد ہم نے کارلو کو مطلع کیا کہ دوسرے ہفتہ

ہماری منگنی ہونیوالی ہے ۔ میرے نزدیک کارلو کا دل شکستہ ہونا مسلّم تھا اس لئے مجھے یہ مناسب معلوم ہوا کہ میں خود اس سے مل لوں ۔ اس خیال کے ساتھ ہی میں سیدھے اس کے مکان پہنچی اور حسبِ عادت بغیر اطلاع کروائے ہوئے اندر گھس گئی کارلو کسی بیاض کے مطالعے میں مشغول تھا۔ میری آہٹ پر اس نے نظر اُٹھائی جوں ہی اس نے مجھے دیکھا، کچھ بوکھلا سا گیا ۔ یکایک لپک کر اس نے بیاض آتشدان میں پھینک دی

یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ جو چیز اس سے چھپائی جائے اس کے لئے وہ زیادہ بیچین ہو جاتا ہے یہی حال میرا ہوا ۔ یہ محسوس کر کے کہ کارلو مجھ سے کوئی چیز چھپا رہا ہے بغیر آگ کا خیال کئے ہوئے میں نے پھرتی سے بیاض آتشدان سے باہر نکال لی ۔ جلد کافی دبیز ہونیکی وجہہ سے صفحات کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا ۔ کارلو نے مجھ سے بیاض چھیننے کی کوشش کی لیکن میں اسے لیکر غسل خانے میں بھاگ گئی اور اندر سے دروازہ بند کر لیا

بیاض میں میں نے دیکھا کہ اس تجربے کی پوری تفصیلات تاریخ واری لکھی ہوئی تھیں جسے میری دانست میں ژیران نے انجام دیا تھا ۔ اور پھر بیاض پر کارلو کا نام لکھا ہوا تحریر بھی کارلو ہی کی تھی ۔ تجربہ کی تفصیلات کے آخر میں لکھا ہوا تھا ۔ "ژیران کے حوالے" اس کے ساتھ ہی تاریخ بھی پڑی ہوئی تھی ۔

میں شش و پنج میں مبتلا ہو گئی ۔ سیکڑوں خیالات میرے دماغ میں ایک ساتھ جمع ہوئے اور مجھے لامحالہ خود کارلو سے استفسار کرنا پڑا ۔

" یہ بیاض تمہاری ہے نا کارلو ؟" میں نے پوچھا

" آخر تم نے اسے پڑھ ہی لیا" اس نے کہا

" میں سب کچھ جان چکی ہوں" میں نے جواب دیا "مجھے صاف صاف بتاؤ کہ تم نے اپنے نظریہ کو ژیران کے حوالے کیوں"

" میں نے ژیران کو کیا دیا ؟" اس نے کہا " صرف تھوڑی سی رہنمائی کی ۔ . . . وہ بھی بہت کم"

میری تشویش اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ میں سیدھے ژیران کے پاس پہنچی۔ ادھر ادھر کی باتیں کرکے میں نے اس کے تجربے کا ذکر چھیڑا اس کی ذہانت کی بہت تعریف کی اور باتوں باتوں میں پوچھا

"کارلو سے کچھ مدد نہیں ملی تھیں"

میری امید کے خلاف اس نے صاف انکار کر دیا۔ مجھے دوسری ترکیب سوجھی

"اب تو یہ گھر میرا ہے" میں نے کہا اور ادھر ادھر گھومنا شروع کیا

"بے شک" ژیران نے جواب دیا "تمھارا تھا، تمھارا ہے اور تمھارا رہے گا"

چپکے سے میں اس کے تجربہ خانے میں پہنچ گئی اور ایک ایک چیز کا بغور معائنہ شروع کیا۔ عکسالہ جس سے ژیران نے میرے خوابوں کی تصویریں تیار کی تھیں ایک طرف رکھا ہوا تھا۔ اس کے پچھلے حصے پر مجھے کارلو کی دستخط نظر آئی۔ یہ کارلو کی عادت ہے کہ جب وہ اپنے اور صرف اپنے لئے بازار سے کوئی چیز خریدتا ہے تو نکٹائی کی پن سے اس پر دستخط کر دیتا ہے۔ عکسالہ پر کارلو کی دستخط اس بات کا بین ثبوت تھا کہ وہ کارلو ہی کا بنایا ہوا ہے۔

میں نے ژیران سے کچھ نہیں کہا اور پھر کارلو کے پاس پہنچی

"ژیران نے مجھ سے سب کچھ کہہ دیا" میں نے کارلو سے کہا "اب تم سچ سچ بتلادو کہ تم نے یہ حرکت کیوں کی؟"

کارلو تھوڑی دیر تک میرا منہ تکتا رہا بالآخر اس نے کہا

"ژیران نے کہدیا؟"

"ہاں" میں نے کہا "میں تم سے صرف اس کی وجوہات سننا چاہتی ہوں"

"شرط میں ژیران کو شکست ہو رہی تھی" قدرے توقف کے بعد کارلو نے کہنا شروع کیا "ژیران نے مجھے یقین دلایا اور میں نے خود بھی محسوس کیا کہ تم اس کی طرف زیادہ مائل ہو۔ اگر شرط میں جیت جاتا تو شاید تم خوش نہ ہوتیں۔ اس لئے میں نے ژیران کو سب کچھ دیدیا"

"کارلو" میں نے کہا "اتنے دنوں میرے ساتھ رہنے کے باوجود تم نے مجھے سمجھنے میں

غلطی کی ۔ میں بس اس سے ناخوش ہوں" اس خاموش دیوتا کے ساتھ میری شادی کی بس یہی وجہ ہے"

"ژیران کہاں ہے" میں نے پوچھا

"سوئٹزرلینڈ میں" مادام نے جواب دیا "وہ اس آلہ میں خوش ہے"

"بڑی مسرت ہوئی مادام" زارکوف نے کہا "اب اجازت دیجئے ۔ ہم چلتے ہیں"

"واہ" مادام نے کہا "شب کا کھانا تو کھاتے جائیے"

ظہیر الدین رونق (عثمانیہ)

موھنجدارو

(وادئ سندھ کا تمدن)

تمہید | موھنجدارو کے انکشاف نے دنیائے تاریخ اور تمدن میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اب تک تاریخ ہند سے متعلق جو نظریے اور قیاسات تھے وہ بالکل بے بنیاد و غلط ثابت ہو گئے۔ ہندوستان کی تاریخ کے متعلق یہ قیاس اور نظریہ تھا کہ ہندوستان کی تاریخ بنانے والے اور یہاں تہذیب و تمدن پھیلانے والے آریا ہیں جو یہاں سنہ عیسوی سے ایک ہزار سال قبل آ کر آباد ہوئے یہ لوگ ہندوستان میں درۂ خیبر اور بولان کے راستہ سے وسط ایشیا سے آئے اور بعد میں رفتہ رفتہ فتوحات اور کامیابی کے ساتھ پھیلنے اور آباد ہونے لگے۔ یہی ایک بہت مہذب اور متمدن قوم تھی ورنہ ان سے قبل ہندوستان میں جاہل اور وحشی اقوام آباد تھیں۔ جو برہنہ یا نیم برہنہ حالت میں جنگلوں میں رہتے اور پھل پھول شہد اور گوشت پر گزارا کرتے تھے۔ ان کی اگر آبادیاں تھیں تو بھی بہت ہی پست اور غیر مہذب قسم کی ان ہی کو آریاؤں نے اپنے مذہبی کتب وید وغیرہ میں داس کے نام سے موسوم کیا اور آریاؤں کے ہی اثرات سے ان غیر متمدن وحشی لوگوں میں تہذیب کی لہر دوڑ گئی۔ نہ ان میں رسم تھا نہ رواج اور نہ ہی کوئی مذہب اور حکومت۔ مگر موھنجدارو کے انکشاف سے یہ تمام قیاس اور خیال آرائیاں باطل ہو گئیں۔ کیونکہ علمائے ارضیات و آثارِ قدیمہ کے رائے میں ان کھنڈروں کا بہت پرانا ہونا ثابت ہو چکا ہے۔ اب بھی ٹھیک طور پہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ یہ مکانات و کھنڈر اور دیگر اشیا جو وہاں دستیاب ہوئیں کتنی پرانی ہیں ماہرین میں بھی اختلاف رائے ہے۔ ان کی رائے میں یہ کھنڈر تین ہزار سے

لیکر چھ ہزار قبل از مسیح تک کے ہوسکتے ہیں۔ چند ماہرین نے اس سے بھی زیادہ قدیم ثابت کرنے کی کوشش کی مگر غالب قیاس اول الذکر کی تائید میں ہے۔ اس شہر کی حالت جس کو موھنجدارو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے بہت ہی بہتر اور مہذب و متمدن معلوم ہوتی ہے۔ وہاں اچھے خاصے دو منزلہ اور سہ منزلہ مکانات موجود تھے تعمیر کا خاص فن تھا۔ حمام کو خاصی اہمیت تھی۔ اور عوام کے لئے بڑے بڑے حمام موجود تھے زمین دوز پختہ زینوں کی نالیاں ایسی مضبوط اور اصولی طور پر تیار ہوتی تھیں کہ اب تک ان کی مضبوطی میں فرق نہیں آیا تعمیر مکان میں روشندان در و دریچہ کا خاص اہتمام تھا۔ کپڑے اور اون کی صنعت اور ملبوس تیار کرانے اور استعمال کرنے کا رواج تھا غلہ میں گیہوں اور جو کی کاشت کے نشانات ثابت ہوچکے ہیں۔ فنون لطیفہ میں ان لوگوں کو نہ صرف کافی دخل بلکہ اچھی مہارت تھی۔ صنعت قلب معادن پائی جاتی تھی سنگتراشی اور آرٹ بھی موجود تھا۔ زیورات چاندی اور سونے کے پائے گئے ہیں۔ قیمتی کنکر بھی ملے ہیں۔ بہت سی مہریں دستیاب ہوئی ہیں۔ ان تمام اشیاء کے ملنے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچتی ہے کہ ہندوستان میں اور خصوصاً وادیٔ سندھ میں آج سے پانچ ہزار سال قبل ایک متمدن اور مہذب قوم بستی تھی جس کی تہذیب و تمدن بلند اور ایک اونچے معیار کی تھی۔ اچھے آرام دہ مکانات میں ان کا قیام تھا مذہب کا احساس اور شیو اور مہا مائی کی پرستش رائج تھی۔ ضرور ان لوگوں میں منظم اور طاقتور حکومت بھی ہوگی اور ان کا تہذیب و تمدن گو آج کل کے میکانی ترقیات کے مماثل نہ ہوگا مگر دیگر شعبہ زندگی اور قطع نظر میکانی ترقی کے کسی حالت میں موجودہ حالت سے کم بھی نہ ہوگا۔ اور اس سے سابقہ نظریہ کہ ہندوستان کے قدیم باشندے آریاؤں کے آمد سے قبل جاہل اور وحشی تھے بالکل بے بنیاد ہوگیا۔ اور یہ قیاس غالب ہوتا ہے کہ گلہ بانی کرنے والی قوم اس قدر مہذب اور شائستہ قوم کو کس طرح تمدنی سبق دے سکی بلکہ بہت ممکن ہے کہ آریاؤں نے ہی ان لوگوں سے تہذیب سیکھی ہو

آریا آریاؤں کے ہندوستان میں آنے کے متعلق بھی مختلف نظریے ہیں۔ ایک دبستان کا کہنا ہے کہ آریا قطب شمالی سے وسط ایشیا اور وہاں سے درہ خیبر اور بولان کے راہ ہندوستان میں داخل ہوئے اور پھیلتے گئے۔ ان کا ایک حصہ ہندوستان میں داخلہ سے قبل ہی ان سے علحدہ ہوکر ایران میں آباد ہوا اور وہاں سے مغرب کی جانب پھیلتے ہوئے ہنگری اسٹریا اور پرشیا (جرمنی) تک آباد ہوگئے۔ دوسرا دبستان

یہ کہتا ہے کہ آریاؤں کا اصلی وطن قطب شمالی نہیں بلکہ اسٹریا اور ہنگری ہے۔ یہ لوگ وہاں سے مشرق کی طرف پھیلے اور ہندوستان تک آباد ہو گئے۔ تیسرا اسکول کہتا ہے کہ آریا ہندوستان کے ہی باشندے ہیں قدامت سے یہیں ہیں۔ نہ کہیں سے آئے اور نہ گئے۔ موھنجدارو کے انکشاف تک پہلے دبستان کی رائے مستند سمجھی جاتی تھی۔ مگر موھنجدارو اور ہڑپا وغیرہ کے انکشاف کے بعد تیسرے دبستان کی رائے بہت قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ آریاؤں کا ہی تہذیب و تمدن ہندوستان میں قدامت اور تاریخی دور سے پہلے کا ہے اور سمیرین۔ مصری اور عراق کا تمدن بعد کا ہے جو کہ ہندوستان سے ماخوذ ہے۔ انگریز ماہرین تاریخ و آثار قدیمہ بلا اختلاف اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں کہ سب سے قدیم تہذیب و تمدن وادی سندھ، موھنجدارو اور ہڑپا کا ہے اور دیگر مراکز تمدن مثلاً سمیرین۔ مصری وغیرہ یہاں کے تجلی ہی سے منور ہوئے ہیں۔ اکثر علمار تاریخ کا یہ کہنا ہے کہ زمانہ قدیم میں صرف ہندوستان کی آریا قوم ہی مہذب اور متمدن تھی۔ اور دیگر مقامات پر یہاں سے یہ قوم جاکر آباد ہو کر تہذیب و تمدن پھیلایا ہے اور اس طرح سمیرین۔ مصری اور عراق کا تمدن بھی آریائی تمدن ہے۔ اور مشہور رومن شہنشاہت بھی آریاؤں ہی کی قائم کردہ تھی۔ یہ قوم یورپ تک پھیل گئی تھی۔ اور اسی بنا پر جرمن اقوام بھی اپنے آپ کو آریا Aryans کہتے ہیں۔ تیسرے دبستان کے علما کا بھی یہ خیال ہے کہ ایک قوم ایک زبان ہی رائج تھی جو کہ زمانی اور مکانی قیود کے تحت علیحدہ علیحدہ رسم الخط بھی لکھی جانے لگی ورنہ اس زبان کے حصص میں اب بھی تلفظ اور معنی کے لحاظ سے اکثر الفاظ ملتے جلتے ہیں۔ اور یہی زبان کہیں لاطینی کہیں عربی اور کہیں سنسکرت کے نام سے موسوم ہوئی۔ دوسرے دبستان کے حامی بہت کم ہیں کہ آریاؤں کا وطن آسٹریا ہنگری تھا اور وہاں سے ہندوستان تک پھیلے۔ اس نظریہ میں اصلیت نہیں پائی جاتی۔ خصوصاً جب سے موہنجدارو کے انکشافات ہوئے۔ اس اسکول والوں کے اہم دلائل یہ ہیں کہ ویدمیں جو نام جانوروں وغیرہ کے پائے جاتے ہیں وہ آسٹریا ہنگری کے زبان میں اب بھی رائج ہیں اس لئے وید آریاؤں کی قدیم تاریخ ہے جس کو آسٹریا ہنگری سے ساتھ لائے۔ مگر یہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ آریاؤں کا جو حصہ کشورکشائی یا آبادکاری کے لئے مغرب گیا ہوگا یہاں سے وید اپنے ساتھ لیتا گیا ہوگا اور اب تک وہ نام

وہاں مروج ہیں۔

موہنجدارو کا محل وقوع اور انکشاف موہنجدارو کے لفظی معنی Mowd of dead کے ہیں یہ مقام ہڑپا جو کہ پنجاب میں واقع ہے بعد معلوم ہوا ہے۔ اس کا محل وقوع شہر لرکھنا (سندھ) سے ۲۵ میل اور نارتھ ویسٹرن ریلوے کے اسٹیشن ڈوکری سے ۷ میل پر ہے۔ جغرافی نقطۂ نظر سے عرض البلد طول البلد معلوم کیا جائے تو ۱۰ ر ۲۷ شمال اور ۸ ر ۶۸ جنوب ہوگا۔ یہ مقام ۱۹۲۱ء کے قبل تک ناہموار اونچے نیچے ٹیلوں کی شکل میں تھا اور اکثر لوگوں کا یہ خیال تھا کہ ان ٹیلوں کے کھودنے پر شاید کوئی ذخیرہ آثار قدیمہ کا برآمد ہو۔ اس کے انکشاف کا سہرا مسٹر آر۔ ڈی بنرجی ایک بنگالی افسر آثار قدیمہ کے سر ہے جنھوں نے اس خوشگوار خواب کو شرمندۂ تعبیر کردیا۔ مگر ان کو خود اس بات کا گمان تک نہ تھا کہ ان ٹیلوں کے نیچے ایک بہت قدیم اور ہزارہا سال قبل کا شہر برآمد ہوگا جس سے کہ دنیا تاریخ میں انقلاب ہو جائے گا۔ بنرجی کا خیال تھا کہ ان ٹیلوں کے نیچے اگر کوئی آثار قدیمہ برآمد ہونگے تو وہ ایک یا دو صدی قبل از مسیح تک کے ہو سکتے ہیں یعنی بدھ دور کے آثار قدیمہ ہونگے اور اسی خیال کے تحت انھوں نے کھدوائی شروع کروائی مگر جب ان کو چند مہریں کھدوائی میں برآمد ہوئیں تو اپنے کام کی اہمیت کا اندازہ ہوگیا کیونکہ اس کے قبل ہڑپا کا انکشاف ہو چکا تھا۔ اور یہ مہریں بالکل اسی قسم کی تھیں جیسی کہ ہڑپا میں ملی تھیں۔ اس کے بعد مسٹر بنرجی نے حکومت کی توجہ اس طرف مبذول کروائی اور استدعا کی کہ خاص رقم عطا فرما کر کھدوائی جاری رکھوائی جائے۔ اس پر وہاں اور ایک افسر آثار قدیمہ مسٹر کے ابن وکشت روانہ کئے گئے اور دو سال تک ان دونوں ماہرین کی ان تھک محنت اور جانفشانی سے بہت سے مقامات صاف کئے گئے جس سے اس کام کی اہمیت اور بڑھ گئی اس کے بعد سر جان مارشل ڈائرکٹر جنرل آثار قدیمہ نے معائنہ فرما کر رائے دی کہ ایک ایک ٹیلہ کھودنا یا وہ مفید نہیں ہے۔ کیونکہ اب تک کی کھدائی سے صاف ظاہر ہو چکا تھا کہ یہ آثار ایک پورے شہر کے ہیں سر جان مارشل نے دو لانبی خندقیں طولاً و عرضاً کھدوائیں تاکہ اس سے شہر کی وسعت کا اندازہ ہو سکے۔ اس کے بعد ایک سال تک مسٹر ایم ایس وائس کے زیر نگرانی کام جاری رہا۔ آخر میں ۱۹۲۵ء میں حکومت ہند نے ایک گرانقدر رقم اس انکشاف کے لئے منظور فرمائی اور سر جان مارشل نے خود بہت اعلیٰ افسران

آثارِ قدیمہ اور ماہرین کے ساتھ کھدوائی شروع کر دی۔ ان ماہرین میں مسٹر ای میکے۔ مسٹر ثنا اللہ اور رائے بہادر دیارام سہانی بہت مشہور ہیں۔ ان تمام ماہرین اور سابقہ افسران اور ماہرین کی مدد سے سرجان مارشل نے رقبہ کو چار حصوں میں تقسیم کر کے دو سال میں بہت بڑے حصہ کا انکشاف کیا۔ اور اب بھی وہاں معمولی طور پر کام جاری ہے۔ سرجان مارشل کا خیال ہے کہ ابھی انکشاف اور تحقیق کا وسیع میدان باقی ہے۔ اب تک جو جو چیزیں حاصل ہوئیں اس سے ان لوگوں کے تمدنی اور عمرانی پہلو پر روشنی پڑتی ہے اس کا ذکر ذیل میں ہوگا۔

موہنجداڑو کی جغرافی حالت ان تمام انکشافات کے بعد ماہرین کی رائے ہے کہ سندھ کی جغرافی حالت میں اس وقت کوئی خاص فرق یا تبدیلی کا ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جہاں پر کہ آجکل موہنجداڑو پایا جاتا ہے۔ وہاں کی آب وہوا سخت اور بارش بہت کم ہوتی ہے۔ اچھے موسم میں یہاں بارش کا سالانہ اوسط زائد از زائد ۵ انچ ہے۔ موسم سرما میں بارہ نقطۂ انجماد سے نیچے اور گرما میں انتہائی حرارت ۱۲۰ درجہ ہو جاتی ہے علاوہ اس کے ریتیلے طوفان کی وجہ سے یہاں کا موسم نا خوشگوار ہی نہیں بلکہ انتہائی تکلیف دہ ہے۔ تو ایسے تکلیف دہ اور سخت آب وہوا میں اتنا اچھا اور خوشگوار تمدن فروغ پانا قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ ماہرین ارضیات کی رائے ہے کہ اس گذرے ہوئے تمدنی عہد میں یہاں کے موسم کا نہایت خوشگوار ہونا اور ملک کا زرخیز اور دریاؤں سے سرسبز و شاداب ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے جب ان کھنڈروں کی قدامت کا اندازہ پانچ ہزار سال سے زیادہ لگایا جاتا ہے تو اس تمدنی معیار کی داغ بیل کم از کم تین چار ہزار سال اس سے بھی قبل ڈالی گئی ہوگی اور اس وقت کے جغرافی حالت میں اور اس کے جغرافی حالت میں فرق ہونا قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ سر آورریل اسٹین جنھوں نے سندھ اور بلوچستان کے مختلف جغرافی اشیاء اور پتھروں وغیرہ کو دیکھ کر یہ قیاس قائم کیا ہے۔ کہ زمانہ قدیم میں اس حصہ میں بہت کافی بارش ہونے کے آثار پائے جاتے ہیں سرجان مارشل بھی خود کے پیش کردہ دلائل یعنے موہنجداڑو میں بندھ وغیرہ کے نشانات اور مکانات کی تعمیر میں پختہ اینٹوں وغیرہ کے استعمال پر بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس وقت سندھ میں بارش کا اوسط ۲۰ انچ تک پایا جاتا ہے اس کے علاوہ وہاں جو مہریں پائی گئی ہیں ان پر تمام ان جانوروں کی تصویریں

نقش ہیں جو صرف مرغزار اور جنگلوں میں پائے جاتے ہیں مثلاً۔ شیر۔ بیل۔ گینڈا وغیرہ سمیرین مہر اور دیگر مہروں کے مانند یہاں شیر ببر اور بارہ سنگا کی تصویریں نہیں پائی جاتیں جو کہ ریتیلے پہاڑیوں کے جانور ہیں۔ غرض ان تمام واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں کا اوسط بارش بہت کافی تھا۔

میجر ریورٹی نے (Raverty) جغرافی نقطۂ نظر سے غور کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ سندھ میں دریائے سندھ کے علاوہ ایک اور دریا کے بہنے کے آثار پائے جاتے ہیں۔ چودھویں صدی عیسوی تک بھی سندھ دریا کا دو حصوں میں بہنا ثابت ہوتا ہے۔ اس رائے کی سرجان مارشل نے بہت سے دلائل کی بنا پر تائید کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ زمانۂ قدیم میں اور ایک دریا رواں تھا جس کا نام مہران تھا۔ دریا سندھ اور دریائے مہران دونوں موہنجدارو کے قطعہ کو سیراب کرتے تھے۔ اور اس کی وجہ سے یہ خطہ بہت زرخیز ہوگیا تھا۔ ان دریاؤں میں اکثر طوفان وطغیانی آیا کرتے تھے جس کے اثرات موہنجدارو کے قدیم آثار سے ثابت ہوتے ہیں کافی بارش کی وجہ سے اور ان دریاؤں کے سیراب کرنے کی وجہ سے یہ خطہ سرسبز وشاداب تھا اور خوشحالی کے باعث ہی یہاں کے مختلف عمرانی پہلو ترقی کرسکے اور تمدن پھل پھول سکا۔ ورنہ خشک اور سخت موسم میں تمدن کی بیل پروان چڑھنا ناممکن ہی نہیں بلکہ محال ہے۔

رقبہ سرجان مارشل کی رائے میں موہنجدارو کا رقبہ انکشاف شدہ رقبہ سے کہیں زیادہ وسیع ہوگا۔ کیونکہ بہت سے آثار کو انقلاب زمانہ، باد و باراں اور سندھ کی نمک ملی ہوئی مٹی نے تباہ و تاراج کردیا۔ اور ان تباہی و بربادی کے باوجود جو باقی رہے وہ آجکل پیش نظر ہیں۔ شہر کے عمارات کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد نصف میل کے فاصلہ پر بجانب مشرق اور شمال پھر کھنڈروں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ اس سے یقینی طور پر رائے قایم نہیں کی جاسکتی کہ درمیان میں میدان وغیرہ کسی خاص اغراض کے لئے چھوڑکر سلسلۂ تعمیر جاری رکھا گیا ہے۔ یا شہر کی حد ختم ہونے کے بعد مضافاتی آبادی کے اثرات ہیں کیونکہ اب تک کل ۲۴ ایکر رقبہ کا انکشاف ہوا ہے جس سے وہاں عمارات کی بلندی اوسطاً ۲۰، ۳۰ فٹ اور کہیں کہیں ۷۰ فٹ پائی گئی ہے۔ شہر کا نقشہ بہت ہی دلفریب اور بالکل حالیہ قسم کا معلوم ہوتا ہے

شہر کے نقشہ پر طائرانہ نظر ڈالنے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ شہر خاص طریقے اور قرینے سے بسایا گیا ہے خود بخود بے ڈھنگے طور پر آباد نہیں ہوا بلکہ خاص قسم کی Town planing پائی جاتی ہے۔ یہاں کی آبادی گنجان ہو گی۔ سڑکیں بالکل سیدھی اور شہر کے اس سرے سے اُس سرے تک چلی گئی ہیں البتہ سڑکوں میں کشادگی کم ہے جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت بھاری قسم کی سواریوں کا عام رواج نہ تھا۔ Drains (زمین دوز نالیاں) کا انتظام بہت باقاعدہ ہے جو سڑکوں کی نیچے سے بند طور پر گذاری گئی ہیں۔ شہر کے اطراف آیا کوئی فصیل تھی یا نہیں۔ جیسا کہ اکثر قدیم شہروں میں پائی گئی ہے اس کے متعلق مسٹر میکے کی رائے ہے موہنجدارو میں کوئی فصیل نہ تھی مگر سرجان مارشل اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے زمانہ قدیم کی تاریخ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ثابت کرتے ہیں کہ فصیل تو ضرور تھی مگر ضرورتاً آبادی بڑھنے پر شہر کو وسعت دینے کی خاطر توڑ دی گئی ہے۔ ثبوت میں نشیب زمین کے مکانات پیش کرتے ہیں جو کہ شہر کی سطح زمین سے تقریباً ۳۰ فٹ نشیبی حصہ پر بعد میں تعمیر کئے گئے۔

سطح موہنجدارو میں تغیرات۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ موہنجدارو کی سطح اور زیرین سطح اور سطح آب میں تغیر واقع ہوا ہے عمارات کی بلندی اوسطاً ۲۰ فٹ سے ۳۰ تک پائی جاتی ہے اور کہیں کہیں ۷۰ فٹ اونچے مکان بھی اس زمانے میں تعمیر ہوئے تھے۔ اوپر کی سطح عرض میں تو کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوا۔ البتہ زیرین سطح Subsoil اور سطح آب Water level میں کافی فرق رونما ہوا ہے کیونکہ سرجان مارشل کو اکثر مقامات میں ۱۵/ ۲۰ فٹ پر زمین سے پانی نکلتا ہوا ملا ہے جس سے مزید کھدوائی اس مقام پر ناممکن ہو گئی۔ ان کی رائے میں زیرین سطح Subsoil اس وقت سے تقریباً ۱۵/ ۲۰ فٹ بلند ہو گئی ہے۔ حالانکہ اوپری سطح میں کوئی خاص فرق نہیں پایا جاتا۔

فن تعمیر موہنجدارو کے کھنڈروں میں جب اس کی کشادہ سڑکوں پر گذرتے ہیں تو مارشل صاحب کو ایسا معلوم ہوتا کہ حالیہ لنکاشائر جیسے گنجان شہر کے کھنڈر ہیں یعنی وہاں کی فن تعمیر اس قدر پختہ اور بلند معیار کی ہے کہ حالیہ شہر کا مغالطہ ہوتا ہے۔ مکانات نہایت پختہ اور کشادہ ہوا دار ہیں۔ ان میں نمود و نمائش نہیں بلکہ پختہ اینٹوں کو گھس کر صاف کر کے خوشنمائی پیدا کر دی گئی ہے اور کہیں کہیں ان پر استرکاری

کے نشانات پائے جاتے ہیں ۔ الغرض ضرورتاً جتنا کہ کیا جانا لازمی تھا اتنا ہی کیا جاتا اور بے جا نمائش و آرائش وزیبائش کا وہاں کہیں نشان نہیں ملتا ۔ مکان کی تعمیر میں لکڑی بھی بکثرت استعمال کی جاتی تھی ۔ مگر وہ بہت کم اچھی حالت میں ملی ہے ۔ لکڑی پر البتہ نقش و نگار کے نشانات پائے جاتے ہیں ۔ مکانات کی تعمیر میں اینٹیں بکثرت ہی نہیں بلکہ کلیتہً استعمال کی جاتی تھیں ۔ موہنجدارو کے معمار کچی اینٹوں کے استعمال سے واقف تھے مگر صرف بنیاد اور درز بندی کے سوا اور کہیں یہ اینٹ استعمال نہیں کی جاتی تھی جیسا کہ عراق اور مصر میں خام خشت تعمیر امکنہ میں استعمال ہوتی تھی ۔ موہنجدارو میں تعمیر مکان جملہ پختہ اور مضبوط اینٹ سے ہوتی تھی اینٹوں ۔ کے درمیان مٹی اور کھریا ملا کر دیا جاتا تھا ۔ اہم پانی کے مقامات میں اور پانی کی نالیوں و نہروں میں چونا اور کھریا بھی استعمال کیا جاتا تھا ۔ مگر چونے کا استعمال بہت کم تھا ۔

دیواریں عموماً سیدھی اور عموداً تیار کی جاتیں مگر اونچی اور ان دیواروں پر جن کو کہ کافی وزن پڑنے والا تھا اونچائی اور روزن کے تناسب سے ضخیم ہونے کے علاوہ پشتی دار ہوتی تھی تاکہ سیلاب وغیرہ سے بھی محفوظ رہ سکیں ۔ دیواروں کی بنیادیں بھی اسی تناسب سے گہری ہوتی تھی ۔ بنیادوں میں کہیں کہیں چونے کے کنکر اور کہیں پتھر کے ٹکڑے بھی پائے گئے ہیں ۔ فرش زیادہ تر صاف اینٹوں اور ٹائیلس کا ہوا کرتا تھا حمام وغیرہ کے فرش میں زیادہ اہتمام برتا جاتا تھا ۔ مکانات کے دروازوں اور دریچوں میں لکڑی کا کام ہوتا تھا ۔ مکان میں اکثر موقع بہ موقع کمانیں بھی پائی جاتی ہیں ۔ کمان فن تعمیر کا ارتقائی عمل ہے ۔ موہنجدارو میں کمانیں نہ صرف مکانات میں بلکہ ڈرینیں میں بھی پائی گئی ہیں ۔ جن سے ان کی بلندی معیار فن تعمیر کا اندازہ ہوتا ہے ۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان لوگوں کے مکانات عام طور پر دو منزلہ اور اکثر سہ منزلہ بھی ہوا کرتے تھے ۔ اوپر چڑھنے کے لئے مکان میں دو تین جگہ سے زینہ اور سیڑھیاں بھی موجود تھیں جو کہ بالکل حالیہ سیڑھیوں کی طرح پائی جاتی ہیں ۔ اکثر بڑے مکانوں میں باؤلیاں موجود ہیں جو کہ گول یا بیضوی شکل کی بنی ہوئی ہیں ۔ باؤلیاں پختہ اینٹوں سے تعمیر کی جاتی تھیں ۔ چند مکانات کے باؤلیوں کے کمروں میں سڑک کی طرف بھی دروازے موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مالک مکان نے ان باؤلیوں سے عوام کو بھی مستفید ہونے کی اجازت دے رکھی تھی ۔

تین آتشکدے بھی موہنجدارو میں پائے گئے ہیں مگر سر جان مارشل کو ان کے آتشکدے ہونے کا ہنوز یقین کامل نہیں۔

موہنجدارو کے مکانات میں حمام کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ ہر مکان میں حمام حسب ضرورت تعداد میں ملتے ہیں اور ان سے نالیاں راست سڑک اور Lane (گلی) کی ڈرینیں میں ملادی گئی ہیں۔ حمام مکان کے ہر منزل پر پائے جاتے تھے۔ بیت الخلار بھی مکان میں لازمی طور پر ہوا کرتے تھے اور ان کا بھی مکان کے ہر منزل پر پایا جانا ضروری تھا۔ ان حمام اور بیت الخلار کا پانی و غلاظت مٹی کے نلوں کے ذریعہ سڑک کے ڈرینیں میں ملادیا جاتا تھا۔ یعنی بالکل آجکل فلش کے بیت الخلا اور موجودہ بین وحمام کی طرح اس وقت بھی انتظام تھا۔ مکانات کی چھت اکثر چوبی ہوا کرتی تھی جس پر کہ اینٹ یا مٹی کی تہ دی جاتی تھی۔ سر جان مارشل کا قیاس ہے کہ اس زمانہ میں ٹایل (Tyle) سلیٹ تانبے اور پتیل کا رواج چھتوں میں تھا۔ بعد میں صرف اینٹوں کو ہی چونے کے ساتھ چھتوں میں استعمال کرنا شروع کیا گیا جس کو سکھار اکہا جاتا۔ اس سکھار اکو فن تعمیر کے نقطہ نظر سے بہت اہمیت ہے۔

موہنجدارو کے عمارات کو عام طور پر ان کی نوعیت کے لحاظ سے تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(۱) رہائشی مکانات۔ (۲) ایسی عمارات جس کا مقصد ہنوز واضح نہیں ہوسکا (۳) حمام بغرض رفاہ عام جن کو کہ مذہبی یا عمرانی اہمیت حاصل تھی۔

رہائشی مکانات موہنجدارو میں عام مکانات اور مکانات برائے ملازمین وعملہ میں بہت تھوڑا فرق کیا جاسکتا ہے وہ فرق صرف وسعت کا ہے۔ مکان کی تعمیری نقطہ نظر سے آرائش وزیبایش کے معیار سے کوئی فرق نہیں برخلاف اس کے دیگر ممالک میں جو مکانات برآمد ہوئے ہیں۔ ان کے وضع وقطع سے بآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عام رعایا کے مکانات کونسے ہیں۔ مذہبی عمارات کونسی ہیں اور شاہی محلات کونسے ہیں۔ مگر موہنجدارو میں عام مکانات اور شاہی محلات میں امتیاز کرنا نہ صرف دشوار بلکہ ناممکن ومحال ہے۔ سر جان مارشل کا خیال ہے کہ موہنجدارو میں راعی ورعایا کے مکانات میں کوئی خاص فرق نہ ہوتا تھا۔ اگر تھا تو صرف وسعت وکشادگی کا۔ کیونکہ مکانات میں کوئی خاص خصوصیت نہیں ہے۔ سر جان کہتے ہیں کہ اگر شاہی

محلات تھے تو یہ ماں لینا پڑیگا کہ ان کا ہنوز انکشاف ہی نہیں ہوا ۔ یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ ہر مکان کی خصوصیت پر بحث کی جائے مگر عام طور پر مکانات کا نقشہ اور ان کی مجوزہ ارضی و عمودی تراش دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مکان کی تعمیر میں ہمہ قسم کی ضرورت کا لحاظ رکھا جاتا تھا متوسط قسم کے مکان مثلاً (مکان نمبر ۸) میں دو زینے صحن ۔ دو زینے ایک باؤلی ۔ تین چار حمام اور بیت الخلاء ۔ ایک کمرہ برائے مہمان ۔ ملازمین کے کمرے اور اراکین کے ضروریات کے لئے پہلی منزل پر دس اور دوسرے و تیسرے منزل پر حسب ضرورت کمرے ہوا کرتے تھے باورچی خانہ بھی ہوتا تھا ۔ اور زمین کی سطح کو کافی بلند کر کے ایک دو کمرے دوسرے یا تیسرے منزلہ پر تیار کئے جاتے تا کہ سیلاب و طغیانی کے وقت محفوظ مقام ثابت ہو سکیں ۔ اوسط درجہ کے مکان کو دو یا تین دروازے راستے پر ہوتے تھے ۔ مکان میں بالائی منزلہ سے زیرین منزل پر بیت الخلاء اور حمام کا پانی نلوں کے ذریعہ نیچے سڑک کی ڈرینیں میں ملا دیا جاتا ۔ اعلیٰ قسم کے مکانوں میں (مثلاً مکان نمبر ۱۳) پندرہ سولہ کمرے زیرین منزل میں اور اتنے ہی دوسرے اور تیسرے منزل میں ہوا کرتے تھے ۔ اس میں تین زینہ اور تین دروازے پائے جاتے ہیں ۔ اعلیٰ قسم کا مکان صرف وسعت کے لحاظ سے بڑا ہے نہ کہ آرائش کے لحاظ سے ۔ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ اس میں بڑے خاندان یا کئی مشترکہ خاندان سکونت پذیر ہوتے ہوں گے ۔ اس میں چار صحن اور کئی حمام وغیرہ ہیں ۔ مکان کا نقشہ اور ارضی تراش دیکھ کر یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک بہت بڑا چار حصوں والا مکان ہے ۔ ہر حصہ میں تمام ضرورتیں مہیا کی گئی ہیں ۔ اگر درمیان سے ان حصوں کو الگ کر دیا جائے اور شمال کی طرف ایک اور راستہ نکال دیا جائے تو بہت آسانی سے چار مکان بن سکتے ہیں ۔ اگر کوئی خاص ترمیم نہ کی جائے تو بھی تین حصے خود بخود موجود ہیں جن میں سے ہر ایک از خود ایک مکان ہے ۔ ہاں البتہ باؤلی صرف ایک اور سب میں مشترک ہے ۔ اس بلاک یا مکان سے اور بھی بڑی بڑی عمارتیں رہائشی اغراض کی برآمد ہوئیں ہیں جیسے مکان نمبر ۲۷ و ۱۸ ۔

عمارات جنکی غرض تنقیح طلب ہے

اس کے علاوہ دوسرے قسم کی عمارتیں (مثلاً نمبر ۳) برآمد ہوئی ہیں جن کا مقصد اب تک معلوم نہ ہو سکا کہ کس غرض کے لئے استعمال کی جاتی تھی ۔ ممکن ہے کہ یہ مندر وغیرہ کے طور پر استعمال کی جاتی ہوں کیونکہ ان کے چند کمروں سے شیو کی مورتیاں برآمد ہوئیں ۔ یا کسی اور

غرض کے لیئے استعمال کی جاتی ہوں۔ کیونکہ کسی خاص کمرے سے مورتی برآمد ہونا اس کی دلیل نہیں کہ مندر رہی ہو۔ اکثر ہندو گھرانوں میں آج بھی مکان میں ایک کمرہ بغرض پرستش و عبادت مختص کردیا جاتا ہے۔ اس خیال کے تحت یہ مکان کا ایک کمرہ عبادت ہوسکتا ہے۔ اس قسم کے مکانات کی تعمیر ویسی نہیں جیسی کہ اوپر بیان کی جاچکی ہے۔ اور رہائشی اغراض کے لئے اتنے آرام دہ نہیں جتنے کہ موخر الذکر۔

ایک اور قابل ذکر عمارت بہت بڑا ستونوں والا ہال ہے جو کہ حصہ ج بلاک میں پایا گیا یہ بہت بڑا ہال ہے جس کے ورانڈے میں ستون لگے ہوئے ہیں۔ بالکل دور وسطیٰ کے دربار عام کی شکل کا بنا ہوا ہے اس میں درمیانی جگہ کے اطراف بنچیں پتھر کی موجود ہیں۔ اس کی فن تعمیر بالکل بدھی وہارے سے ملتی جلتی ہے۔ اور ایلورہ کے مہاروارہ ہال سے مشابہت رکھتی ہے۔ سر جان مارشل کی رائے میں درمیانی نشست کے اطراف جو بنچوں کی لائن ہے اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ یہ ان لوگوں کا اسمبلی ہال ہوگا اور اس سے اس وقت کے سیاسی حالات پر کچھ روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔

حمام Public Bath

موہنجداڑو کی کھدائی میں ایک بہت بڑا حمام جو کہ رفاہ عام کے لیۓ تھا پایا جاتا ہے۔ ایسے حمام قدیم اور زمانہ ماقبل تاریخ کے دیگر مقامات میں کہیں نہیں پائے جاتے۔

سر جان مارشل کی رائے میں یوں تو حمام کو موہنجداڑو میں بہت کافی اہمیت ہے کوئی گھر بغیر حمام کے نہیں ملتا۔ مگر اس بہت بڑے حمام کی کیا اہمیت ہوسکتی ہے اب تک صحیح طور پر قیاس نہیں کیا جاسکا کہ اس حمام کی اہمیت محض حفظان صحت کی اصولوں کی حد تک محدود تھی یا اس کو کوئی سماجی یا مذہبی اہمیت بھی حاصل تھی۔ حمام کے درمیانی حصہ میں ایک بہت بڑا حوض ہے (۸ × ۲۳ × ۳۹) جس میں دونوں طرف سے سیڑھیاں اترنے کے لیۓ موجود ہیں۔ یہ حمام غریب اور امیر عورت مرد اور بچے بوڑھے سب کے لیۓ ہوا کرتے۔ اس حوض میں بجانب شمال ایک خاص اور معین حصہ صرف ایک خشک گہرائی کا ہے جہاں کہ ضعیف اور بچے اور کمزور نہا سکیں۔ جملہ تعمیر پختہ سرخ اینٹوں سے کی گئی ہے۔ مسٹر میکے کی رائے میں یہاں کی سیڑھیوں پر سامنے چوبی حاشیہ دیا جاتا تھا تاکہ نہ صرف مضبوطی رہے بلکہ پھسلن بھی کم ہو۔ اس قسم کی تعمیر قرون وسطیٰ سے لیکر حالیہ دور تک اکثر امیر و امراء کے محلوں میں پائی جاتی ہے۔ اس

حوض کے پانی کے نکاس کا تو معقول انتظام ہے ۔ مگر اس کو پھر کیونکر بھرا جاتا ہوگا ۔ اس پر مسٹر میکے نے بحث کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ نمبر ۱۶ کی باؤلی سے اس کو اندرونی طور پر بھر دیا جاتا ہوگا کیونکہ باؤلی اور حوض میں اندرونی طور پر تعلق رکھا گیا تھا جو مرور زمانے کے ساتھ بند ہوگیا تھوڑی دور تک تو کھدائی سے سلسلہ معلوم ہوتا ہے مگر بعد میں پتہ نہیں چلتا ۔ اس حوض کے گرداگرد بہت سے بند حمام یا کمرے ہیں ۔ سرجان مارشل نے ان کمروں کے بازو اور دوسرے منزلہ کے ایک باقی حصہ پر کوئلہ پایا ہے جس سے انہوں نے اندازہ لگایا کہ یہ گرم پانی کے حمام ہوں گے اور بہت ممکن ہے Hot air bath ہوں ۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہم کو بلا شک و شبہ مان لینا پڑتا ہے کہ ان لوگوں کی سائنس اور دیگر ترقیات اور معیار زندگی کسی حالت میں بھی ہم لوگوں سے کم نہ تھی کیونکہ Hot air bath بالکل نئی اور حالیہ زمانے کی چیز ہے جو کہ یورپ میں اور ہندوستان کے بہت بڑے بڑے بلاد میں جاری ہوا ہے ۔ حفظان صحت کے اُصولوں پر مسام کھولنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں ۔ جس سے اہل موہنجدارو واقف تھے اور مستفید ہوا کرتے تھے ۔ ان کمروں کی سطح بہت ڈھلوان رکھی جاتی تھی تاکہ پانی بہت جلد بہ جائے ۔ جو ڈرینیں میں ملا دیا جاتا تھا ۔ ڈرینیں کے اوپر پتھر رکھے ہوئے پائے جاتے ہیں یہاں دیواروں میں بھی پانی کے حوض پائے گئے ہیں جس سے بند حمام کی اہمیت میں اضافہ ہوجاتا ہے ۔ کہ ان میں گرم اور سرد پانی پہونچایا جاتا تھا ۔ یہاں کی تعمیر میں اینٹ بہت پختہ اور بڑی استعمال کی گئی ہے ۔ اینٹوں کے درمیان معمولی مٹی یا کھریا نہیں بلکہ سمنٹ پائی جاتی ہے (جس کی کیمیائی تحلیل کرنے پر کھریا ۔ چونا ۔ ریتی اور الکلائین سالٹ پایا گیا) جو کہ اس وقت بہت کمزور اور خراب ہوگی ۔ اس کے نکل جانے کے باوجود بھی اینٹوں کے درمیان کوئی شگاف نہیں پایا جاتا ۔ کیونکہ اینٹوں کو یہاں پر گھس کر تعمیر میں لایا گیا ہے ۔ اوپر کی طرف دو زینے پائے گئے اور ایک بہت تھوڑا حصہ اس وقت بھی دو منزلہ ملتا ہے جس سے گمان غالب ہے کہ حمام کا بہت بڑا حصہ کم سے کم دو منزلہ ضرور ہوگا ۔ مگر یہ ہنوز واضح نہ ہوسکا کہ دو منزلہ پر بھی حمام ہوتے تھے یا وہ حصہ کسی اور کام میں لایا جاتا تھا ۔ اگر حمام ہوتے ہوں گے تو ان میں پانی کے رسد کا کیا اہتمام تھا ۔

حمام کی عمارت میں داخل ہونے کے لئے چھ دروازے پائے جاتے ہیں۔ مسٹر میکے کی رائے میں ایک صدر دروازہ یا گیٹ بھی ہونا ضروری ہے۔ گو اس کے آثار نابود ہو گئے ہیں۔ قلت گنجائش کے باعث حمام کے متعلق مزید تفصیلات یہاں پیش نہیں کی جا سکیں۔ مگر اس قدر بڑے اور وسیع اور بلند معیار کے حمام بغرض رفاہ عام دنیا کے لئے ایک غور و فکر کی شئے بنا ہوا ہے۔

دیگر تمدنی عناصر اور فنون لطیفہ

عمارات کا ذکر باختصار ختم کرنے کے بعد ہم ان لوگوں کے طریق زندگی اور ان اشیاء سے جو کہ ان کے روزمرہ کام آتی تھیں اور وہاں کی کھدوائیوں میں دستیاب ہوئی ہیں۔ بحث کریں گے کہ آج سے پانچ چھ ہزار سال قبل کا رہن سہن اور طریق زندگی کیسا ہے موہنجدارو اور ہڑپا میں اس وقت کاشتکاری اور زراعت کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ ایک خاص قسم کا چقماق کے پتھر کا آلہ دستیاب ہوا کہ جس سے کہ ہل کا کام لیا جاتا تھا۔ اور غلہ بھی از قسم گیہوں اور جو دستیاب ہوا ہے جو کھلیوں میں صاف کیا جاتا تھا۔ چکی کے بھی آثار پائے جاتے ہیں مگر گول حالیہ طرح کی چکی یہاں معدوم معلوم ہوتی ہے۔ اناج کے علاوہ وہاں کے لوگوں کی خوراک میں گوشت۔ تازہ اور سوکھی مچھلیاں مرغ اور دیگر پرندے۔ دریائی اور سمندری مچھلی۔ دیگر دریائی جانور از قسم کچھوے اور گھڑیال بھی داخل تھے جس کا ثبوت باورچی خانہ کے قریب ان جانوروں کی نیم سوختہ ہڈیوں اور ڈھانچوں سے ملتا ہے۔ سر جان مارشل کی رائے میں ان لوگوں میں دودھ اور پھل (جو کہ اس وقت وہاں پیدا ہوتے ہوں) اور دیگر سبزیات وغیرہ کے بھی استعمال کا رواج ہونا ضروری ہے۔ گو اس کا صریح ثبوت قطعی طور پر نہیں پایا جا سکتا۔

پالو جانور

موہنجدارو میں پالو جانور بھی بکثرت ہوا کرتے تھے۔ اس زمانہ ماقبل تاریخ میں سانڈ بھینس بھیڑ۔ ہاتھی۔ اونٹ۔ سور اور مرغ بکثرت پائے جاتے تھے جیسا کہ ان کے ڈھانچے دستیاب شدہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ آخری دو کے متعلق شک ہے کہ آیا وہ پالتو تھے یا جنگلی جو کہ بعد شکار لائے جاتے تھے۔ کتے کے پالتو ہونے کے متعلق کوئی صریحی قدیم شہادت نہیں ملتی۔ کتے کے ڈھانچے جو ملے ہیں وہ اوپری سطح پر ہیں جس سے یہ قیاس کرنے میں دشواری ہوتی ہے کہ یہ ڈھانچے زمانہ ماقبل تاریخ کے ہیں یا بعد کے۔ کرنل سویل Swell کی رائے میں کتے بھی موہنجدارو میں پائے جاتے تھے

جو کہ Australian Hound یا آسٹریلیا کے شکاری کتوں کے مشابہ ہوتے تھے۔ ثبوت میں
چند مہروں کے نقوش کو پیش کرتے ہیں جو کہ کتے کے مشابہ ہیں مگر پوری طور پر واضح نہیں۔ البتہ سکندر اعظم
کے حملہ کے دوران میں وہاں بہت خوفناک قسم کے کتوں کا ذکر آتا ہے جو کہ شیر کا بھی مقابلہ کرسکتے تھے۔
گھوڑے کے متعلق بھی یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ آیا یہ جانور موہنجداڑو میں پالتو حالت میں تھا یا نہیں۔
کیونکہ ہڑپا میں اس کا کوئی نشان نہیں پایا جاتا مگر کرنل سویل نے ثابت کیا ہے کہ یہ جانور موہنجداڑو میں تھا
اور اس وقت کے گھوڑے حالیہ کاٹھیا واری گھوڑوں کی طرح ہوا کرتے تھے۔ پروفیسر Langdon
کی رائے میں گھوڑا وادی دجلہ و فرات میں تین ہزار سال قبل از مسیح پہلے بھی پایا جاتا تھا تو بہت ممکن
ہے وہاں سے وادی سندھ میں آیا ہو۔ ان تمام دلائل سے گھوڑے کے وجود کے نظریہ کو
تقویت پہونچتی ہے۔

بیلوں اور دیگر جانوروں کی جو تصویریں مہروں پر نقش ہیں۔ ان سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ
اس وقت افزائش نسل حیوانات کے طرف بھی توجہ کی جاتی تھی۔ کیونکہ جانوروں کی جسمانی حالت نہایت ہی
صحتمند اور سڈول ہے ورنہ جب تک حقیقت نہ ہو آرٹسٹ آرٹ میں نہیں لاسکتا۔

وحشی اور جنگلی جانور | موہنجداڑو میں جنگلی اور وحشی جانوروں کا بھی وجود پایا جاتا تھا جس کا یا تو شکار کیا
جاتا یا پکڑ کر رکھا جاتا۔ ان میں نیولا۔ چوہے اور چار قسم کے ہرن۔ (کشمیری بارہ سنگا۔ سانبر۔ چیتل
اور سیاہ رنگ کا ہرن) عام طور پر پائے جاتے تھے۔ وحشی جانوروں میں شیر۔ گینڈا۔ بندر۔ ریچھ
اور خرگوش کا وجود بھی مہروں اور نقوش سے ثابت ہے۔

ادویات | ادویات کے قسم سے موہنجداڑو میں کوئی چیز دستیاب نہیں ہوتی شاید دست بردزمانہ سے
باقی نہ بچی ہو۔ صرف ایک قسم کی سیاہ چیز چٹانوں سے ملی ہے اور وہ سلاجیت ہے۔ جو کہ اس وقت بھی بطور
دوا استعمال کیا جاتا تھا۔ اور آجکل ایورویدک حکمت میں جس کی اہمیت اظہر من الشمس ہے۔

دھاتیں | موہنجداڑو میں ضروریات زندگی اور خانہ داری اسلحہ حرب اور اوزارات کے لئے مختلف
قسم کی دھاتوں کا رواج پایا جاتا تھا۔ جن میں تانبہ۔ ٹین جست بہت عام ہیں یہ بات ثابت نہ ہوسکی کہ

دھاتیں کہاں سے حاصل کی جاتی تھیں آیا وہاں کوئی کان تھی یا دیگر مقامات سے برآمد کی جاتی تھیں سرجان مارشل کی رائے میں ایران اور عرب اور تبت سے درآمد کی جاتی ہونگی مگر سر ایڈون پسکو Sir Edwin Pascoe کی رائے میں سونا جو یہاں زیورات وغیرہ میں استعمال کیا گیا ہے جنوبی ہند سے درآمد ہوا ہے یعنی حیدرآباد اور میسور کی کانوں کا سونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ اس سونے میں چاندی خاص تناسب کی پائی جاتی ہے اور اب بھی کولار (میسور) کی کان میں چاندی کا تناسب زیادہ ہے۔

جست اور چاندی بھی سونے کی طرح زیورات اور بڑے ظروف کی تیاری میں کام آتی تھی جست کا استعمال مقابلتہً دیگر دھاتوں کے بہت کم نظر آتا ہے۔ تانبا البتہ بکثرت استعمال ہوتا تھا کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عہد حجر کے بعد تانبے سے بھی تمام اوزارات اور خانہ داری کی چیزیں مثلاً برتن۔ ظروف۔ اسلاحات۔ خنجر۔ بھالے۔ نیزے۔ چاقو۔ آرے۔ چھینیاں اُسترے اور ارزاں قسم کے زیورات مثلاً انگوٹھی۔ کڑے۔ لوالک۔ کرن پھول وغیرہ تیار کئے جاتے تھے۔ تانبا موہنجدارو میں اچھوتا بلوچستان اور ایران سے درآمد کیا جاتا تھا۔ اور اس درآمد اور برآمد سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھی تجارتی تعلقات بہت دور دراز ممالک تک پھیلے ہوئے تھے۔

تانبے کے علاوہ روزمرہ کے ضروریات کی اشیاء کی تیاری کے لئے ٹین اور کانسہ کے استعمال کا بھی رواج پایا جاتا تھا۔ کانسہ عموماً زیادہ تیز اور دھاردار اوزارات کی تیاری میں استعمال ہوتا تھا کانسہ کے بہت کم مصنوعات دستیاب ہوئے ہیں۔

پتھر | قدرتی طور پر سندھ میں پتھر بہت کم یاب ہے۔ مگر موہنجدارو کے مکانات کی تعمیر میں تین رنگ کا پتھر لگا ہوا ملتا ہے۔ سفید۔ زردی مائل اور چونے کا پتھر۔ پتھر کے متعلق ماہرین کا خیال ہے باہر سے درآمد کیا جاتا ہوگا۔ خصوصاً زرد رنگ کا پتھر جیسلمیر کے علاقہ سے آتا ہوگا۔ مکانات کی چوکھٹ اوزان۔ ظروف۔ طشتریاں۔ چاقو وغیرہ پتھروں سے تیار کئے جاتے تھے۔ پتھر۔ مذہبی مورتیاں۔ لنگ اور یونی کی تیاری میں بھی کام آتا تھا اور نالیوں کے اوپر بھی اکثر شاہ راہوں پر پتھر ہی ڈھکے ہوئے ملتے ہیں۔

جواہرات موہنجداڑو کے لوگ قیمتی کنکروں کے بھی قدر و قیمت اور استعمال سے واقف تھے مختلف رنگ و روپ کے کنکر زیورات میں جواہرات کے طور پر لگے ہوئے ملے ہیں۔ ان میں سنگی بلور لعل۔ سنگ سلیمانی۔ عقیق۔ عقیق ابیض۔ یشپ۔ سرخ چھینٹے دار کنکر۔ اور نیلم بہت عام ہیں جو کہ غالباً خلیج ایران۔ راجپوتانہ۔ پنجاب۔ نیلگری اور وادی گوداوری و کرشنا سے درآمد کئے گئے ہونگے۔

رال موہنجداڑو میں اکثر اشیاء کو پانی سے محفوظ کرنے یا بارش سے بچانے کے لئے رال (مشابہ لاکھ) اُس شئے کے اوپر لگادی جاتی تھی۔ اور اس طرح رال کا استعمال بھی عام تھا۔ رال مارشل صاحب کی رائے میں ایران سے درآمد کی جاتی ہوگی۔ یوں تو رال ہندوستان میں بھی پائی جاتی تھی مگر ایران کی رال بہت اچھی قسم کی ہوتی تھی۔

اہل موہنجداڑو ہاتھی دانت۔ ہڈی۔ سیپ و سنکھ اور گونگا وغیرہ کی صنعت میں بھی ماہر تھے مگر موخر الذکر دونوں کی صنعت کو یہاں کوئی خاص فروغ حاصل نہیں تھا جیسا کہ مصر و یونان وغیرہ میں۔ تاہم سیپ و سنکھ وغیرہ منقش حالت میں پائے گئے ہیں۔

سوت اور روئی سوت کاتنے کا عام رواج ہر امیر و غریب گھر میں پایا جاتا تھا۔ کیونکہ تقریباً بہت سے مکانوں میں سوت اور کاتنے کے آلات مٹی یا دیگر دھات کے ملے ہیں۔ اُون کا بھی رواج عام تھا۔ سوت کی تحقیق کرنے پر ماہرین روئی نے ثابت کیا ہے کہ وہاں بہت اعلیٰ قسم کی روئی پیدا ہوتی تھی جو کہ حالیہ امریکن اور مصری کپاس کے مقابلہ کی تھی۔ ماہرین پارچہ بافی کا خیال تھا اس سوت سے نہایت نفیس پارچہ بنا جاتا ہوگا۔ مسٹر گولاٹی اور مسٹر ٹرنر کی رائے میں پارچہ پر سنہری رنگ بھی دیا جانا ثابت ہے۔

(باقی دارد)

بالا پرشاد شکلا بی۔ اے (عثمانیہ)
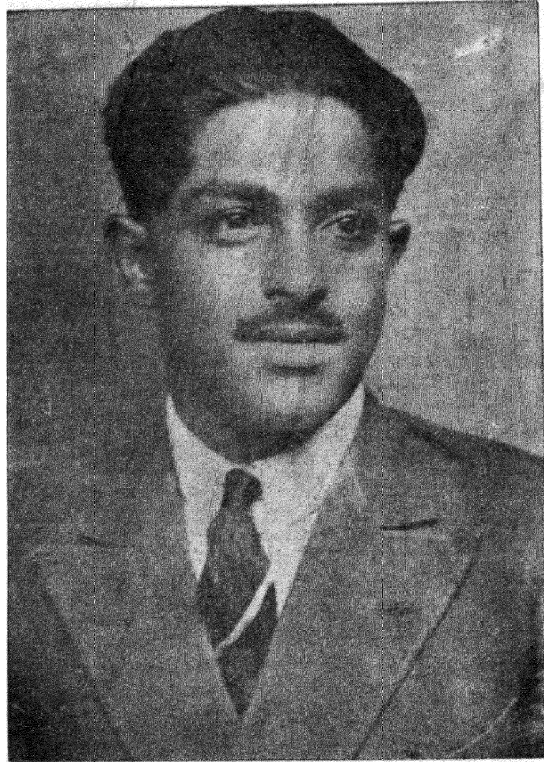
Mr. MIR ASAD ALI B. A., D. P. E. (Osman).
Captained Hockey Eleven in 1927-28. Formerly worked as Chief Physical Instructor.
He is at present Control officer of the students of the Osmania University.

"بدنصیب البانیہ"

گبن جو عالمی مورخین میں ممتاز درجہ رکھتا ہے، البانیہ کے متعلق یوں رقمطراز ہے کہ "یہہ ملک ایطالیہ کی نظروں میں ہے اور اتنا ہی کم معروف ہے جتنا کہ اندرونی امریکہ"۔ فی الحقیقت ساری بلقانی ریاستوں یعنی یوگوسلاویہ، البانیہ، یونان، ترکی، بلغاریہ اور رومانیہ میں اسے کوئی اہمیت حاصل نہیں درانحالیکہ اس کا جغرافی محل وقوع ایطالیہ اور یونان کی آویزش کے وقت جس میں آگے چل کر جرمنی اور انگلستان بھی شامل ہوگئے، بڑی قیمت رکھتا تھا اس کے شمال میں یوگوسلاویہ، مغرب میں بحر اڈریاٹک، جنوب میں یونان اور مشرق میں بلغاریہ اور یوگوسلاویہ کا جنوبی حصہ ہے۔ نقشہ کا سرسری مطالعہ البانیہ کی اہمیت کو بخوبی واضح کرسکتا ہے۔

پولینڈ اور البانیہ کی سیاسی زندگی بڑی حد تک ملتی جلتی ہے۔ پولینڈ ۱۷۷۲ء میں روس، پروشیا اور آسٹریا کے مابین منقسم ہوا۔ ۱۷۹۳ء میں اس کی دوسری تقسیم عمل میں آئی اور ۱۷۹۵ء میں تیسری۔ ۱۸۱۵ء میں ویانا کی کانگریس نے اس کے باقاعدگی سے حصے بخرے کئے۔ لیکن معاہدۂ ویرسائی کی رو سے ۱۹۱۹ء میں اس کو مکمل آزادی عطا ہوئی۔ اسے قسمت کی ستم ظریفی کہئے تو بجا ہے کہ ہٹلر اور اسٹالن کا آہنی طوق غلامی پھر سے پولینڈ کی گردن میں ڈالدیا گیا۔ البانیہ کی تاریخ بھی اسی قسم کے بدنما داغ پیش کرتی ہے۔ سلطنت عثمانیہ کی فتوحات سے قبل تمام بحر اڈریاٹک کے مشرقی ساحل پر ایطالوی پرچم لہراتے تھے۔ پندرہویں صدی سے

۱۹۱۴ء تک البانیہ ترکوں کے زیر اقتدار رہا۔ اس عرصہ میں تھوڑے تھوڑے وقفوں سے اسے آزادی حاصل ہوتی رہی۔ یہہ غالباً البانوی فطری اثرات تھے کہ حریت کے علمبردار اس ملک میں بسا اوقات خال خال رہے۔

۱۹۱۴ء میں البانیہ نے مکمل آزادی حاصل کر لی۔ اس پر آشوب زمانہ میں شہزادہ ولیم البانیہ کی ڈگمگاتی کشتی کا کھویا قرار پایا۔ اس ملاح کے بازو اتنے طاقتور نہ تھے کہ ناؤ کو بھنور سے نکال کر ساحل مراد پر لگا دیتے۔ ولیم خانہ جنگیوں اور جنگ عظیم کی تباہ کاریوں سے مغلوب ہوگیا اور سراسیمگی کے عالم میں ملک کو دشمن کے حوالہ کر کے راہ فرار اختیار کی۔ اتحادین کی فوجیں ملک میں گھس آئیں۔ یہہ بخوبی روشن رہے کہ گذشتہ جنگ عظیم میں ایطالیہ جو اس وقت نازیت کے آستانہ پر جبہ سائی کر رہا ہے، اتحادیوں کا حلیف تھا۔

مشہور انگریز سیاسی مورخ سر چارلس پیٹر اپنے مقالہ Lords of the Inland Sea میں البانوی انتداب کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے کہ " ایطالوی اقتدار کے تحت البانیہ کی آزادی انگلستان، فرانس اور روس نے ۱۹۱۵ء میں معاہدہ لندن کی رو سے تسلیم کر لی ہے ــــــ معاہدۂ ویرسائی ۱۹۱۹ء کے تکمیل پاتے وقت ایطالوی وزیر اعظم آرلینڈس Orlands کی عدم قابلیت کی وجہ سے محافظت کی بجائے انتداب کی شرط قرار پائی "

اس بیان نے ہم پر یہہ ظاہر کر دیا کہ ایطالیہ البانیہ کو ہضم کرنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ کوشش ناکامی پر منتج ہوئی۔ علاوہ بریں اس کمزور مسلک کے باوجود ایطالوی حکومت شطرنج کے مہروں کو یوں جماتی رہی کہ اسے انتداب سے بھی ہاتھ دہونا پڑا۔ برخلاف اس کے البانیہ کی ہمسایہ مملکتیں خاص طور پر یوگوسلاویہ نے اپنی سیاست کی تنظیم جدید شروع کی اور Strait of Otranto کے مشرقی ساحل پر عسکری قوت کو مستحکم کرنا شروع کیا۔ یوگوسلاویہ کا یہ طرز عمل ایطالیہ کے مفادات کو ٹھیس پہنچا رہا تھا۔ اسی زمانہ یعنی ۱۹۱۷ء میں شہزادہ ولیم فرار ہوگیا۔ جس پر ایطالوی کمانڈر انچیف نے البانوی باشندوں کا دل موہ لینے کے لئے یہہ اعلان کیا کہ

"سنیر رکا ملک البانیہ کو آزاد مملکتوں کے دوش بدوش کھڑا دیکھنے کا متمنی ہے۔" بہرحال اپنے موقف کو مستحکم کرنے کے لئے ایطالیہ نے ۱۹۲۱ء میں بلقانی ریاستوں کی کانفرنس منعقد کی جسمیں یہہ طے پایا کہ کسی قسم کا اقدام جس سے سرحد البانیہ میں تبدیلی ہو ایطالیہ کے حق میں مضرت رساں ہوگا اور اقدامی ملک مستوجب انتقام قرار پائیگا۔ چونکہ اس زمانہ میں انگریزی اقتدار بلقانی ریاستوں پر کم و بیش مسلط تھا۔ لہذا اس کانفرنس میں انگریزوں نے بلقانی نمایندوں کے ذریعہ ایطالیہ کو البانیہ کے حق انتداب سے محروم کروادیا اور جس کے ٹھیکہ دار برطانیہ و فرانس قرار پائے اور جن کے زیر اثر علی الترتیب فلسطین اور شام پر انتدابی حکومت قائم ہے۔

۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۵ء تک البانیہ ایک خونین ٹھیٹر بنا رہا تھا۔ بالآخر شاہ زوغو جن کا نام احمد زوغو ہے، اس ڈرامائی منظر پر اس طرح نمودار ہوئے کہ انہوں نے طویل خانہ جنگیوں کا خاتمہ کردیا اور خود صدر جمہوریہ قرار پائے۔ لیکن صرف ۳ سال بعد یعنی ۱۹۲۸ء میں البانیہ پر سے عمومیت کے پردے اُٹھے، حقیقت جلوہ نظر بنی اور احمد زوغو نے تخت سلطنت پر شاہی فرائض انجام دینے کے لئے قبضہ جمایا۔ شاہ زوغو کی ذاتی صلاحتیں اور فطری کاوشیں اُجاگر ہوئیں اور عمومیت کا جنازہ البانیہ جیسے حقیر ملک نے اٹھایا۔ اس جنازہ کو نکالنے اور شاہ زوغو کو تخت شاہی دلوانے میں یوگوسلاویہ کا حصّہ ناقابل فراموش تھا۔ لیکن شاہ نے اپنے محسن کی مخالفت پر کمر باندھی اور بڑی سرعت کے ساتھ ایطالیہ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ یہہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مکیاولی کی سیاست کے نقش قدم پر کسی مدبر کا گامزن ہونا اس کی بقا کے لئے ناگزیر ہے۔ بہرحال اس وقت مسولینی آمریت کے جامہ میں ملبوس ہوچکا تھا۔ اپنی پوری توانائیوں کیساتھ شاہ زوغو کی طرف قدم اُٹھایا تاکہ یوگوسلاویہ کو نیچا دکھائے۔ یوگوسلاویہ کا مالیہ اتنی حیثیت نہیں رکھتا تھا کہ وہ البانیہ کی امداد کے سلسلہ میں ایطالیہ سے ہمسری کا دعویٰ کرسکے۔ میدان صیغم ایطالیہ کے ہاتھ رہا۔ مادی امداد کا تیز دھارا البانیہ کی طرف بہہ نکلا۔ جنگل کٹوائے اور دلدل بھروائے گئے۔ تمباکو اور زیتون

کی کاشت کا انتظام بڑے پیمانہ پر کیا گیا۔ ملک کی زرعی اور صنعتی ترقی کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ شاہ زوغو نے اس امر کی امکان بھر کوشش کی کہ ترقی کے دوڑ میں البانیہ کو کم وبیش برابر کا حصہ دار بنا دے۔ اس مقصد براری کے لئے ہوائی سرویس، لاسلکی، ٹیلیفون، بنک اور کمپنیاں قایم کئے گئے۔ حقیقت یہہ ہے کہ مسولینی اس طرح کی امداد دینے سے البانوی باشندوں میں بڑا ہردلعزیز ہو گیا۔ لیکن "محافظ اسلام" کی اسلام نوازی سے ہم بہر نوع واقف ہیں اس کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ موقعہ آنے پر ان مساعی جمیلہ سے پوری طرح استفادہ کیا جائے اور البانیہ میں ایطالوی سیادت قایم ہو۔

شاہ زوغو نے عسکری انتظامات کی طرف بھی اپنی توجہ مرکوز کی۔ البانیہ میں جبری بھرتی کے باوجود فوج کی تعداد ۱۸۰۰۰ تھی جس میں ۳۱۳۱ افسر ۴۵۰ ۱۱ سپاہی سرحد کی حفاظت کے لئے ۴ بٹالین، ساحل سمندر کی حفاظت کے لئے ۶ موٹر بوٹ کا اضافہ عمل میں آیا جبکہ ساحل کا طول کم سے کم ۴۰۰ میل ہے۔

اس امر کی کافی شہادت موجود ہے کہ مسولینی نے تنظیم یافتہ ایطالوی فوج کو اپنے حلیف کی حفاظت کے لئے اس روپیہ پر ترجیح دی جو پہاڑی قوم یعنی البانوی پر ایطالیہ کی جانب سے صرف کیا جاتا تھا اور جسمیں اتنی قابلیت نہ تھی کہ وقت ضرورت بندوق کی نالیوں کو دشمن کی طرف پھیر دیں حالانکہ شاہ زوغو کی کوششیں عسکری انتظامات کی طرف پوری سرگرمی سے کام کر رہی تھیں۔ غرضکہ اس نہج کی ایطالوی مداخلت ایک عرصہ سے البانیہ میں کارفرما تھی۔ جس کا نتیجہ یہہ نکلا کہ مخالفوں نے شاہ زوغو کو "مسولینی کا کارندہ" اور "ایطالوی روپیہ کا بندہ" جیسے الفاظ سے یاد کیا۔ شاہ کی غیر ہردلعزیزی کی ایک وجہ انکی شادی بھی تھی۔ جو غیر البانوی لڑکی سے عمل میں آئی اور جس امر کے لئے ساری قوم مخالف تھی۔ اس رشتہ کو قایم کرنے میں مسولینی نے مکیاولی کے وہ توڑ جوڑ لگائے کہ مکیاولی کی مکاری اور گیری بالڈی کی سیاست دائی ہر وقت اس کے پیش نظر رہی۔ ہمارے شکوک حرف غلط کی طرح مٹتے ہیں جب ہماری

نظریں شاہ کے تمام مطالبات کی فاسطیت کی دہلیز سے سرسبز ہوتا ہوا دیکھتی ہیں۔ بہرحال شاہ نے جو اب تک صرف ایک قبیلہ کے سردار تھے' ۳۰۰ خونریزیوں میں اپنے ہاتھ رنگتے ہوئے البانوی تدبّر کی داغ بیل ڈال دی۔ لیکن یہہ عمارت غارتگری کی بنیاد پر قایم ہوئی تھی اور اس کے معمار جس فرض سے روشناس ہو چلے تھے اس کا یہہ ناگزیر نتیجہ تھا کہ قتل اور کشت وخون جو غیر مہذب اور جاہل اقوام کا طرۂ امتیاز ہے' البانوی باشندوں میں اس استحکام کے ساتھ سرایت کرتا چلا جائے کہ خود شاہ زوغو اپنی پوری جد و جہد کے باوجود اس بدنظمی کو دور کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ انہوں نے ایک قانون نافذ کیا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ جن گروہ کے مابین انسانی خون بہے اور جانیں تلف ہوں' ان کے کشتگان کو خارج کرنے کے بعد جو بقید حیات رہیں' ان سے فی کس ایک مقررہ رقم بطور خلاف ورزی قانون وصول کی جائے۔ اس مقام پر ہم البانیہ کو ہندوستان کے شمال مغربی صوبہ کے وحشی قبائل سے بھی گرا ہوا پاتے ہیں جن کی بربریت انگریز حکومت کے لئے مستقل خطرہ بتائی جاتی ہے۔ حاصل یہ کہ شاہ زوغو کی جہدِ مسلسل نے البانیہ کو ترقی کے راستہ پر ڈال دیا۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں ایطالیہ سے ایک معاہدہ "متحدہ ناقابل تغیر تحفظ" ۲۰ سال کے لئے وجود میں آیا۔ شاہ کے نزدیک یہہ سارے انتظامات مفید اور احسن تھے۔ اور مسولینی اپنی سیاست کاری پر فخر کر رہا تھا کہ اس نے البانیہ کو ہر طرح اپنے جال میں جکڑ لیا اور شاہ زوغو اطالوی امر کے ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ گئے۔ تاریخ سیاسیات کے طالب علم اس امر سے واقف ہیں کہ کس طرح مکیاؤلی گیری بالڈی اور میزینی نے ایطالوی قوم کو پستی سے نکال کر عروج پر پہنچا دیا۔ مکیاؤلی کہتا ہے کہ اخلاق اور مذہب کی پابندی افراد معاشرہ کے لئے ہے نہ کہ حکومت کے لئے۔ حکومت مذہب کو فنا کی آغوش میں سلا سکتی ہے' اخلاق کی بنیادوں کو اکھیڑ سکتی ہے اور وقت ضرورت معاہدوں کو توڑ سکتی ہے۔ یہ تھا مسولینی کا طرز عمل جس نے ۲۰ سالہ معاہدہ کو بالائے طاق رکھا اور البانیہ کی آزادی روند ڈالی۔

روم برلن محور بظاہر مستحکم اور پائیدار رہے۔ اس کی شکست کے اسباب تلاش کرنا غیر ضروری ہے۔ لیکن مسولینی کو جیسا کہ ہم دیکھتے آئے ہیں جاریہ جنگ کے ختم پر جرمنوں سے پیچھے رہنا گوارا نہیں۔ دونوں آمر لوٹ میں شریک ہیں۔ مسولینی ہر دفعہ مشکوک نگاہوں سے فیوہرر کی چالوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ دیکھتا ہے کہ اس کی کمزوری دنیا پر عیاں ہو چکی ہے۔ حبشہ میں ایطالوی افواج کی ناکامیوں نے اُس کا دل توڑ دیا۔ یونان پر مسلسل حملے اور آخر میں ہٹلری افواج کا اس کی امداد کو آنا اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ ایطالیہ میں چھوٹی مملکتوں سے مقابلہ کی بھی قوت باقی نہ رہی۔ یہہ رہا ایطالیہ کا کمزور موقف۔ دوسری طرف ہٹلر ہے کہ برابر دوسری مملکتوں کو اپنے زیر اقتدار لاتے ہوئے آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ہنگری اور رومانیہ ریخستاغ سے وابستہ ہو چکے۔ یوں بھی رومانیہ پر جرمن جنگی قبضہ عمل میں آچکا۔ ان حالات کے تحت یہہ کہا جاسکتا ہے کہ دونوں متذکرہ مملکتیں جو پہلے سے بہ اعتبار معاشی حیثیت نیم دیوالیہ ہیں، ہٹلر کی دائمی غلامی بہت جلد قبول کرلیں گی۔ رومانیہ پر متقدر ہونا جرمنی کو بحر اسود تک پہنچا دیتا ہے۔ جہاں سے ترکی پر سمندری حملے ہو سکتے ہیں۔ علاوہ بریں اب تو بلغاریہ بھی جو ایک اسلامی مملکت ہے، ہٹلر کے آگے سر تسلیم خم کر چکی ہے کیا اچھا ہوتا اگر روس جرمن معاہدہ وجود میں نہ آتا اور روس یا تو غیر جانبداری کی پابندی کرتا یا نہیں تو اتحادئین کی طرف جھک جاتا جس کے بعد ہٹلر کا رومانیہ، ہنگری، بلغاریہ۔ یوگوسلاویہ اور یونان پر اقتدار نہ دکھائی دیتا اس وقت جبکہ ہٹلر مشرق کی طرف قدم اٹھا رہا ہے، روس کا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہنا اسٹالن کو اس راستہ پر گامزن کراتا ہے جہاں پر بربادیوں کی نہ ختم ہونے والی گہرائیاں اس کے استقبال کو آگے بڑھتیں۔ لیکن لینن کے جانشین نے اپنی حکمت عملی کا جائزہ لیا اور جرمنی کے بطل اعظم کے آگے ایک سنگین دیوار کھڑی کردی ہے۔ ہٹلر چاہتا ہے کہ یوکرین کے تیل کے چشموں سے فائدہ اٹھائے اور جنگ کے طولانی ہونے میں جس کے امکانات قوی ہو چلے ہیں، کسی قسم کی فکر دامنگیر نہو۔ لیکن یوکرین اور قفقاز کے معدنی وسایل سے اس وقت استفادہ

کیا جاسکتا ہے جبکہ ہٹلر کو اس سرزمین پر اطمینان کا سانس لینا نصیب ہو۔ اسٹالن گراڈ اور روسٹوف پر جس بے مثال جرأت و پامردی سے جمہوریہ اشتراکیہ کے سپوت محوری دول کی عددی برتری کا ترکی بہ ترکی جواب دے رہے ہیں، وہ جاریہ جنگ کی تاریخ میں ایک ناقابل فراموش باب ہے۔ جرمنی کی یہہ قوت ایطالیہ کے لئے تشویشناک ضرور ہے کیونکہ مسولینی اپنے کو شمال اور مشرق میں مقید پائیگا اور روم برلن محور میں کمزور حلیف بن کر اس کو اپنے ظاہری غیر متنزلزل وقار سے جس کا وہ آج حامی ہے محروم ہونا پڑے گا۔ اس زد سے بچنے کے لئے اس نے دو قدم اٹھائے۔ ایک البانیہ کی جانب اور دوسرا یونان کی جانب۔ اوّل الذکر کو اس نے تنہا شکست دی اور آخر الذکر کی فتح کے لئے مجبوراً جرمنی کو آنا پڑا۔ بہرحال البانیہ کا الحاق چند گھنٹوں میں عمل میں آیا کیونکہ پانچویں کالم کے سارے انتظامات پائے تکمیل کو پہنچ چکے تھے۔ اخباری معلومات شاہد ہیں کہ کس طرح یوگوسلاویہ اور یونان پر ڈورے ڈالے گئے اور کس طرح ان کو اپنے زیر سیادت لانے کی کوششیں جاری رہیں۔ یوگوسلاویہ نے روم برلن محور کے آگے گھٹنے ٹیک دئے۔ قابل ستایش ہے یونان کہ اس نے سینیرر کی عسکریت اور مکیاولی کی چالبازیوں اور مکروفریب سے جنگ کی اور دنیا پر یہہ ثابت کردیا کہ کس طرح صداقت باطل کے مقابلہ میں ڈٹ جاتی ہے۔ یونان آج محکوم مملکتوں کی صف میں کھڑا ہے لیکن اس کی روح آزاد ہے اور اتحادیین کے شانہ بہ شانہ ہنڈن برگ کے جانشین سے برسر پیکار ہے۔ یونان اور کریٹ کے بعد روم برلن محور کی نظریں ترکی پر جم گئی ہیں۔ فان پاپن جرمن سفیر متعینہ انقرہ کی وہ ساری جدوجہد ہمارے سامنے ہے جو ترکی کو اتحادئین سے توڑنے کے لئے کی گئی تھی۔ اخبارات کہہ رہے ہیں کہ جرمنی قوت و اقتدار کو کام میں لاکر ترکی پر دھاوا بولنا چاہتا ہے اور ہمیں یہہ بھی معلوم ہے کہ روس و انگلستان نے ترکی کو اپنی پوری پوری امداد کا یقین دلایا ہے ممالک متحدہ امریکہ قانون پٹہ و قرضہ کے تحت ممکنہ مدد ترکی کو پہنچا رہا ہے۔ مسٹر وِنڈل ولکی کا حالیہ سفر جس کا مقصد ترکی اور امریکہ کے سیاسی تعلقات کو استوار کرنا ہے، محوری پروپگنڈے کو نقش برآب

بنا دیگا۔ ترکی کو ہتیا لینے کی کوششیں سمجھ لیجئے کہ پانی پر نمک کے محل تیار کرنیسے کم نہیں۔ اور سراج اوغلو وزیر اعظم مملکت ترکیہ نے حال میں ببانگ دہل اعلان کردیا کہ اگر ترکی سرحد پر کسی نے ٹیڑھی نظر بھی ڈالی تو ترک ہر قسم کی اقدامی کارروائی کے لئے اپنے عصری اسلحہ اور سرفروشان ملت کی پرشکوہ سپاہ کے ساتھ غنیم کی امیدوں پر پانی پھیرنے تیار ہیں۔ بہر حال، ہم یہہ کہیں گے کہ انگریز حکومت کا یہہ فرض اولین ہے کہ وہ ترکی اور مصر کو دشمن کی للچائی ہوئی نظروں سے محفوظ رکھے تاکہ ہندوستان کا راستہ ایطالوی عزائم کے خطروں سے دور رہے۔

سیاسیات کا طالب علم حقیقت بیں نگاہوں سے رفتار زمانہ کا مطالعہ کرتا ہی اور جب کبھی اس کے قلم کو جنبش ہوتی ہے تو صداقت اور حقانیت کے گوہر قرطاس ابیض پر بکھر جاتے ہیں۔ اسی کلیہ کی روشنی میں اگر مصر کی موجودہ حالت پر غور کیا جائے تو یہہ امر بالکل عیاں ہے کہ ہٹلر کی ابتدائی کارروائیوں نے کامیابیوں کا منہ دیکھا ضرور اور جرمن فوجیں افریقہ کے شمالی ساحل کے کنارے کنارے مصر کی جانب بڑھتی گئیں لیکن جیسے ہی فیلڈ مارشل رومل نے قلوپطرا کی سرزمین پر قدم رکھا تو واقعات نے پلٹا کھایا اور اس اقدام کو فرزندان حریت نے اپنی فقید المثال قربانیوں سے روک دیا جو جاریہ جنگ کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ امریکہ کی بروقت امداد جو خلوص دل سے جاری ہے، مصر کو بربریت اور دوزخی منصوبوں سے پاک رکھے گی۔ مصر نازیت کا گلا گھونٹ کر اقوام متحدہ کے ۱۴ اگسٹ ۱۹۴۱ء والے "نئے نظام عالم" کی داغ بیل ڈالیگا۔

مختصر یہہ کہ البانیہ کی مسلم مملکت جس طرح Oracle of Delphe کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھی وہ ضیغم ایطالیہ کی ہوس ملک گیری کا آئینہ ہے۔ جو نقوش ہم پر مرتسم ہوئے وہ ڈوچے کی سیاست کاری کو جس میں مکر و فریب کا عنصر غالب ہے، باحسن الوجوہ نمایاں کرتے ہیں۔ "محافظ اسلام" کی مسلم کش حکمت عملی سارے

عالم اسلام کے لئے ایک تازیانہ ہے۔ مسلم طبقوں کی مادی اور روحانی امداد اتحادیوں کے پلڑے میں اپنا پورا وزن رکھے گی۔ اگر ہماری توقعات پوری نہوئیں تو خود البانیہ ایطالوی عزائم کو مشرق میں کامیاب بنانے کے لئے ایک فوجی مرکز کی حیثیت اختیار کرے گا جس کے قرائن ظاہر ہونے لگے ہیں۔ بہر حال شاہ زوغو نے جسے اپنا دوست خیال کیا تھا اسی نے انکی پیٹھ میں خنجر بھونک دیا۔ غریب البانوی ڈوچے کی ستم کاریوں کے سامنے نہتے ہیں۔ جرمن سیلاب البانوی سرحد سے گذر کر ترکی کے سامنے ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ البانیہ کی حالیہ آزادی کی جد و جہد جس بیرحمی سے کچل ڈالی گئی وہ اس کے مستقبل کو تاریک کر دیتی ہے۔ لیکن کیا عجب کہ حالیہ آویزش نے جس طرح ہیل سلاسی شہنشاہ حبشہ کو اپنی کھوئی ہوئی مملکت پر آزادی کے پرچم اڑانے کا موقعہ دیا، اسی طرح شاہ زوغو کو بھی پھر ایک دفعہ " ٹوٹی کشتی کا ملاح " بنا دے۔ یہی منزل ہوگی جہاں سے کامرانیاں اقوام متحدہ کے قدم چومنے کے لئے آگے بڑھیں گی اور البانیہ ستاروں کی تابناکیوں سے قریب ہو جائے گا۔

سید علی محمد موسوی ایم۔ اے (آخری)

مہتمم مدیر و مدیر انگریزی
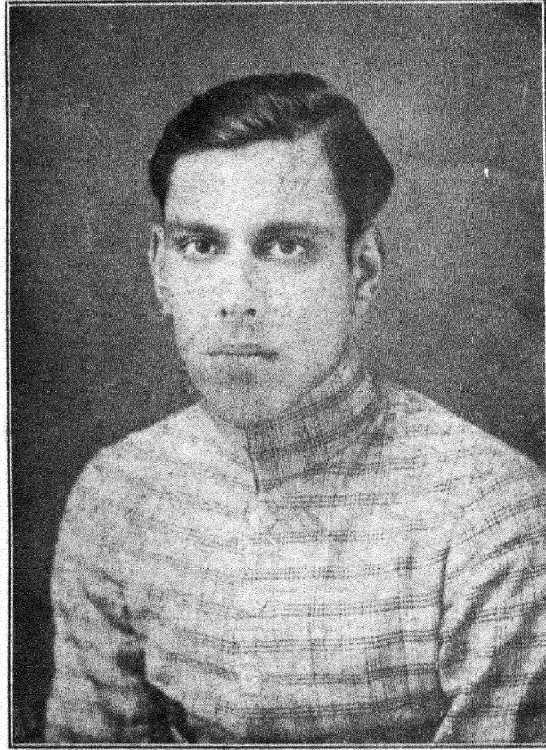
محمد اشہد خان صاحب بی ۔اے (عثمانیہ) مدیر اردو

کلیہ کی خبریں

انجمن اتحاد انجمن اتحاد کے انتخابات جامعی زندگی میں ایک جوش، ولولہ عام بیداری اور ہلچل پیدا کردیتے ہیں۔ یوں تو ہر سال انتخابات نہایت دلچسپ ہوتے رہے ہیں لیکن اس سال کے انتخابات غیر معمولی طور پر مرکز توجہ بنے رہے اور سالہائے ماسبق کی بہ نسبت اس سال طلبا کی ایک کثیر تعداد نے رائے دہی میں حصہ لیا اور حسب ذیل عہدہ داران کا انتخاب عمل میں آیا۔

صدر۔ عاقل علی خاں صاحب بی۔اے۔ عثمانیہ

نائب صدر۔ مرزا سیف علی بیگ صاحب بی۔ایس۔سی (عثمانیہ)

معتمد۔ ابو تراب خلیل الدین صاحب

کتب خانہ دار۔ حامد محی الدین صاحب۔

انجمن اتحاد کا مقصد برادران کلیہ میں ربط، ضبط اور خوش آہنگی پیدا کرنے کے علاوہ طلبار کے ملکۂ تقریر اور مباحثہ کو تربیت اور جلا دینا بھی ہے۔ عہدہ داران انجمن نے حتی الامکان اس خصوص میں کوشش کی متعدد مباحثے منعقد ہوئے۔ باہر کے مقابلوں میں جامعہ کی نمائندگی بھی کی گئی لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ جامعہ کا تقریری اور تحریری معیار وہ نہیں رہا جو پہلے تھا۔ جس کی بڑی وجہ طلبار میں ربط ضبط اور ہم آہنگی کی کمی ہے۔

'یوم جامعہ' طلبار کی اجتماعی کوششوں کا نتیجہ اور ان کی ہم آہنگی کا مظہر ہوتا ہے۔ یوم جامعہ نہیں منایا گیا۔ صرف اس سال ہی نہیں بلکہ گذشتہ سال بھی اس کو نظر انداز کردیا گیا۔ یوم جامعہ کا نہایت ہی اہم جزو سالانہ اسپورٹس کے مقابلے ہوا کرتے تھے وہ بھی نہ ہوسکے چنانچہ اتھلیٹک اسپورٹس کے

کپتان ایوب احمد کرمانی نے جو رپورٹ ہم کو بھیجی ہے اس میں ایک معقول شکایت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں
"ہاکی فٹ بال، کرکٹ ٹینس میں باہمی دوستانہ مقابلہ آئے دن منعقد ہو سکتے ہیں مگر ایتھلیٹک
اسپورٹس میں جب تک بڑے پیمانہ پر انتظام نہ کیا جائے اس کی گنجائش یا موقع نہیں، یوم جامعہ کے
سلسلہ ہی میں اس کا ایک موقع ملتا تھا جس میں برادران جامعہ بڑے شوق و انہماک سے حصہ لیتے
تھے۔ اسپورٹس کا مظاہرہ نہ صرف دلچسپی کا باعث ہوتا تھا بلکہ اس سے طلبا اور اساتذہ میں تماس پیدا
ہوتا تھا۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے۔ یا انجمن اتحاد کے عہد داروں کی فرض ناشناسی کہ گذشتہ دو سال
سے نہ یوم جامعہ ہی منایا جا رہا ہے اور نہ اسپورٹس کے مقابلے منعقد ہو رہے ہیں۔ سال میں ایک ہی
موقع ملتا تھا اس سے بھی محروم کر دیا گیا جس کی ہمیں شکایت ہے اور بہت ہی شدید"

ہمیں اس شکایت سے اتفاق ہے لیکن یہ صحیح نہیں کہ اس تساہل کے ذمہ دار صرف
عہدہ داران انجمن اتحاد ہیں بلکہ اس کی ذمہ داری تمام طلبا برادری پر ہے کیونکہ ہم میں جوش و ولولہ اور
سب سے بڑھ کر ہم آہنگی کی کمی ہے جس کا نتیجہ ہمارا جمود ہے اور جمود اس کا ذمہ دار ہے

مباحثے متعدد تقریری مقابلے منعقد کئے گئے بعض نئے اور بعض قدیم مقررین نے اس میں
حصہ لیا۔ مسٹر احمد محی الدین، مسٹر عبدالحق، مسٹر بی۔ کے نرائن، مسٹر رحیم الدین ظہیرآبادی
اور مسٹر شعیب اللہ خاں نے نمایاں حصہ لیا۔

قرضہ حسنہ فنڈ اس سال انجمن اتحاد کے قرضہ حسنہ فنڈ سے نادار طلبا کو قرضہ حسنہ دیا گیا جو نہایت ہی
مستحسن اقدام ہے۔ امید ہے کہ اس کو آئندہ بھی برقرار رکھا جائیگا۔

ذیلی بزمیں

بزم دینیات

صدر قاضی محمد عبدالرحمن صاحب بی۔ اے۔

نائب صدر خلیل الرحمن صاحب۔ بی۔ اے۔

خازن محی الدین محمد عبدالقادر صاحب۔ بی۔ اے۔

جلسہ کرسی نشینی بصدارت نواب بہادر یار جنگ بہادر منعقد ہوا خطبۂ صدارت میں بعض

اہم اور مفید تحریکیں پیش کی گئیں۔ بزم کی جانب سے متعدد جلسے منعقد ہوئے۔

بزم قانون

صدر ۔ عالیجناب پروفیسر حسین علی مرزا صاحب۔
نائب صدر ۔ ریاض احمد صاحب
معتمد ۔ غلام سعادت علی صاحب
خازن ۔ سید افضل علی خاں صاحب
اراکین ۔ محمد مظفر الدین صاحب
شنکر جی صاحب
یعقوب حسینی صاحب

اس سال ذیلی بزموں میں بزم قانون غیر معمولی طور پر مرکز توجہ بنی رہی اختتامی جلسہ عالیجناب آنریبل عبدالعزیز صاحب صدرالمہام کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ نائب صدر نے چند اہم تجاویز پیش کیں جس سے جناب صدر نے اتفاق کیا اور عملی طور پر امداد کا وعدہ فرمایا۔ معتمد صاحب بزم قانون کی کوششوں اور کاوشوں کے باعث اس سال بزم قانون کی جانب سے ایک درسی تقاریر کا سلسلہ شروع ہوا جو نہایت فائدہ مند اور کامیاب ثابت ہوا۔ بزم کی جانب سے یوم خودمختاری سلطنت آصفیہ منایا گیا جس میں عالیجناب صدر اعظم بہادر نے بہ نفس نفیس شرکت فرمائی۔ بزم کا یہ آخری جلسہ تھا مگر اس جلسے نے جو نقوش چھوڑے ہیں وہ بہت دیرپا اور قابل قدر ہیں۔ اس کامیابی کا سہرا بزم کے سرگرم، ہونہار اور کامیاب معتمد جناب سعادت علی صاحب کے سر ہے۔

پروفیسر حسین علی مرزا کی غیر معمولی دلچسپی اور سرپرستی نے بزم کی زندگی میں ایک گونہ اضافہ کر دیا اور بزم کو طیلسانین کے معیار کے شایان شان بنا دیا۔

اعزازی ڈگریاں

جامعہ کی خوش قسمتی ہے کہ جناب والا شان پرنس معظم جاہ بہادر نے ۱۵ رمضان ۱۳۵۰ ف کو ایک خصوصی جلسۂ تقسیم اسناد میں ال ال ڈی کی ڈگری کو قبول فرما کر جامعہ کی عزت افزائی فرمائی۔

جامعہ کے مایہ ناز سپوت جناب رضی الدین صاحب کو ڈی ایس سی اور ہمارے مشفق معین امیر جامعہ نواب مہدی یار جنگ بہادر کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگریاں دی گئیں۔

تقرر اور تبادلے انتظامی وجوہات اور کارگزاریوں کی بنا پر بعض اساتذہ صاحبان کا تبادلہ اور بعض کا تقرر عمل میں آیا، ہمارے دل اجتماع ضدین کی آماجگاہ ہیں افسوس کے ساتھ بہت سے عزیز اساتذہ سے جدا ہونا پڑا اور ساتھ ہی ساتھ ہمارے افسوس کی تلخی بعض شفیق اور فرض شناس اساتذہ کی آمد سے کم ہو گئی۔

سنسکرت کی ریڈری پر ڈاکٹر رابندر شرما ایم اے (الہ آباد) ڈی فل (میونچ) کا تقرر ہوا ہم انھیں مبارک باد دیتے ہیں۔

پروفیسر عبد القادر سروری کی خدمات ان کے اردو ادب کی اعلیٰ قابلیت اور علمی تبحر کی بنا پر جامعہ میسور نے حاصل کیں۔ ہمیں ان کی جدائی کا رنج ہے مگر کامیابی کی خوشی بھی۔

پروفیسر عزیز احمد بی۔ اے۔ آنرز آکسفورڈ کو سکرٹری ہر ہائینس پرنس آف برار کے عہدہ پر مامور کیا گیا ہمیں خوشی ہے کہ انکی جگہ پر ان ہی کے مانند ایک زندہ دل خلیق اور قابل پروفیسر سر مظہر علی ایم۔ اے۔ کا تقرر کیا گیا۔

جناب وہاج الدین صاحب شمیم ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی پرسنل مددگار نائب معین امیر جامعہ کا انفارمیشن آفیسر حکومت ہند کے عہدہ پر تقرر عمل میں آیا۔ آپ بہت ہی خلیق تھے۔ آپ نے انجمن اتحاد کی سرگرمیوں میں بہت ہی نمایاں حصہ لیا ہمیں آپ کی جدائی کا رنج ہے اور یقین ہے کہ صاحب موصوف دوری کی وجہ سے اس رشتہ اتحاد کو نہیں بھلا دیں گے جو اس مدت میں ہم سے قائم ہوا تھا۔

کانفرنسیں دسمبر کی چھٹیوں میں جامعہ کے اقامت خانہ سنسان ہو جایا کرتے تھے لیکن اس سال غیر معمولی طور پر آباد رہے لیکن بجائے طلبار کے ان میں مختلف جامعات کے اساتذہ اور علم مقیم رہے جو آل انڈیا ہسٹری کانفرنس اور اورنٹیل کانفرنس کے سلسلہ میں جامعہ کے مہمان تھے یہ نہایت ہی کامیاب کانفرنسیں ہوئیں ہمارے مہمان جامعہ کی عظیم الشان عمارتوں اور جذبہ مہمان نوازی سے بیحد متاثر

ہوئے۔ جناب ہارون خانصاحب شروانی صدر شعبۂ تاریخ جناب نظام الدین صاحب صدر شعبۂ فارسی اور وہ تمام طلبا جنھوں نے اس سلسلہ میں رضاکارانہ خدمات انجام دیں اس کامیابی پر قابل مبارکباد ہیں۔

کھیل اس سال سے کھیل کے میدانوں پر ۷۰ فیصد حاضری لازم قرار دی گئی۔ برادران جامعہ میدانوں پر نسبتاً زیادہ تعداد میں حاضر رہے۔ بین الکلیاتی اور بین الجامعاتی مقابلوں نے کھیل کے میدانوں کو دلچسپ بنا دیا۔ بعض مقابلے نہایت ہی ہمت افزا اور بلند معیار کے ہوئے! اور بعض ہمت شکن بھی جن کی تفصیل ہر کھیل کے محاذی درج ہے۔

کرکٹ صدر۔ پروفیسر حسین علی خان۔

کپتان۔ مسٹر سراج الدین۔

معتمد۔ مسٹر حسام الدین صدیقی۔

کرکٹ کلب کی خصوصیت رہی ہے کہ مشق بہت ہی پابندی کے ساتھ کی جاتی ہے اور ٹیم میں ان ہی لوگوں کو نمائندگی کا موقع دیا جاتا ہے جو پابندی سے مشق کرتے ہیں۔ اس سال ہماری ٹیم مختلف مقابلوں میں بہت ہی کامیاب رہی۔ مسٹر حسام الدین، مسٹر اصغر، مسٹر کاظم، مسٹر راجکمار، مسٹر شاہد اور مسٹر کفیل اچھے کھلاڑی ثابت ہوئے۔ مسٹر حسام نے اپنی اعلیٰ اور معیاری بیاٹنگ سے اکثر مواقع پر ٹیم کو ہارنے سے بچالیا۔ آپ کو صدر اعظم الیون، حیدرآبادالیون اور بالاخر حیدرآباد کی نمائندہ ٹیم میں موقع دیا گیا۔ اصغر بہت ہی ہونہار کھلاڑی ہیں۔ آپ سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ مسٹر کاظم اسی سال جامعہ میں آئے ہیں اور اعلیٰ درجہ کے بولر کی حیثیت سے ٹیم میں شریک کئے گئے ہیں۔ آپ کو بھی صدر اعظم الیون میں منتخب کیا گیا تھا۔ مسٹر کفیل نے اس سال تین مرتبہ ہیٹ ٹرک لین جو ان کے عمدہ بولر ہونے کا ثبوت ہے۔ مسٹر راجکمار نے اپنے اعلیٰ کھیل کی وجہ سے لڑکوں میں مقبولیت حاصل کی آپ کا شمار اعلیٰ کھلاڑیوں میں ہے۔ مسٹر شاہد نے بھی گذشتہ کی بہ نسبت اپنے کھیل کے معیار کو بہت بلند کیا۔ بہ حیثیت مجموعی کرکٹ ٹیم کا نظم و ضبط اور اُسکی کامیابیاں خصوصاً سالار جنگ ٹورنامنٹ میں بہت ہی ہمت افزا ہیں جس کے لئے ہم کپتان اور

معتمد کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

ٹینس

صدر۔ ڈاکٹر عبدالحق۔
معتمد۔ سید حسین رضوی۔

مسٹر رضوی کی انتھک کوششوں کی وجہ سے ممبران کلب کی تعداد میں اضافہ ہوا اور کھیل کا معیار بھی بلند ہوا۔ متعدد دوستانہ مقابلہ کھیلے گئے۔ میکنزی ٹورنامنٹ، مہدی جنگ ٹورنامنٹ اور قمرالدین میموریل ٹورنامنٹ میں جامعہ کے کھلاڑیوں نے نمایاں حصہ لیا۔ مسٹر قیصر نے حسب روایت پھر میکنزی ٹورنامنٹ میں سنگلز چمپین شپ حاصل کیا۔ صاحب موصوف کی شہرت خود ان کے اعلیٰ کھلاڑی ہونیکی ضامن ہے۔ آپ حیدرآباد کے ممتاز ترین نوعمر کھلاڑی ہیں۔ اور امید ہے کہ آپ کے توسط سے نہ صرف جامعہ عثمانیہ بلکہ حیدرآباد کو کل ہند ٹینس کے مقابلوں میں خاص امتیاز حاصل ہوگا۔

مسٹر حفیظ، مسٹر حامد محی الدین، مسٹر حبیب اللہ، مسٹر اشہد رضوی، مسٹر مقصود عبدالعلی، مسٹر رضوی اور ممتاز الدین نے مختلف مقابلوں میں جامعہ کی نمائندگی کی۔

کلب کے ٹورنامنٹ کامیابی کے ساتھ ختم ہوئے مسٹر مقصود اور ممتاز نے فائنل میں ایک دوسرے کو شکست دینے کی پوری کوشش کی مقابلہ دلچسپ رہا۔ ممتاز ان ہونہار کھلاڑیوں میں سے ہیں جن سے آئندہ ہمیں بہت سی توقعات وابستہ ہیں انھیں اس میدان میں آئے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا پھر بھی انھوں نے اپنی بے جگرانہ کوششوں سے اپنے کھیل کو جامعہ کے معیار پر لالیا۔ مقصود بھی ابھی کالج میں نئے نئے آئے ہیں ان سے بھی ہمیں آئندہ بیحد توقعات وابستہ ہیں بشرطیکہ اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ اور ترقی کے منازل جلد جلد طے کرتے جائیں مسٹر رضوی ٹینس کلب کی اس چہل پہل اور طلبار کی دلچسپی کے لئے قابل مبارکباد ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق صدر ٹینس کلب کی مشفقانہ توجہ نے لڑکوں کی ہمت افزائی فرمائی۔ ڈاکٹر موصوف ٹینس کے اچھے کھلاڑی ہونے کےعلاوہ بہت ہی خوش اخلاق ہیں۔ تمام سال آپ نے لڑکوں کو ترقی کے زینہ طے کرنیکا درس دیا۔ اور انکی ہمت افزائی میں کسی طرح کا بخل نہ کیا ہم ڈاکٹر صاحب کے

کو بھی کلب کی کامیابیوں اور اچھے نظم وضبط کے برقرار رکھنے پر ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آئندہ بھی یہی طرز عمل برقرار رکھا جائے گا۔

ہاکی

صدر ۔ مسٹر برکت اللہ

کپتان ۔ مرزا سیف علی بیگ۔

معتمد ۔ اوصاف علی عباسی۔

اس سال گزشتہ سالوں سے زیادہ دوستانہ مقابلے ہوے، اہم ترین مقابلے وہ تھے جو بین الجامعاتی ہاکی ٹورنامنٹ کے سلسلہ میں جامعہ کے میدان پر منعقد کئے گئے تھے، انتظامی سہولت کے علاوہ اس موقع پر اساتذہ اور طلباء کو مدعو کیا گیا تھا۔ہماری ٹیم نے جامعہ آندھرا کی ٹیم کو آسانی سے شکست دی، دوسرا مقابلہ جامعہ ناگپور کی ٹیم سے تھا۔ اور شروع سے آخر تک دلچسپ رہا۔ مسٹر مسرت حسین مسٹر ایوب اور اقبال احمد ہاشمی نے اپنے اعلی معیاری کھیل کا مظاہرہ کیا اور متعدد مرتبہ ٹیم کو شکست سے بچا لیا۔ اور سنٹرل زون کا فائنل جیت لیا۔اس کامیابی کا سہرا ہمارے نوجوان کھلاڑیوں کے سرہے۔ ہم کپتان اور معتمد صاحب کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

اسپورٹس

صدر ۔ مسٹر ثناء اللہ خان

معتمد ۔ سید ایوب احمد کرمانی

اسپورٹس کی ٹیم نے اس سال انٹر کالج ٹورنامنٹ میں معرکۃ الآرا کامیابی حاصل کی کپتان کلب مسٹر ایوب جامعہ کے ممتاز ترین کھلاڑیوں میں سے ہیں جنھیں جامعہ میں شرکت کے پہلے ہی سال دو کھیلوں۔ ہاکی اور اسپورٹس میں کلر دیا گیا۔کوئی دوڑ یا مقابلہ ایسا نہ تھا جس میں جامعہ کے نمائندوں نے امتیاز حاصل نہ کیا ہو چھوٹے فاصلہ کی دوڑ دں میں بدرالدین صاحب قادری اول آئے اور لانبی دوڑوں میں ایوب احمد کرمانی ۔جامعہ کی ٹیم نے جو نمبرات حاصل کئے وہ پچھلے تمام نمبرات سے زائد تھے۔ہمارے نئے چانسلر جامعہ نے بہ نفس نفیس انعامات تقسیم فرمائے۔اس کامیابی پر ہم ایوب احمد کو مبارکباد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ آئندہ اسی کو برقرار رکھا جائیگا۔

والی بال و باسکٹ بال

صدر۔ شریف حسین صاحب۔
کپتان والی بال۔ مسٹر اظہر الدین۔
کپتان باسکٹ بال۔ مسٹر وینکٹیش۔

مسٹر شریف حسین اور متعلقہ کپتانوں کی کوشش کے باعث ان کھیلوں کا معیار بہت بلند ہوا حیدر آباد کے متعدد مقابلوں میں جامعہ کی ٹیم نے کامیابی حاصل کی ہم ان حضرات کو دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

اب تک کھیلوں میں جامعہ کی کامیابی کا ذکر کیا گیا ہے لیکن آخر میں ہم افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں کہ ہماری ہاکی، فٹ بال اور کرکٹ کی ٹیمیں جو حیدر آباد میں اس قدر ممتاز کامیابیاں حاصل کر چکی تھیں وہ جب باہر گئیں تو ناکام رہیں اسکی وجہ یہ نہیں کہ جامعہ کا معیار کھیل گرا ہوا ہے بلکہ ہمارے کھلاڑیوں کی عدم توجہ اور خود اعتمادی کا فقدان ہے ہم ان تمام وسائل اور آسانیوں سے کما حقہٗ فائدہ نہیں اٹھاتے جو ہمیں جامعہ میں حاصل ہیں۔ کھلاڑیوں کی ہمت افزائی کی بھی ضرورت ہے۔ اچھے کھلاڑیوں کی وجہ سے کھیل کا شوق بھی تعلیم کے ساتھ ساتھ طلباء میں ترقی پاتا جا رہا ہے۔

ان کھلاڑیوں کو کلر کے علاوہ تعلیمی رعاتیں بھی ملنی چاہئیں کیونکہ وہ کھیل میں عام طلباء سے زیادہ وقت صرف کر کے دلچسپی لیتے ہیں جسکی وجہ سے ان کے اخراجات میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ ارباب جامعہ سے ہماری گزارش ہے کہ اس خصوص میں توجہ فرمائیں۔ کھلاڑیوں کی ہمت افزائی ہر جامعہ کا فرض ہے۔ اس سے مطلب نہیں کہ ہماری جامعہ میں ہمت افزائی نہیں کی جاتی بلکہ مقصد یہ ہے کہ رعاتیوں میں اور اضافہ کیا جائے۔ مجلہ کے صفحات پر شاذ و نادر ہی کہیں کھیل کا ذکر آتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ممتاز کھلاڑیوں کی تصاویر کو اس میں جگہ دی جائے اور چند صفحات صرف اسپورٹس کی کہانی کے لئے مختص کر دے جائیں جیسا کہ دوسری جامعات میں ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ امید ہے کہ ہمارے کھلاڑی جامعی مفاد کو باہمی اختلافات پر ترجیح دیں گے ٹیم اسپرٹ اعلیٰ نظم و ضبط اور خود اعتمادی ہی ٹیموں کو کامیاب بناتی ہے۔ اس کا لحاظ رکھا جانا ضروری ہے۔

سید محمد اشہد خان رضوی۔ بی۔ اے عثمانیہ

Sports:—

For the first time in our University life our Foot-ball team joined the "Inter-Universities Tournament" in Calcutta. Though the result was unfavourable, ours was acknowledged an excellent team of the Central-Zone. The team defeated the Medical College in the "Inter-College tournament." Our cricket team took part in the Salar Jung Cricket Tournament and defeated the Nizam College team finals. It also joined "All-India tournament," held in Bombay. Mr. Hisamuddin our champion player represented the University in the Hyderabad team against Secunderabad, and in H.E. the Chancellor's team against the Resident's.

Our Tennis team also joined the "Inter-University tournament" and won the Central-Zone. It also represented our University in the Mackenzie and Mehdi Jung tournaments, and Mr. Kaisar our popular player secured "Singles Championship" in the latter.

We congratulate all the Captains, Secretaries and players, and commend their exertions in keeping up the standard of the University games.

Senior Proctor:—

The Proctorial Staff has been reorganized, and Professor Ziauddin Ansari, M.A. (Osman), B.Sc., Honours (Manchester), of the Engineering College, is appointed senior-Proctor vice Professor Abdul Majeed Siddiqi. We look forward to a successful year under him.

First-Aid:—

Dr. Kasim Ali of the University hospital conducted the first aid classes for the training of students and the staff.

MIR HAMID ALI, B. Sc. (Osman),
Asst. Editor.

Debating Competitions:—

Mr. Abdul Haq, Mohiuddin, B. K. Narayan, and Rahimuddin were sent to Aligarh to represent our University in the All-India-Debating-Competition," unfortunately the debate was postponed.

Mr. B. K. Narayan and Mr. Shstri represented Osmania University in the "Mysore University Debate," and stood third. Our students took part in "Jashani Miladunnabi" Secundrabad, and "Salar Jung Urdu Debate Compititions."

We heartily congratulate our speakers.

Sectional Unions:—

THEOLOGY: A meeting was held under Nawab Nazir Yar Jung's presidentship Mr. Abdur Rahman, the President, delivered his presidential address. Certain important resolutions were passed concerning the introduction of theology faculties in the Women's College and Intermediate Colleges.

PHYSICS UNION: This body and Chemistry Union are the relics of the "Science Union," which exists no more to the dissatisfaction of the Science Students.

Educational tours were made to "Power-House" and Glass-Factory" under Union's supervision. Some lectures were arranged which were attended by a large numder of students.

CHMISTRY UNION: A tour was arranged to the "Drainage-Disposal Work," Amberpeth under the Union's guidance.

In the annual meeting held under the presidentship of our Pro-Vice-Chancellor scientific essays were read and the meeting ended with a photograph and At Home. We congratulate the officials of the Unions.

We heartly welcome both the newly appointed members of the staff.

Transfers:—

The services of Mr. Aziz Ahmed B.A. (Osman.), B.A. (Honours) (Lond.) Lecturer, English Department, have been lent as the Private Secretary to Her Highness Princess of Berar.

The services of Mr. Wahajuddin Ahmed, M.A., B.T., Personal Assistant to Pro-Vice-Chancellor have been lent as the Information Officer to the Government of India.

We congratulate them heartily and hope their separation from academic life will only be for a short time.

Mr. Akber Ali, M.A. (Osman), Lecturer Mathematics (Gulbarga College) who had proceeded on study-leave, returned to India after obtaining B. Sc., Honours (London), and Ph. d. (London), in Astronomy. He has also obtained practical training in Obsevatory work at Cambridge.

We offer him our sincere congratulations and hope his services will prove beneficial to our Alma Mater and the country.

Union:

The current year has been rather unfortunate as there is absence of traditional jollity among its members. The College Day was not celebrated as a mark of mourning on the deathof our " Mader-A-Deccan," and the money sanctioned for it is to added the "College loan-fund."

COLLEGE NEWS.

Let us at the very outset offer our heart-felt congratulations to Hon'ble Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur, and Dr. Raziuddin Siddiqi, for having received the honorary degrees of D. Litt. and D. Sc. respectively.

The membership of our university on the Inter-University Board, has been extended for a further period of three years, and Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur is representing our university. Professor Haroon Khan Sherwani has been elected the Secretary of the Board.

The news that the B.E. degree of our university has been recognized by the Institute of Engineers, India, is gratifying to all the well-wishers of the university. The last term of the year has been very important in the intellectual and educational history of Hyderabad. For the sessions of the All-India Oriental Conference, and the Indian-History Congress and the Numisnatic Conferences were held here under the auspices of our university.

LL. B. The Senate has decided that the degree of LL. B. be instituted in the Law faculty. The decision is welcomed as it is aimed at the extension of the faculty.

Appointment :—

Mr. Muzhar Ali Khan B.A. (Osman.) B.A. (Honours) (Cantab), has been appointed Lecturer in the English Department vice Mr. Aziz Ahmed. Dr. Aryendra Sharma M.A. (Allah), D. phil (Munich) is appointed Reader in Sanskrit.

Tagore had high ideals about womanhood. He believed that domestic life is not the only life for woman. To him, woman is not an object to be worshipped, nor yet the object to be brushed aside out of common pity. The human world is Women's world, and woman has the power to bring peace and happiness into the abode of Man.

It is said of Homer that he made the glory that was ancient Greece. Rabindranath Tagore will go down to posterity as the maker of the glory that will be India-an India greater than herself with all her variegated past and greater than any other home of civilization, past or present.

M. SRINIVASAN,
B. Sc. (Final).

love for the sons of the soil was deep and sincere. He expresses his feelings thus:—"There came a time when perforce I had to snatch myself away from the mere appreciation of literature. As I emerged into the stark light of facts the sight of dire poverty of Indian masses rent my heart. Rudely shaken of my dreams, I began to realise that perhaps in no other modern state was there such hopeless dearth of the most elementary needs of existence. And yet it was this country whose resources have fed the wealth and [magnificence of the British people. While lost in the contemplation of the great civilization, I could not imagine that the great ideal of humanity would end in such ruthless travesty. But one day the glaring example of it stared in my face on the utter neglect and contemptuous indifference of a so called civilized race to the well-being of crores of Indian people."

This does not mean that Tagore hated the West out and out. Far from it; he respected the West for its spirit of inquiry, its science, its strength and will to face martyrdom in the cause of freedom and justice; and he wished the East to take what it could and should from the West-not like beggars without patrimony or as adopted child, but as a healthy man may take wholesome food from all quarters, and assimilate it.

Tagore was of every land, and every land was Tagore's. He believed in the realization of unity of the various cultures of the world. He did not admit difference to be conflict nor did he espy an enemy in every stranger. The present day nationalism of the West he considered to be detrimental to humanity. He believed in the ultimate unity of Man.

was born in the human world, but is banished into the world of living gramophones, to expiate for the original sin of being born in ignorance. Child's nature protests against such calamity with all its power of sufferiug subdued at last into silence by punishment."

To regulate these defects Tagore founded the now famous Visva-Bharati. He formulated for this university a three-fold programme:—

To concentrate in Santi-nikethan the different cultures of the East, especially those that originated in India or found shelter in her house.

To lay in Srinikethan the foundation of a happy contented and humane life in villages.

To seek, to realize in a common fellow-ship of study the meeting of East and West, and thus ultimately to strengthen the communication of ideas between the two hemispheres through the Visva-Barathi.

Thus Tagore provided a centre of culture in the East, where research into and study of religion, history, science, and arts of Hindu, Buddhist, Jain, Islamic, Sikh, Christian and other civilization may be pursued along with the cultures of the West with that simplicity in externals which is necessary for the spiritual understanding between thinkers and scholars of both Eastern and Western countries from all antagonism of race, nationality, creed or caste, and in the name of the One Supreme Being who is Shantham, Shivam, and Advaitam.

Tagore was concerned more with the moulding of of society and character-building than mere blurting from the already crowded modern platform of politics. His conception of freedom was full and fundamental. His

Tagore that it was the source of the human voice; he there-by tried to evoke the admiration of the great seer. Far from being pleased, the poet felt a great shock of repulsion, and the rejected that information with an intense disgust. He did not want to admire the skill of the workman, but rather to revel in the joy of the artist who concealed the machinery and revealed his creation in its ineffable unity.

"God does not care to keep exposed the record of His power written in geological inscription, but He is proudly glad of the expression of beauty which He spreads on the green grass, in the flowers, in the play of colours on the clouds, in the murmuring music of running water." That is Tagore's Religion, as also the Religion of the poet.

Tagore was decidedly of opinion that the stupendous mass of suffering under which India is being crushed has its foundation in the want of education; the conflict between castes and creed our indolence and apathy in action, our want of resources, all these spring from want of education—not the education of modern times that turns out clerks and not practical mėn: but an education which besides giving information, will keep life in harmony with all existence. "The present day education," says Tagore, "imparts knowledge in such a manner that our life is weaned away from nature, and our mind and the world are set in opposition from the beginning of our days. Thus the greatest education for which we came prepared is neglected, and we are made to lose our world to find a bagful of information instead. We rob the child of the earth to teach him geography, of language to teach him grammar. His hunger is for the Epic, but he is supplied with chronicles of facts and dates. He

Even post-cards written by him form part of literature. Insight and imagination were his magic wands by whose power he roamed where he willed and took his readers too along with him thither. He added the charm of thought and imagination which goes far to capture the sentiments of the Invisible and the Un-Knowable.

Rabindranath Tagore was a musician too. He composed many songs which have defied the canons of respectable orthodoxy. His patriotic songs are characteristic. "They are refined and restrained and free from bluff, bluster, and boasting. Some of them twine their tendrils round the tenderest chords of our heart, some enthrone the mother-land as the Adorned in the shrine of our souls, some sound as a clarion call to our drooping spirits filling us with hope and the will to do and dare and suffer, some call on us to have lofty courage to be in the minority of one; but in none are heard the clashing of interests, the warring passions or races or the echoes of old unhappy far off strifes and conflicts."

Tagore had been blessed with that sense of wonder which gives a child his right of entry into the treasure-house of mystery which is in the heart of existence. He neglected his studies in his younger days because they rudely summoned him away from the world around him, which was his friend and companion; when he was thirteen he freed himself from the clutches of an educational system that tried to keep him imprisoned within the stone walls of lessons.

This perhaps explains to us the meaning of Tagore's Religion. This world was living to him, intimately close to his life. Once, a medical student brought to him a piece of human wind-pipe, and tried to convince

Since then Tagore gained a reputation both in his country and abroad. To-day his name is greeted with enthusiasm, wonder and reverence in almost every part of the civilized world, and pictures of him are hung in thousands of houses. In most of the great cities of both the hemispheres surging crowds had been held spell-bound by the melody of his voice, even though they did did not understand the language of his addresses or recitations; large numbers have been fascinated by his personality which recalled to their minds the Vision of a prophet of Judea or of a seer of ancient India. No poet, ancient or modern had been received during his life time with the honour and respect with which Tagore had been greeted, whether in the West or in the East, and there is scarcely any cultivated language into which some, at least, of his works have not been translated.

For Tagore was a writer of the highest order. There is hardly any department of literature that he has not touched and adorned, elevated and filled with inspiration and lighted by the luster of his genius. He began writing very early in his life-how early nobody can say. He translated Shakspeare's Macbeth into Bengali when he was not even nine years of age. He has tried all phases of literature-couplets, stanzas, short stories, short poems, longer pieces, fables, novels, and prose romance, dramas, comedies, tragedies, songs and operas, kirtans and palas and last but not least, lyrics. His essays are illuminating, his sarcasm biting, his satires piercing. All kinds of subjects he dealt with in his writings. He was perhaps the greatest literary critic in Bengali. As a writer of letters he was unrivalled in Bengali, for the number, volume, variety and excellence of his epistles.

belong to the life-less. He lifted the dead weight of ponderous forms of Bengali and with a touch of his magic wand aroused Bengali literature from its age-long sleep.

There was yet another movement started about this time in Bengal, which was called National. It was not fully political, but it began to give voice to the mind of the people of India, trying to assert their personality. It was a voice of indignation at the humiliation constantly heaped upon them by the people who were not oriental, and who had especially at that time the habit of sharply dividing the human world into the good and the bad according to what was similar to their life and what was different.

Tagore was brought up in an atmosphere of the confluence of these three movements, all of them revolutionary. He was born in a family which had to live its own life. This led Tagore from his young days to seek guidance from his own self-expression in his own inner standard of judgment.

Most of the members of Tagore's family had some gift—some were artists, some were poets, some musicians and the whole atmosphere of his home was permeated with the spirit of creation. He had a deep sense almost from infancy, of the beauty of nature, an intimate feeling of companion-ship with the trees and the clouds and felt in tune with the musical touch of the seasons in the air. At the same time he had a peculiar susceptibility to human kindness. All these craved for expression, and naturally he wanted to give them his own expression. The very earnestness of his emotions yearned to be true to themselves, though he was too immature to give their expression any perfection of form.

Tagore for his profound, noble, fresh and beautiful poetry which in its English rendering has happily secured him an honourable place in Western literature."

The ceremony closed with the chanting of the beautiful hymn in praise of Sweden, "Du Gamala, du frie..............."

For the first time in the history of man, the West recognised the genius of the East, officially.

Rabindranath Tagore was born in 1861. Just about the time he was born the currents of three movements had met in the life of Bengal.

One of these movements was introduced by a very great-hearted man of gigantic intellect, Raja Rammohan Roy. It was revolutionary, for he tried to re-open the channels of spiritual life which had been obstructed for many years by the sands and debris of creeds that were formal and materialistic fixed in external practices lacking spiritual significance.

Tagore's father was one of the great leaders of that movement, a movement for whose sake, he suffered ostracism and braved social indignities. Tagore was born thus in the atmosphere of the advent of new ideals.

There was a second movement equally important. Bankim Chandra Chatterjee was the first pioneer in the literary revolution which happened in Bengal about that time. Literature had allowed its creative life to vanish. It lacked movement and was fettered by a rhetoric rigid as death. Bankim Chandra Chatterjee was brave enough to go against the orthodoxy which believed in the security of tomb-stones and in the perfection which can only

RABINDRANATH TAGORE,

THE MAN.

10th December 1913, was a memorable day indeed. On this day the great Hall of the Royal Musical Academy Stockholm, was adorned with a wealth of flowers; the hall itself was filled with the members of the Swedish cabinet, the ministers of foreign countries, the members of the diplomatic corps, the members of the Swedish Riksdag, principal executive functionaries of the Swedish government and the metropolis, representatives of the colleges and of scientific and artistic societies, a great number of ladies of society and a number of Nobel prize winners.

The arrival of the king of Sweden with the members of the royal family followed by their suites, was greeted with the strains of the Swedish national anthem. There upon the deligates of those bodies which were entrusted, according to Nobel's testament, with awarding the prizes, proceeded to fulfil their offices. The royal orchestra played a stirring music ; at the end of it the trustees rose and called out the name of Rabindranath Tagore. Tagore with his oriental robes, refined and well-chiselled lineaments, his silver locks, flowing beard and his mystic appearance, rose and moved with serenity towards the dais, and bowed to the king with a becoming dignity. The king with a dignity of his own, handed to the poet laureate of Asia, diplomas and gold Nobel medellions, while the trustees announced, "the Nobel prize for literature for the year, 1913, is awarded to Rabindranath
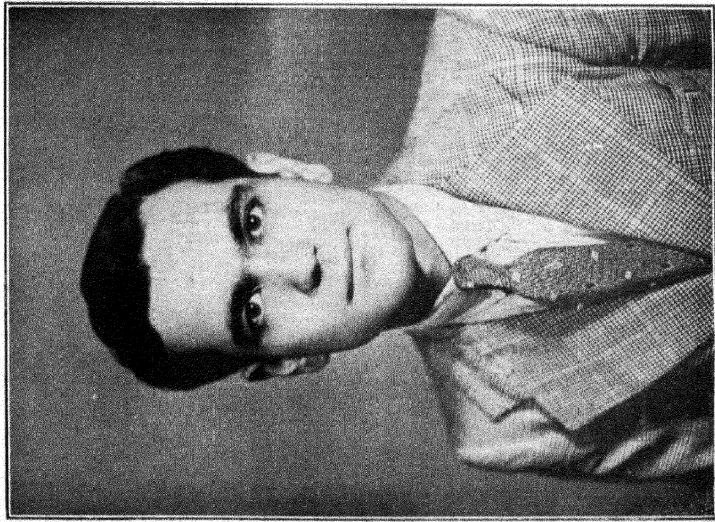
Mr. RIASAT ALI MIRZA,
B. A., (Osman.)

Ex-Cricket Captain, under whom we won Inter College Tournament after five years, Is one of the best all rounders in Hyderabad. At University he out-shone his contemporaries.
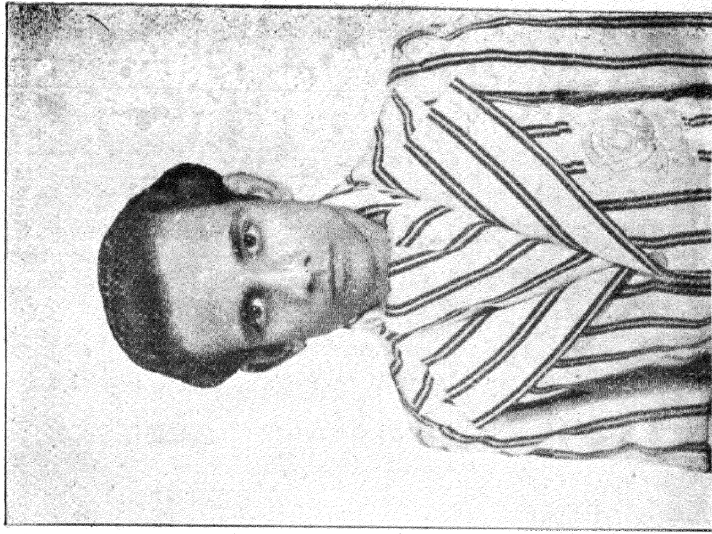
Mr. SYED HISAMUDDIN,
Our Cricket Captain.

defects. What were the consequences? Those highly patriotic reformers always met with illiteracy and their schemes were not fully worked out by us. The services of Raja Ram Mohan Roy, Harbilas Sarda, and Sir Syed Ahmed Khan imparted to nation unforgettable lessons. It was the low standard of education which brought failure to every scheme. The lack of education did not give them any chance to shine in their life time as,

"Full many a gem of purest ray serene."

Let us wind up the essay by saying that it is of utmost importance that social reform societies imbued with a strong sense of religious tolerance, should be spread all over India with a view to teaching the people how to get rid of these evils and to replace them with the better ideals that would make the lot of the common men better, happier and more dignified.

The social problem is indissolubly connected with political. Let social and political reforms go hand in hand. Here lies the secret of India's salvation.

SYED ALI MOHOMAD MOOSAVI,
M. A. (Final),
Managing Editor & Editor English Section.

such an innocent creature. When she grows up few will come to ask for her hand in marriage. Nor is this all! We abhor the girl! Let us bury our traditions in,

"The dark unfathomed caves of the ocean."

It is the duty of every parent to see that his children are suitably married. It is possible as is described by some authors that in ancient India there were practically no un-married women of marriageable age in the whole of India, but there were always plenty of widows who were prohibited to get re-married. Behind the idea of Hindu marriage, was the conception that union between man and women is life-long and is indissoluble except by death alone. There is therefore no divorce system among the Hindus. We are personally of opinion that this is unjust. When a privilege of re-marriage is enjoyed by women of every nationality all over the world, why not the same privilege or facility for a Hindu woman?

Thanks to the western civilization that has brought in its wake a glorious as well as a gloomy picture. The glorious side is hardly ever noticed; the gloomy side is made much of by Indians at large irrespective of caste or creed. The constant visits to cinemas, smoking, indulging in intoxicated liquors, taking keen interest in dance and earnest desire to copy the west in dress are ruinous adaptations which are proverbially injurious to us. Hatred of purda system and anxiety to introduce co-education are other two indefatigable fashions which are purely a western gift.

All the above mentioned evils are the direct results of illiteracy. We are not at all capable to keep pace with the reforms infused in our society by our predecessors in the absence of education. Sincere efforts were made time after time to do away with the well established

services, the awkward customs of the day before the marriage and the condemnable superstitions of the sex are to be entirely given up.

The same remark applies in the case of funeral rites and ceremonies, which are so costly an affair for the poor and the middle class in India. Death, in India, not only takes away a human soul and inflicts irreparable loss, but with it a lot of money is wasted on the ceremonies, after death. It is unwise and a negation of our broad mindedness.

Another reprehensible thing, so commonly found in Indian Society is the practice of child marriages. These marriages are confined only to the Hindu community. It is not necessary here to deal with the pernicious consequences of child marriages. This much can be said here that soon after maturity perpetual family quarrels set in and the charm of domestic life is taken away; the Household Gods will no more dwell to shower peace and prosperity. Husbands turn to "other fields and pastures new," bringing back with them the fruits and their sinful deeds. Then in some frivolous mood they inject their wives with the germs of the contracted diseases which in some cases are curable and in some not curable at all! At times they direct them to the grave. If sufficient amount of money is possessed, the cure is possible, otherwise they will be in the cruel hands of death.

It happens sometimes that a girl of six months enjoying the sweet swings of the craddle, falls a prey to widowhood. After two or three years she is able to play with other children. But, alas, children are warned by their parents not to move about in the company of such a girl. It is dreadful even to imagine the future of

Lack of education is the third cause of our social disorder which has proved so detrimental as a whole. India is a vast country the population of which is, as stated by the government, more than forty crores. And if it is noticed that twelve percent of the population is educated, and the metropolis and the moffusils in India are poles asunder educationally, it will, indeed, shock many sympathisers and well wishers. Is it not a disgrace on the pārt of the capitalists to sit complacently and watch the poor Indians slowly sinking in to the abyss of perpetual poverty? This is, of course, an undeniable truth that the responsibility for such a low percentage rests upon the shoulders of the government. This is only half truth, as the capitalists and well to do people have an equal share in the blame. Are the capitalists not expected to do their bit and spend some part of their hoarded wealth, and take keen interest in the management of running private schools and colleges? If they part with a fraction of their wealth, glorious and splendid achievements will be fruits of such humanitarian efforts.

We have so far enumerated the main reasons of our social evils; their off-springs, likewise, demand our attention.

It is neither possible nor essential to go into details of social evils in such a short article as this. Let us briefly discuss a few salient features of the secondary evils of our social structure.

To begin with, let us first take the problem of marriage ceremonies and its attendant evils. Because of them we have become the laughing stock in the eyes of the civilized nations of the world. They in themselves are excusable to some extent, but the spending of prodigious sums of money in arrangements of matrimonial

SOCIAL EVILS IN INDIA.

It is admitted on all hands that evil begets nothing but a number of evils. Therefore a person or groups of persons that like to remove social ills from our Indian life shall have to devise means of striking at the root of the sources or causes of the evils.

The first cause, which, in our point of view is responsible for our defective social structure is that which has bred the so-called time honoured customs and traditions of the law of our birth. To part with them seems so blasphemous; and there are still many of us who cling to them, hold fast to them and to get away from them, is not an easy job. They might be true or might have been true. But they have to be replaced by newer ideas, " Lest one good custom should corrupt the world."

The aspirants of social reconstruction tried more than once to wipe out the evils once for all from society. Some succeeded partially while others failed miserably. But despite the failures and frustrations which are inevitable in the beginning, this work was carried on heriocally, rendering people commendable services the rememberance of which is still fresh in our memories.

Our religious fanaticism constitutes the second cause. India has been the cradle of religions, they say; and its boundaries have ever offered a hearty welcome to different castes or communities. In view of this, we have to take into consideration the status of religions spread all over India. Hindus, Muslims, Parsis and, not to swell the list, even the Europeans are seen indulging in religious fanaticism which should be discouraged and condemned out right.

curtains of the Purdah as in some parts of our country, but in the metaphorical sense of the word. The place which is theirs is behind the curtains, Angels in houses, women became furies in public. Hence their right places is the social environment whence alone they can radiate their beneficent influence over men.

MISS K. ISMILE,
Second Year Science.

Today, however, the part played by women in matters political is very great indeed. This was due to the immense impetus which women as a class got from the Suffragist movement which immediately preceded the war of 1914. Most of the women to-day are responsible political thinkers and workers and their influence on the country as a whole is good. Ruskin tells us how Shakespeare, for instances, makes his heroines more sensible creatures than his heroes. It is surprising how in each of his plays, as we come to ponder over them, it is the man who commits the mistake which the woman comes to correct. And so we may say, that woman as mother and wife is the best adviser, the best soother of excited nerves of man. Wordsworth had sung long ago, how woman was always 'to warn, to comfort and, command.' She was a spirit, yet a woman too. Such, in fact, was the picture which the English people presented to themselves of women in the post-war decade.

In a word, although it is a dangerous field for women, this one of politics, yet if intelligently utilised women can be, as they have been in the past, powers for good. The difficulty of politics is that women must not take part in what is called practical politics. That is to say, their influence for good is to be found in the indirect manner they treat their men in the daily life. It is in the soothing and saving of men that women's real influence for good is felt in politics. The danger is when women enter practical politics because that field calls for powers for which women are by nature unfit. As events have shown women can be great directive, influencing factors in men's political life by being, in the current phrase, behind the curtains. Not, of course, the

women-novelists of the Victorian period, is really typical of woman's ability to compete with her partner in all fields of human activity. Intellectually as well as emotionally, women are no whit inferior to men. It was a foolish attempt of the superstitions and orthodox to restrict woman's sphere to the kitchen and make of her a golden-haired doll' to be petted and soothed and worshipped as an idol in the last century. Perhaps there is a natural inequality in women. If so, there is a natural in equality, in men in some provinces of human activity. It is found in the natural division of labour which humanity has adopted for itself for the purposes of civilization. Men must work and women must cook this is the natural division of labour which civilization imposes upon us all. But when women are treated as if they were slaves, and naturally inferior to men, then comes the trouble. For there is no such innate difference between the powers of men and women.

A brief glance over the political history of England will clear this position for us. We are told that in Pitt's time women exercised great influence in politics. Lady Bessborough and Mrs. Norton were two such figures in the political arena of their time. It was in a particular manner that women exercised their influence in politics. This was done by the confidence which women like these enjoyed in the lives of the male politicians. Questions of the English people are determined, not in the Houses of Parliament, but in the social gatherings and dinner parties of English social life. And they are even decided in the drawing-rooms of these politicians. The wives of politicians exercise a considerable influence upon the politics of their husbands. George Meredith has dramatised such an influence of women on politics in his novel entitled 'Diana of the Crossways.'

WOMEN AND POLITICS.

It would be strange to reflect that women have played some of the most influential roles as politicians in the history of our race. Down through the great centuries of human civilization women have from time to time come out of their restricted environment and shaped the course of history both for good and ill. History does not lack examples where queens have ruled and raised mighty kingdoms and empires. Legendary figures of Cleopatra and Sappho apart, sober history records the achievements of queens in the West and East alike who have illuminated the periods with their striking acts and thoughts. A mere mention of names is inspiring enough and illustrative of their roles. Elizabeth, Anne, Victoria are mighty names among queens. Ahalyabai, Lakshmibai and Nurjehan are equally inspiring. In recent years, too, and in less royal fashion, women have played thundering roles in practical politics. Who can read the autobiography of Pandit Jawaharlal, for instances, and not be inspired by those brave souls of wives and mothers who, regardless of selfish sentiments and domestic ties cheerfully welcomed the prisons of their country and thus served our fight for freedom in a remarkable manner? Their names are great and various. And their service is equally valuable in the field of politics as much as in the house. In England, in particular, the women's movement for equality of status with men, took a far reaching importance of its own. Mrs. Pankhurst is among the foremost names that has added to the prestige and power of women as a whole. The instance of George Eliot the greatest of

Turkey existed no more; and for the time being it seemed that all the Moslem powers disappeared with her from the political geography of the world. The loss of independence and the most disgraceful subservience created a deep reaction in the national conscience. Persons like Mustafa Kamal and his staunch adherents like Ismat Pasha symbolized this change.

QAZI AHMED KABIERUDDIN,
B. A. (Osmania).

The treaty of Bucharest in 1812 forced the Turks to make some further concessions in favour of Russia, it being stipulated that Pruth should be the frontier of the two Empires. In 1821 the war of Greek independence broke out; and in 1822 Russia crossing the Balkans took Adrianople. Hence, Austria, Russia and Great Britian began to intervene, openly and actively, in the Ottoman politics.

These conditions made the internal position of the Empire still worse; a period of political disintegration set in. As a reaction to these corruptions the Party of Young Turks came to power and began to contemplate several ways in which the modern Turkey was to develop. Thanks to their efforts brief but brilliant improvements were made both in administration and politics. But "the sick man of Europe" could not be rejuvenated. Sultan Abdul Hamid Khan renounced all the schemes of constitutional developments and took no pains to achieve the harmonious blending of the Eastern traditions with the western technique and progressiveness. He directed all his efforts towards the propagation of Pan-Islamism. It was just for this purpose that he tried to seek the help of Jamaluddin Afghani. But he did not satisfy the selfish interests of the Sultan. Thus the Sultan gave up all the schemes of social and economic amelioration of his subjects.

The year of 1912 found Turkey at its lowest ebb. The sick man of Europe was now dying. The Tripolitan and Balkan wars seemed to be the 'coup de grace' for her. Then the Great war followed which dragged Turkey into its flames and she was forced to accept the Treaty which deprived her of her independence. Independent

destroying the internal security of the East. Besides, the growth of nationalism and the development of the new economy added to the worries of the Ottomans. On the other hand the Turks, and as a matter of fact all the Moslems of the Near East, had lost all sense of commerce and industry with the loss of trade routes and trade. When the European industries were finding large markets in their Empire, the Ottomans were not able to turn the new conditions of exchange and trade balance to their favour. They did not try to face the economic revolution of Europe by encouraging scientific methods of production in their own country. They thought that Pan-Islamic would be greatly instrumental in the attainment of their political ends.

An a result of these circumstances the last decades of the 17th and the beginning of 18th century mark the period of gradual decline in the Ottoman power. The battle of Lepanto, in 1571, was the first Ottoman reverse at sea; and the battle of St. Gothard in 1664 was the first great reverse on land. The Turks were again defeated at Zenta in 1697 by the Austrians under Prince Eugene. Two years later the peace of Carlowitz was concluded according to which Turkey agreed to renounce her hold upon Transylvania, to restore Ukrain to Poland and to cede Azov to Russia. The wars between 1736 and 1744 resulted in the political superiority of Russia; and in 1784 Turkey was forced to renounce all sovereignty over Crimea. The treaty of Jassy in 1792 closed the war of 1787-1791. After the French Revolution the Empire at first had to combat the Napoleonic dangers and later it had to oppose the Russians who demanded more distinct protectorate over the Christian subjects of the Empire.

back of the Ottoman Empire. The front attack having failed, the East must be stabbed in the back to make its protector, the Ottoman Empire, helpless. Thus the whole key position of the Eastern politics came into the hands of the Europeans. The Ottoman Empire, being crippled, was subjected to the series of military and naval engagements by the European powers. It was at the same time exposed to the diplomatic warfare that was being waged against her. Russia had to prescribe medicine for the sick man of Europe; while Great Britain could not help expressing her sympathies with the Ottomans when the English men like Col. Lawrence were trying their best to encourage centrifugal elements in her politics. Burhan Belge in his article on Turkey tried to attribute the collapse of the Ottoman Empire to the failure of basic principles and their deterioration on which the whole Ottoman politics worked. He argues that the Ottomans tried to follow the policy of compromise. He says "The Ottoman Empire inherited from Seljuks a lead in the Islamic world, from Byzantine it inherited all Christian territories, which belonged to it, together with the secular strife between the two Roman Empires. Thus Christians and Moslems had to live together as the subjects of the same Empire. The new Empire extended and intensified these inherited policies; it aimed at the union of Moslems on the one hand and on the other the protection of the Orthodox Christians and the conquest at the expense of Catholic countries." Thus, according to him, the State had to become in many ways a compromise. But the failure of the dual policy cannot be the only reason for the collapse of the Empire. In reality the naval reverses of the Ottomans resulted in the change of the actual theatre of diplomatic wars

supremacy of Europe. The Muslims who had been up to this time the masters of sea trade, on the contrary found themselves suddenly ousted from the new as well as the old markets. The Ottomans were alive to all the repercussions of this change that were likely to influence the destiny of the East. They wanted to clear away the Eastern coasts from these Western adventurers by sending their fleet twice in those waters. It was the time when the Portuguese had been successful in driving away the Arab traders from the Indian coasts and in establishing a firm control on the seas. Gradually these European adventurers acquired so strong a footing in these regions that it was quite impossible for the Ottoman fleet to drive them away especially because they had no effectual and timely help from the local powers. Meanwhile, the Turkish fleet suffered a great reverse in the battle of Lepanto, which was a fatal blow to the Ottoman navy, rendering it almost powerless for any further engagement in those waters. Nawab Ali Verdi Khan the prince of Bengal, explaining his powerlessness to counteract the English machinations observed "It is not difficult to extinguish fire on land, but should the seas be inflamed who can put them out." This illustrates the naval helplessness of the East that was experienced after the battle of Lepanto. Although it is fact that the English domination, contrary to that of the Portuguese, was secular in character, it cannot be denied that the growth of the Western influence in India accelerated the decline in the Ottoman Empire.

The growth of European influence in the Indian Peninsula was, as a matter of fact, a stab in the

Eastern Europe. On the contrary they began to contemplate to deliver the attacks on the Islamic Empire from the East. Fisher in his history of Europe (Vol. II, Chapter IV) bears witness to this change in European politics. He refers to a certain plan of Pope Nicholas V of fighting a last grand crusade against Islam. He says " The discovery of the new world cannot be regarded as originating in no higher purpose that the quest for spices and gold. Religious aspirations were blended with economic appetite. At the Vatican, more particularly among the Franciscans, whose missionary enterprize was world wide, the oceanic enterprize of Portugal and Spain aroused the strongest strength as likely to lead not only to the evangelization of the heathen people but also to an *attack on the Moslems to be delivered from the East.* It was known that the Negus of Abbyssinia was Christian and it was believed that there still survived in India as a result of the mission of St. Thomas a Christian monarch known as Great Khan. From these oriental potentates it was fondly hoped that Catholic Europe would receive an effective assistance in one last grand crusade against the 'infidles.' Such was 'the plan of Indies' sketched out as early as 1454 by Nicholas V in a bull despatched to the king of Portugal. And it was in such an atmosphere that Columbus himself set out to discover the Indies in the West."

The very desire of the Europeans to reach the East by different sea routes led them to the discovery of America and the sea routes to India and the Far East. These events gave a new turn to the European as well as Asiatic politics. And a new economy began to develop. The acquisition of the new centres of commercial interest paved the way to the commercial and naval

Empire in Europe. Slav Confederation was defeated at Kassove; and the Catholic king of Hungary and Poland had to suffer the same fate in 1444. On May 29, 1453, the fall of Constantinople put an end to the existence of Byzantine Empire for ever. Mohammed II the conqueror of constantinople added Serbia, Albania and Greece to the Islamic territories. Salim I devoted his attention towards the internal consolidation. Under Suleyman the magnificent the Empire reached its zenith and the siege of Vienna marks the last Turkish campaign in their programme of assuming superior position in the Near East.

The Ottomans acquired naval supremacy as well. They not only brought Egypt and the North African coast under their influence but also conquered many Mediterranian islands of strategic importance from the petty Christian powers. Thus after having consolidated their position in the mediterranian regions they built up a Navy unrivalled and matchless. This was a greater threat to Christendom than that of the Seljuks. Now Pope again took the initiative and declared Crusade against Crescent. The Pope drew up the plan of not only defeating the Turks but also of crossing the Hellespont to rescue the Holy land from the 'Infidels.' But it was destined otherwise. A severe defeat in the battle of Nicopolis shattered all his hopes. This defeat together with naval inferiority of the European powers in the Mediterranian brought many alterations and changes in the naval and military plans and tactics of the Christian powers. Now they gave up the idea of making an advance on the Islamic frontier from the

Sultan Saladin. At last in the 13th Century the Western powers were completely defeated in the Near East. As such, the Zangi Turks proved themselves to be the protectors of the Near East. It is supposed that Crusades came to an end in the Thirteenth Century. But it was not so in reality. The strife went on; and is still going on.

A new Turkish power was gradually taking shape in the Near East. These Turks originally came from the Altai mountains. In the Ninth Century they pushed onward to the West and settled down in Asia Minor. They helped the Seljuks in fighting the Mongol menace and in waging wars against both the Greeks and Latin States. It was not till the 13th Century that Osman Khan came into prominence and became the most powerful Amir of Western Asia. He gave his name to the new Turkish Dynasty. After the death of the last Seljuk Sultan of Roum Osman Khan assumed his titles and usurped his throne. His successors, thanks to their enterprize, enlightenment and religious zeal, built up an Empire of the first military and naval importance. They consolidated their position in the Near East by absorbing all the Turkish elements into their Sultanate. Thus they extended their power in the Near East. Selim I annexed Kurdistan, Syria and Egypt to the Ottoman Empire. A little later North Africa was as well brought under their suzerainty. Now these Turks, being safe in the Near East, were ready to try to achieve what the great Seljuks had failed to do, namely to invade the Eastern Europe and annex it to Islamic territories. Suleyman the son of Orkhan crossing the Bosphorus, invaded Eastern Europe in 1355. Murad I took Adrianople, which later on became the seat of the Ottoman

the Islamic invasions. The extension of Islamic Sultanate to the shores of Bosphorus increased the vulnerability of the very bulwark of Christendom in the Eastern Europe. This naturally caused a great reaction in the Western Europe, which now became alert and alive to all the dangers. It had forgotten its religious political and social differences. The appeal of Alexius Commenus now found ready ears. The Pope felt the occasion pregnant with great possibilities for himself and the whole of Christendom. After liquidating all the quarrels he gave prompt response to the Greek Emperor's call. He not only dangled the fabulous wealth of the East before the greedy barons and feudal lords of Normandy, but also preached the penitentiary benefits of a Holy War against Islam for the recovery of Jerusalem. The Holy War as a matter of fact was a misnomer. It was, so to say, a war of the West against the East. The Near East had already been cleared of all the European powers, but it was again being threatened by the European invaders. In the meantime the great Seljuk Empire had been broken up into many small States. The Sultans of Roum were not so powerful as to face the newly rising dangers successfully all by themselves. Therefore the first hoard of so-called crusaders found very little resistance. The Sultans were powerless to prevent the establishment of several Latin States in the neighbourhood. Nevertheless the war went on. Every Moslem State did its duty and the invaders consequently never felt safe in their newly created principalities.

The Seljuk Sultans were succeeded by the Zangis. Nuruddin and Imamuddin successfully stemmed the tide of the Western invasions. Their work was taken up by

SELJUKS AND THE OTTOMANS AS THE PROTECTORS OF THE EAST.

On making an examination of the Turkish position in the Near East, it becomes clear that Turkey stands as a bulwark of the East. History bears testimony to the fact that the Turks have always stood against the aggressive designs of the Western nations as the sole protectors of the Near East for the past nine hundred years and more. It would be greatly interesting to recapitulate all the events briefly to see how far this is true. The diplomacy and the adaptability of the Turks to the most fluctuating situations of those times were remarkable.

The ninth century witnessed the powerlessness of the Abbasides at the hands of local Princes. As the result of political confusion several principalities assumed quasi—independent position. Internecine wars of those meteoric powers greatly added to the political chaos. This was a favourable occasion for the Byzantine Empire to violate treaties and make incursions in the Muslim territories. It was at this moment that the Suljuks rose to power and clearing away all the centrifugal elements from the Near East constituted a formidable barrier against the Greek invasion. Alp Arslan gained an overwhelming victory against the Greeks in the decisive battle of Malazkird. His successors continued the work begun by him and gradually and steadily pushed back the Greek frontiers until they stood on the shores of the Bosphorus, ready to capture Constantinople and to swoop down on the EasternEurope,—which as yet had been safe from

" Are you seriously hurt ?" he asked.

"Not so very seriously," I said, " but I think she has very powerful hands, " I jocularly added. She instantly turned towards me, realising the extra ordinary vigour with which she had grasped my throat.

" I really sympathize with you," said Akbar, " and I'll never allow my cousin to sleep in my room again ! "

" And I'll never allow your friend to come into the room and pinch my nose,"s aid the fair cousin laughingly.

" And do you think that I will allow anybody to strangle me thus ? " I said.

We all laughed a hearty laugh. But in the midst of all the out-bursts of laughter I could never forget my pain. And I will never again enter a room without making sure as to the identity of persons,—will never approach pseudo-masculine figures wrapped up in green shawls, will never pluck anybody by the nose, and will never incur upon myself, the wrath of indignant beauties and the sound manipulation of my throat,

M. NAIMUDDIN SIDDIQI,

M. A.

I perceived that she was on the point of bursting into fury.

"I am really very sorry," I at last exclaimed in a repentant tone, "will you please excuse me—my cruelty, as I should call it? I was dangerously mistaken. I hope that when Akbar comes—"

And Akbar came at the nick of time; came with a book in his hand, humming a tune in a sprightly manner, entirely unconscious of our troubles. For a moment he stood amazed, unable to understand the complexity of the situation. I had to explain to him—explain to him that I had made a big fool of myself, explain to him that her reddened nose and my almost strangled throat were the only remaining traces of our reciprocal hits.

"You've no need to ask her pardon," said he laughingly, with all the authority of a judge. "She had no right to sleep in my room."

"But why did he pluck me by the nose?" she retorted smilingly, feeling the tip of her nose.

"And why did you choke me with your hands". I asked with ready sprightliness.

She was apparently ashamed of her behaviour. "I think you'll never excuse me for it," she said; showing for the first time any signs of animation. "But it was only an unconscious retaliation."

An unconscious retaliation! But how dreadful! How unlike my innocent attack upon the nose! How cruel in such a nature, and how contrary to my expectation! I began to feel my throat. I had really some pain, which I had forgotten in my bewilderment. Akbar looked anxiously at me.

motion; the legs were brandished in the air, and the hands had already taken possession of my throat. Those hands—I still remember them.

Great God! How could I believe my eyes? Was I dreaming? Was it a mere phantom of my fancy? No, it was not. It was a real person in flesh and blood. With blinking eyes and a beating heart. I saw what I had done—saw the reddened nose, the pink cheeks, the gleaming eyes, half reproachful, half ashamed, the withdrawn hands, the bare white arms, and the green blouse.........

I have never felt so ashamed in my life. I could neither stay nor run away, could neither speak nor remain silent. I began to curse the moment when I started from the house, to curse my own mischief and grievous error.

"I am so sorry!" I at last exclaimed, trying to smile and turn my error into a deliberate mischief, "I didn't know that—that your ladyship—"

But no answer came. Instead, I received a sharp glance—a glance meant to examine the sincerity of my repentance. I wondered why she did not run away. But that was apparently an awkward way of getting out of the trouble.

"Akbar is out, I suppose," I said with great hesitation.

"No,"
"Is he inside the house?"
"I dont know."
"This is Akbar's room, isn't it?"
No answer.
"Are you seriously hurt?"

TO ERR IS HUMAN.....

It was a gloomy morning. The weather was damp, the wind was cold, and I was tired of my books. I was feeling the mysterious impulse of leaving my room and going somewhere—of wandering aimlessly and getting rid of a psychological obsession. Well, it is easy for all of us to run away from our reading-rooms, but it is not easy to start with a definite purpose. That was a great problem for me. But in a moment it was solved: why not go to Akbar, that intolerably studious fellow, who reads all night and sleeps all day and shuts himself up in his room? Yes, I will wake him up if he is sleeping, drag him from his room if he is reading, torment him with gossip-mongering, and release him from the night mare of examinations. Anon I started for his house. I entered the gate, and solemnly advanced towards his room. I knocked at the door. No answer came. I stealthily entered. He was lying in his bed, wrapped up in a beautiful green shawl. A writing pad and an unfinished letter lay on the table. The situation was entirely in my favour. I should wake him up. Certainly, I will; but how? An excellent idea flashed upon my mind: why not pluck him by the nose?

I searched for the nose. His back was towards me. Stooping towards his face, I saw something projecting from under the shawl. It must be his nose. And I plucked it with the full force of my hand, and could hardly suppress my laughter. But what a dire offence—I was unconscious of it! There was a sudden convulsive

open heart. He is ready to change his opinion, if he is satisfied with the contrary. He is guided by strong reason and wide knowledge. He is individual to the greatest extent, and as such, he never accepts any principle unless he is thoroughly convinced. He is frank and polite enough to confess that some of his plays smell of obscenity and indecency. At the same time he is so self assertive and indomitable, that, instead of submitting his work before the professional critics, he presented it to the general reader.

Sir Philip Sidney and other critics of the Elizabethan period tried to apply the continental critical rules quite mechanically to the English literature with hopeless result. But Dryden was the first great English critic who led the way in comparative criticism by judging the native literature with the native sense of propriety and requirement in literature.

M. A. AZIZ SIDDIQI,
M. A. (PREVIOUS.)

---

year of his life. It is his best piece of comparative literary criticism. It was written at a time when Dryden's judgement had matured to its perfection. In this Preface Dryden gives very exact, concise and delightful comparative pictures of Ovid and Chaucer, Chaucer and Boccaccio, Homer and Virgil, Ben Jonson and Shakespeare.

To him Chaucer ' is a rough diamond, and must first be polished ere he shines.' He thinks Chaucer to be 'a perpetual fountain of good sense' and as a man having, 'a most wonderful comprehensive nature.'

He translated some of Chaucer in spite of the general apathy towards the works of Chaucer. The translation of Chaucer was objected to: for two reasons. First, that it was fruitless to translate a poet who was uninspiring, dull and prosaic. Secondly that the intrinsic beauty of the Middle English would be last by its modern rendering. But Dryden meant his translation only for those who could enjoy the poetry and the sense of it. He preferred presenting Chaucer in modern English suffering Chaucer to lie in obscurity in Middle English.

The comparison between Ben Jonson and Shakespeare is very stimulating. In Dr. Johnson's words 'the account of Shakespeare (by Dryden) may stand as a perpetual model of encomiastic criticism, exact without minuteness, and lofty without exaggeration.'

Dryden said, 'I admire Jonson but I love Shakespeare.' The portraits of Ovid, Boccaccio, Homer and Virgil, too, are excellent and analytical. Dryden's merit lies in the fact that he is never dogmatic. He has an

contribution of English to the art of drama which, according to the classical school, consisted only of two divisions, viz pure tragedy and pure comedy. Dryden argues that as human life is equally made up of joy and sorrow, so also the introduction of the elements of mirth and dejection is quite reasonable in a drama which should hold 'a mirror upto nature.'

In this essay Dryden also discusses rhyme. He maintains that the objection to rhyme in a drama as being unnatural, applies equally to blank verse too. As we can not imagine a man speaking in rhymed couplets in a fit of agony, so also we can not expect a person surrounded by danger to deliver long passages in blank verse. Blank verse is used in drama only to avoid the flatness, lack of effect and dulness of prose. Hence the function of blank verse resolves into embellishment. Then why not use the rhymed couplet in drama which will bring more beauty and elegance as well as pleasure to the reader.

Dryden, too, is by no means original in his admirable Essay. He acknowledges his debt to various critics of France (especially Corneille) and Spain in his Epistle Dedicatory to Lord Buckhurst. But in his bold defence of tragicomedy and rhyme and in his attack on the two unities of place and time, Dryden is quite original. His 'characters' of Shakespeare and of Beaumont and Fletcher and his admirable 'examen' of the Silent Woman of Ben Jonson, are also original and valuable. He commends tragicomedy not because it is an English product, but because it represents life more truly.

Dryden's second piece of criticism is his famous 'Preface to the Fables.' It was written during the last

DRYDEN AS A CRITIC.

According to Dr. Johnson "Dryden may be properly considerd as the father of English criticism, as the writer who first taught us to determine upon principles the merit of composition."

Before Dryden, Sir Philip Sidney had written 'An Apology for Poetry' which was a mere adaptation of Aristotle and Horace. Hence it lacked originality. Gosson-Lodge controversy is familiar to the student of English literature in which attacks on poetry were the cause of many a 'defence' on behalf of poetry. Lodge and Sidney had identical views with regard to poetry.

'But Dryden's Essay on Dramatic Poesy was the first regular and valuable treatise on the art of writing,' says Dr. Johnson. This essay is written in the from of a symposium with Crites, (Sir Robert Howard, supporter of the Ancients) Engenius, (Lord Buckhurst, supporter of the Moderns,) Lisideius, (Sir Charles Sedley, champion of the French Drama) and Neander (Dryden, vindicating the superiority of the English drama to that of the Franch) as interlocutors.

The issue of the debate is a compromise. The Ancients are to be respected but are not to be blindly imitated. The Unities of Time and Place are dismissed altogether as having no authotity of the Ancients, but the Unity of Action is maintained. The introduction of the sub-plots and the shifting of the scenes are convincingly proved as justifiable by Dryden. In this Essay Dryden admirably defends the tragicomedy which is the

Ancient India which would otherwise have remained buried in oblivion. Excavations have resulted in many relics of the past These help us understand something of India's, civilization in the days gone by.

These all speak eloquently of India's glorious past, and are a source of inspiration for the future.

SYED MUNZOOR AHMED,
B.A. (Junior).

The other variety of the buildings was intended for industrial purposes. This opinion is based upon the fact that considerable quantity of slag, two furnaces and moulds of coins, terra-cottas and heads have been discovered in this area. These buildings are not of imposing nature, which is due to the fact that the oriental people have not lavished pains, as the occidental people have done, upon the construction of their industrial buildings. Therefore we must approach this area with extremely modest conceptions about its architecture.

The other structural discovery in this area is that of depositories. Three single depositories and three double depositories have been unearthed. All of them are under ground and are built of brick and mud.

The finds at Kondapur have opened a new chapter in history of Indian pottery and have afforded us a comprehensive idea of the creamic industry that flourished in our Dominions during the Andhra period. The people who lived at Kondapur during this period had a highly developed creamic industry. The clay used in creamic industry at this place represents a great variety.

Some vessels have floral devices stamped upon them. These devices have been at a later age copied in shaping the capitals of pillars of the caves and decorating them. The vessels which were made in moulds have a different kind of ornamentation. Some of them have a device of semilotus repeated along the neck or waist, while others have flutings below the neck of the vessels, runnings towards the base, where they terminate in a small medallion.

Our thanks are due to the laudable and meritorious work of our historians, research scholars and archaeologists which has brought to light many things about

period. During the time of this line the Deccan experienced great religious and political upheavals. Their territory extended from the East coast to the West.

The history of this dynasty has been recovered to a great extent with the help of inscriptions preserved in the caves and in recent times, considerable light has been shed upon their culture by Mr. G. Yazdani in his two addresses, one delivered before the Royal Asiatic Society in London, and the other before the Bihar and Orissa Research Society at Patna. On the other hand quite recently K. M. Ahmed, M.A., LL.B. delivered a research address before All-India-Oriental Conference in Hyderabad.

Turning to the subject proper we must here mention that antiquities and remains discovered at this place have a very wide scope and are of a revolutionary character, i. e., they have opened new vistas in the field of the history of Indian pottery. In Numismatics for the first time they brought to light several new varieties of Andhra coins and their moulds. The same is the case with terra-cotta figurines and other objects.

"From the Architectural point of view the remains of the buildings discovered at Kondapur can be divided into two classes. Some of them are of purely religious type. These consist of chaitya halls, stupas and monastries foundations of two chaitya halls three stupas and three monastries have been unearthed. The chaitya halls are of apsidal shape at one end and one of these contains a small stupa. The remaining two stupas are 21 feet and 19 feet in diameter and consist of seven cells, each being roughly 10 feet by 11 feet.

THE EXCAVATION OF KONDAPUR

"The ancient history and the art of India are of unique interest in the history of human endurance." These words are taken from the reply of His Late Majesty King George V to the address presented to him at the school of Oriental Studies on February 23, 1917. The India society is anxious to give, within the limits of its opportunies and resources, practical application to this note worthy utterance, and invites the adhesion of all who sympathize and agree with it.

To return to our subject we may say that our Government has taken a conspicuous part in Archaeological Department. Consequently many discoveries have been unearthed. The recent discovery of a town at Kondapur in Medak district, can throw a flood of light on Andhra period.

The information supplied to us by an author Ptolemy who belonged to the 2nd century A. D., about the Andhras is not of great importance for our present purpose.

After Ptolemy we get a glimpse of the Andhras in the Puranas whose date was about the 3rd century A.D. the Puranas have furnished us with the name of the kings of a dynasty which has been styled the Andhrabhrityas, and with the help of inscriptions and coins it has been established that the Andhra bhrityas were also called Stakarnis and Satavahanas. This dynasty ruled from the middle of 3rd century B. C. to about the first quarter of the 3rd centuary A. D. Here we may add that the remains discovered at Kondapur belong to this

Where words come out from depth of truth;

Where tireless striving stretches its arm towards perfection;

Where the clear stream of reason has not lost its way into the dreary desert sand of dead habit;

Where the mind is led forward by Thee into ever widening thought and action —

Into that heaven of freedom, my Father, let my country awake". (Gitanjali)

In short Tagore was a great artist both in prose and in verse. He had left scarcely any field of literature untouched, and has touched nothing which he has not adorned. The richness of imagination combined with the elegance of his style is rare. He was a musician famous in his art and a philosapher proved both in word and deed. We have missed in his peerless personality, a poet, artist, sage, seer, thinker, philosopher and lover of humanity irrespective of creed, colour, caste, class aud community.

Though his death, which is an irreparable and immeasurable loss to all mankind, has separated him from us, he will be ever with us in his "Scraps of songs," which have immortalized him.

K. S. Iqbal Ahmed Hashmi.
B.sc. (Osmania).

out to all humanity for friendly grasp and salute. He renewed India's cultural connection with Japan, Siam, China, Iran and America.

Tagore believed that, "By unrighteousness man prospers, gains what appears desirable, conquers enemies, but perishes at the root." Though he was generous in his estimate of the British people and British Nation, yet he was the first man who publicly condemned the Jallianwala Bagh Massacre and gave up his knight-hood in protest.

Tagore was an original thinker in Education. He founded Santinikelan, now called Visva—Bharati, which is famous for its simplicity, its avoidance of luxury, chastity and spirituality. Tagore wanted both man the knower and man the doer and maker. Visva—Bharati stands neither for merely literary, nor for merely vocational education, but for both and more.

Tagore is above all sectarianism, communalism and racialism. His politics are concerned chiefly with the moulding of society and character-building of nation. He does not prize the political freedom highly as the politicians, but his conception of freedom is full and fundamental. He believed in the innerfreedom, the born self-sacrifice, enlightenment, self-purification and self-control. He wished to set the "Human Spirit," free. His following prayer is the mirror of his conceptions.

"Where the mind is without fear and the head is held high;

Where knowledge is free;

Where the world has not been broken up into fragments by narrow domestic walls;

It is true that poets are not made, they are born. Tagore himself was an author for 71 years, for he wrote his first poem, "Kanwal," when he was only nine (9). Real and adequate translation from one language into an other is not possible, but Tagore has proved this impossible, possible. His English translations of Gitanjali and his other Bengali works are his master pieces. He translated the real spirit and even the musical and literary charms of Bengali literature in English. That is why his Gitanjali has earned for him an immortal name and won for him the Nobel prize of the year, 1913. Mr. W. B. Yeats poet Laureate of Ireland, wrote in this preface to Gitanjali. "These poems have become my life-long companions. Where ever I had been, even in trains, buses, hotels and ball-rooms, they were with me."

It is said of Tagore that he lived in two worlds—one, the world of visible forms and colours, and another the world of sound-form and sound-colours. Tagore was an authority on metre. He was an expert in music and had a sensitive ear. Franz Peter Schubert held the record among European Musicians, for composing 600 songs; but Tagore according to a rough estimate, had composed some 2,000 songs, all of which he set to music.

Tagore was a great philosopher. In philosophy he was not a system—builder, but he was one of the religio-philosophical teacher. He was a master of the histrionic art. He rehabilitated in Bengal the art of dancing, by girls and women. He considered it as a self-expressing and innocent amusement.

His ideal was the same as Ram Mohun Roy's. He wanted to build a bridge between the East and the West in the freedom of Space and Time. His hands reached

"He has tried all phases of literature—couplets, stanzas, short poems, longer pieces, stories, novels, dramas, comedies, tragedies, songs, operas and last but not least, lyric poems. He has succeeded in every phase, but succeeded beyond measure in the last phase of literature. His essays are illuminating, his sarcasms biting, his satires piercing. His grammatical and lexicographical speculations go further than most of us."

Tagore has not written any epic, perhaps the epic poetry did not inspire him. He has written much on religious, educational, social, political and economic subjects.

Tagore was a great scholar. His range of reading was very extensive and varied. A glance at his reading shelves would reveal to us, that he had studied :

"Farming, philology, history, medicine, geology, bio-chemistry, entomology, egyptology, pottery, banking, printing and road-making."

His reading of books was no mere idle pastime, but he made practical use of all his studies. This variety of his studies did not fill him with pride and egoism. He was modest and humble. In his poem, "The Great Symphony," he said.

"How little I know of this mighty World.
Myriad deeds of men, cities, countries, rivers, mountains, sea and desert wastes,
So many unknown forms and trees have remained beyond my range of awareness,
Great is life in this wide Earth,
and small the corner where my mind dwells."

RABINDRANATH TAGORE.

POET AND SCHOLAR

"It is because you are greater than your achievement.
That the chariot of your life

Leaves behind your achievement
Again and again" (Tagore.)

The myriad-minded Rabindranath Tagore breathed his last, on the 7th of August 1941. He had seen 80 years of his life. Lives 80 years long, if not common, are not rare either, but it is the quality that matters and not the length of life.

" Plants also live and birds and beasts live
But he truly lives, whose mind lives by Thinking"

Difficult it is undoubtedly to give the details of Tagore's unrivalled genius, admirable personality and noble achievements—they are so numerous and varied—and as poet wrote in one of his Poems :

" The Poet is not where you seek him :

You will not find the poet in his life-story."

So if we cannot look for him in externals, if we cannot find him in his joys and sorrows, we may perhaps discover him in his works.

He is our greatest poet and prose-writer. He has touched almost all the departments of Bengali literature, and has adorned and elevated them with the lustre of his genius. The late Hara Prasad Sastri, once said of Tagore

It has already been pointed out that the fate of India to some extent depends upon the policy of Afganistan and Iran, the two countries lying on the N. W. border of India. During the last few years the Germans increased their power and influence in Iran. Their view was apparent. The oil-springs, the air route centres and the situation of Iran herself as far as India is concerned are enough to demand the attention of any nation. The Nazi fifth column was extremely busy. All the movements of the Axis powers were looked at with awe and anxiety by the Allies. India's fate was at stake. Soon the Allies became alert and informed the government of Iran regarding the danger. The government of Iran was asked to expel the Nazis from the country. But the foolish government turned a deaf ear. There was no other go for the Allies except taking serious action. On 25th August 1941 the Ally forces entered Iran and after some days the fate was decided. The Nazi aims were frustrated and their efforts blasted. The Ally demands to a great extent were fulfilled.

The Iran question became intricately serious as well as important. The insurrections and the malcontents caused a good-deal of havoc and produced turmoil in the country. Raza Shah wad forced to offer the crown on 16th September 1941 to his son, Shah Mohammed Raza a youth of twenty-two.

SYED ABDUL BARI,
B. A. Previous.

which resulted in economic fluctuations; hence the parliament lost her prestige. A British contingent was stationed at Tehran.

Raza Khan was undoubtedly a man of parts and abilities. He was a many-sided genius. The incompetent parliament could not handle the State and hence Raza Khan was opposed to it. He disliked foreign influence in his country. At last 25th February 1921 he invaded Tehran with about three thousand soldiers and entered the city. Raza Khan was made the war Minister and soon rose to the position of a premier. The same year Ahmed Shah fled to Paris and led an infamous career of luxury and licentiousness.

On 12th December 1925 the parliament declared Raza Shah the independent monarch of Iran. Within a short period the whole phase of Iran changed amazingly from top to toe. The nation awoke from lethargy and obscurity. Reforms were introduced in various spheres of life. Public weal and welfare became the motto of of the sovereign. The means of communication were greatly improved. A railway line from Caspian Sea to Persian Gulf was laid, which marks his important constructive work. Education diffused like light. The old feudal system was abolished. The party tension between the *Shias* and *Sunnis* was brought to harmony. Thus it can indisputably be said that people enjoyed days "marked with white stone" in his benign rule.

The hero who infused the spirit of freedom in the dead souls and made Iran a flourishing and independent country is now no longer in power and his country subject to ally dictation.

members of the parliament. This scheme failed and the King's diplomacy was denounced in the strongest terms. The King had to flee for safety; and came under Russian protection. Soon the King invaded Tehran along with Russian soldiers. The parliament was no match and hence formed a truce. The very next morning a thousand soldiers of the royal army entered the city and the building where the parliament used to be held was set on fire and the members were arrested; of whom some were exiled, some imprisoned and a few beheaded secretly. The insurrections and malcontents of the districts were put down with an iron hand. Again in 1909 the nationalist party gained ascendancy.

Amidst such unhealthy environments, the King never lost his nerve. The Russians gave him refuge and he was incessantly trying his best to conquer the country he ruled. Finally he invaded but the attack was repulsed, the King dethroned and his son Ahmed Shah aged thirteen was chosen king. The parliament became all the more powerful. The financial conditions became stable and the royal expenditure was cut short. For foreign goods import duties were levied and the nobles were imposed taxes. But again unhappily the conditions became grave and deplorable.

During this period Russia was undergoing her great revolution; as a consequence the Russian influence drooped in Iran. But socialism affected deeply the northern districts. Raza Shah became the Commander of *Kasik Brigade*. The British influence was gradually gaining ground. The parliament of Iran gave the monopoly of oil-springs to one of the English Companies

revenge that was taken against this party shocked and roused the feelings of the public. This infamous monarch did one laudable work. It was the formation of *Kasik brigade* which played a very prominent part in the politics of Iran.

Naseruddin was succeeded by Muzufferuddin. The foreign powers took undue advantage of the infirmity of the new monarch. Russia and Great Britain tried their utmost to regain their influence in Iran. The King was on harmonious terms with these powers. But subjects remained ever discontented. Their national heroes demanded reforms. Reform became the cry in every nook and corner. The people deserted Tehran and the King yielded to the necessity. All the demands were fulfilled —Ainuddowla was dismissed from premiership and a parliament was formed. It represented the plebian class even and the King lost his power. On 7th Oct. 1906 the first parliament was called. Muzzuferuddin soon breathed his last and Mohd. Ali was anointed King.

Anarchy spread everywhere in the reign of Mohd. Ali Shah. He was a despot and wanted not to rule but to govern. First he claimed the royal prerogatives. The King did not like that he should in any way be subordinate to the dictates of his own parliament. It was too late—the parliament became all in all.

At last to suppress the malcontents and the power of the parliament, he formed an alliance with Russia, which the latter gladly approved. In order to get emancipation from the parliament, the King struggled hard. He was backed by the Judicial party. With the help of Russian troops an attempt was made to agitate the

hampered which provoked the natives. Taking advantage of the confusion and anarchy the foreigners became stable and powerful. Except agriculture there was no other way for the people.

In this connection may be mentioned the names of the two great personalities of that date—Syed Jamaluddin Afghani and Malkoom Khan. They infused revolutionary spirit in the hearts of the dead souls.

Syed Jamaluddin was born in Afghanistan and in his early age he received the Islamic education. His tour to Islamic countries made him prominent and brought him experience. Being invited by Nasiruddin Shah in 1889 he went to Iran. There in Iran the distracted state soon demanded his attention. An epoch of reform started. But after two years Afghani had to leave Iran as he was not in the good books of the King. Notwithstanding, there were men who loved Afghani with all their hearts. His sincere efforts and honest aims never failed to gain admirers. Truth always asserts itself.

Malkoom Khan was the native of Asphan, leading an obscure life as an ordinary teacher in Tehran. His ability soon attracted the attention of the government and he was sent to London as an ambassador from Iran. Later on he edited a paper and began strictly criticising the policy of the King. The policy of the government was denounced in the strongest terms. The people realised their miserable plight and the followers of Afghani proved a tower of strength.

Lives were sacrificed at the altar of righteousness. When the atrocities and oppression of the King reached a dangerous height, a certain person put him to the sword. On minute search it was found that the murderer was one among the followers of Afghani. The

From the 18th Century right up to the present date, Iran has become the nucleus of European politics, as far as Indian safety is concerned. The increasing power of the French under Napoleon was looked upon with awe and anxiety by nearly all the continental powers. Europe was in utter confusion, owing to the havoc and turmoil produced by him. His objective in the east was our land, India. The British were not unaware of his plans. Hence both defensive and offensive measures were adopted. In this connection Iran was fast gaining importance. French troops appeared in Iran so that India could easily be invaded through the N. W. Frontier. In order to check the French influence, the British and the Russian forces began to pour down into Iran. The defeat of Napoleon at the battle of Waterloo (1815) paved way for British supremacy. Now Iran became an arena for the two inimical powers—Russia and Britain. The contest between these two nations became an important factor in the Revolution of Iran. Iran was ruled by the *Khachar* Dynasty for over a century. In the beginning of the 19th Century Nasiruddin was the ruling monarch. He proved incompetent and the future 'seemed gloomy and unpromising. The government was fast becoming weaker and weaker day by day and losing her influence and prestige. The nation soon awoke to realisation. This stimulated and strengthened the *Babi* movement; but Nasiruddin completely extirpated it. Having none to oppose, the King became voluptuous and the ministers followed his example. The finance of the State was in utter ruin. To refill the treasury the subjects were unjustly taxed. Money was even borrowed from foreign countries and foreign trade companies procured concessions and acquired privileges. The trade of Iran was

IRAN DURING THE LAST HUNDRED YEARS.

Revolution is a remedial measure to all social, political and economic grievances. It is a reaction against injustice, despotism, attrocity and aggression: the best cure to thousands of evils. There can be no reformation, without Revolution. The History of the World is nothing but the history of Revolutions. The social, political and economic deterioration requires a change of order. Men realise their condition and the government too realises her danger; steps are taken but to no avail. The conditions acquire maturity and they seek for some opportunity. A single incident—"that breaks the camel's back"—ultimately tends to conflagrate revolutionary fires. The storm soon diffuses and reaches its climax. No worldly power can stand against it. Blood and bloodshed becomes the order of the day. The revolutionary souls seek for blood and blood and blood and they ask for more and more and yet more—their thirst is never quenched. This period is marked with terror, bloodshed, heartless massacres and innumerable atrocities, unique in their nature and quality.

The revolution is reformatory in its character; it roots out maladministration, shakes the foundation of injustice, eradicates oppression and emancipates millions of the distressed and the dishonoured. It gives birth to new social, political and economic orders. For every new order revolution is necessary. However hideous, terrorising and conflagrating the revolution might be, it prognosticates "Reformation" in every walk of life.

TO MY LOVE.

O; Shall I compare thee with the full moon
The common beloved of all the world
Uneasy warmth has the moon in June
What comparison has it with thy curled
Locks and winsome face, big luminous eyes
Form erect and slim and most loving nature—
All in one astound the stars in the skies.
Oh God! On Earth lives so rare a creature:
Fortune brought us twain, together, ne'er to part,
Cupid in arms lent strength to her powers
Her noble heart gave response to my heart:
Then fell from heaven blessings in showers.
Rivals shall glare though their envy enraged
We stand unconcerned, from spite disengaged.

MIR ABID ALI KHAN

---

liberty does not lie in unreasonable disobedience to established law and order. It should come from within to permeate the outer-self.

The very act of performing one's duties conscientiously and sincerely brings its own reward in the form of internal satisfaction. There is no government which would not readily grant the rights of citizenship to its duteous subjects, when once they establish their unassailable and just claims and prove worthy of the confidence. Even the worst autocratic power would be only too glad to entrust its public with certain responsibilities; though the measure of rights and privileges in an autocratic or democratic government may differ from that of a republican state. But in the absence of reciprocation it is the most sacred duty of the people to struggle for their rights. No trampling of rights can be allowed by one who is conscious of responsibilities.

MOHAMED BIN OMER
M. A. (Osmania)
Ex. President Osmania University Union.

training to the young men and unequivocally emphasises the necessity of political training—for the simple reason that young men of the present age shall be the torch-bearers of the coming age ; and certainly none would like to be ruled by unprepared minds, empty brains and inexperienced hands. It is for this reason that the United States of America and Soviet Russia have ceaselessly worked for the political consciousness and militaristic training of the young men to propare them for the arts of peace and the furies of war; it is for this reason that Turkey sets apart certain days in the year for the juvenile government of students!

There are people who have only one object in life—hoarding of wealth. To gain this object they use legitimate and illegimate means. They care neither for the cries of the victims nor the afflictions of their dupes. This craving for riches, lust for inordinate power, are the results of unhealthy development of exorbitant personal desires and worldly ambitions. The requirements and desires of individuals and institutions must change with the growth of society, with the consciousness of new aims and objects, as we are all the products of natural and inevitable circumstances. I wish to bring home the criminality of amazing riches for centuries while there are millions of people without a shelter without a cloth, without a meal. We are in the habit of bestowing sole attention on private property to the entire exclusion of Governmental property. We cut the wires, destroy the poles, remove the lines, damage the road and spoil parks, gardens and public property, without a prick of conscience and without sufficient reasons. Freedom does not consist in becoming recusants. Freedom of a ship does not exist in knocking against the shore ; and

low wages, live under inhuman conditions. But we do not feel the slightest remorse. We talk of socialism, we talk of equal distribution of wealth, we proclain the nobility of manual work but we neither resist the tyrannous exploitation of the poor nor try to ameliorate the heart rending lot of the weak. We should feel a pang of grief the untold sorrows of the distressed, a shock of pain at the piteous cries of the helpless wretches and hopeless invalids.

The future of society depends upon the younger generation. The young men of today shall be the leaders of tomorrow. Child welfare centres, equipped with accessories of physical improvement, gymnastic, sports and with means of intellectual progress as libraries, study circles, competitions, lectures on illuminating and contemporary topics are the crying needs of the times. The meetings of the young in social gatherings, literary activities, excursions, free from the fear of a school master would offer opportunities for exchange of thought on juvenile problems of life and promote that unity and amity which are so necessary in maturity. Dissipated boys and girls given up to unhealthy pursiuts are the symbols of hopes blasted and richest harvest wasted. From early stages they need a careful nourishing watch, and an atmosphere of educational and political enlighten ment which would make them grow into responsible members of society.

They are undoubtedly the strongholds of national freedom and custodians of its sacred rights. Filled with bubbling energy, enriched with new hopes, exalted with lofty enthusiasm and unfettered by racialism, they can bring into the field dynamic potentialities to fulfil unfledged national aspirations. Every civilized country of the world unrelentingly enforces compulsory military

where honesty, sense and justice are no disgrace, there is nothing like communalism. People belonging to different castes and conforming to different creeds belong to the same family and live in the same house with perfect peace and happiness—an unbelievable and almost supernatural phenomenon to an Indian mind. A citizen would never allow religion to interfere with his day to day work, social services, economic field of activity and political aspirations. China is inhabited by a population which owes spiritual allegiance to three great religions, Buddhism, Shintoism and Islam. But never in the history of the country has there been anything like communal warfare. They are one and the same in all the problems of life and have nationalism of their own. There is no religion whose followers are not to be found in the United States of America but no news of any riot on the basis of religion has ever reached us from the New World. The reason is that in this country and in all European countries, toleration, ferbearance, regard for each other's religious institutions are considered as the essential requisites of the people, conspicuous by their absence in our own country.

In our daily life we often come in contact with menials, workers and labourers who provide us with comforts without which life would be irksome, joyless and unworthy of living. But have we ever reflected about the lot of this unhappy creation with the same amount assiduity with which they bring us happiness? There are men and women, in our houses, who are treated like slaves, fed like the under-dog and made to work incessantly ; and yet we constantly talk of brotherhood and equality. The labourers in the field, the workers in factories work for hours together, receive extremely

a finger to help their country men. The pity is that they too look to governmental aid. They would more willingly spend their hoards of wealth amassed by the sweat of the poor and tears of the helpless on luxury, debauchery and sensuality than part with an iota of it to alleviate the pain or suffering of their fellow creatures.

The recognition of the idea of equality and fraternity admits the right of every human being to be in communion with his creator in his own way. Freedom of worship is the undeniable right of the people. The governments do not interfere with religion. They usually grant complete independence in religious ceremonies, services, rites and rituals, so long as the followers of one religion do not come in conflict with the adherents of another. There seems to be no reason why there should be bloody feuds, long standing enmities owing to difference of opinion in religion, when it is purely a matter of relation between man and God. I believe, that at the back of all this mischief, hostility and communal spirit there is a misconception of citizenship. Society while allowing for social and political rights and duties makes a call upon religious toleration. It requires complete toleration amongst the people of different religions. What man desires as his natural right, he should also concede to others. Just as a man cannot be a patriot and a tyrant at the same time, a man cannot be a citizen and as well as a zealous fanatic. A man can never be a citizen who clamours for equality and liberty and prepares to cut the throat of his neighbour on the slightest provocation, bias or prejudice. With the exception of India which has become a home of lost causes and forgotten principles, every where in the world

scientific instruments, Japan provide cheap articles, India supplies the necessities of life. If co-operation is possible between men and nations far off from each other, there is no reason why there should be no co-operation between scientists, scholars and artists living in the same country. The people belonging to the same profession will not only be profited by each other's experiences and discoveries but will also immensely add to the strength and fame of their profession and enhance the magnificence and greatness of their motherland.

We cannot expect the Government of any state or country to look after all the aspects of human life. There is a net-work of philanthropic associations all over the civilized countries of the west. The poor and the decrepit, the helpless and the wounded, receive the benefit of these associations. These humanitarian organizations should receive ethical as well as financial assistance from the people of every country, as they are unmistakeable signs of common brotherhood. It is up to the philanthropic sense of public spirited men to realise their responsibility in the formation of humanitarian associations for the general welfare.

Some of the most important works of social service depend on the munificence of private citizens. People rich in wealth and noble in heart provide various comforts to those whom the Government cannot assist. Indeed, some of the best public schools, libraries, parks, hospitals and welfare centres in the West owe their existance to individual efforts actuated by the highest ideals of citizenship. In our country there is a dearth of individual enterprise of this kind. Though there are millionaires who can tranform the land into a heaven of bliss to the great joy of humanity, they would not raise

an outstanding degree in Co-operative Movement. A net work of co-operative societies spread all over the country in which we live and worked with promptness and efficiency will not only relieve the pecuniary wants of the people but bring about unity between members of society through monetary interests, leading to wider social sympathies mutual assistance. Improvements of the means of communication as railways, ships, aeroplanes, postal services, telegraphs, wireless, newspapers, television have greatly helped in broadening the sense of citizenship. Banks Joined Stock Companies, bring people of common interest together; and clubs, coffee houses, and various unions provide opportunities of social contact.

In modern times, Literature and fine arts have received an impetus more out of societies and associations than anything else. Literary men, artists and scientists are forming themselves in groups to accomplish definite aims and objects. There are many enlightened men and women who are thinking on similar subjects working with the same pencil and brush and engaged in the same scientific work. They keep each other informed of the results of their labours and investigations, supply the missing links, discuss the results of their deliberations in conferences, and contribute towards the general progress of society. The various facilities of life with which we are provided today are not the results of the genius of one country or one nation alone If the plan is supplied by one, the material in a raw or finished form is supplied by another. The one is as important as the other. England has given Steam Engine, America has harnessed the power of electricity for scientific and social purposes; if Germany supplies

compared to the titanic endeavours of bodies of men with a common purpose and a united will. In a comparatively short time they can perform wonders. But the restriction of this fundamental right of organization is a denial of the next elementary right of the people.

The system of Local Governments provides an opportunity for testing the mettle of a citizen. The problem of voting first of all, attracts the attention. It requires a certain amount of moral courage and sense of responsibility in the voter. Undaunted by intimidation, uninfluenced by party intrigues and unaffected by pompous promises of the future, he has to vote for the right man in the right place and in the right spirit. Every vote that he casts, goes to make or mar his country. He has to exercise his judgment and discretion in the election of of representatives who would carry out the functions of the Government. The feeling of being the ruler and the ruled, at the same time should be sensitive enough to make us feel with whittier :—

> " My palace is the peoples hall,
> the Ballot-box my throne,"

Co-operation is the essence of civilized society; men cannot live without mutual help, and much less progress without mutual understanding. Joys and sorrows are a common heritage of humanity. One man's carelessness may seal another's death warrant. Beneficence on the part of a magnanimous person may save a neighbour from utter ruin. We are so closely connected with each other that the weakness of a certain section of society may bring the collapse of the whole, while the strength of a civic body may usher national solidarity. This fundamental necessity of civilized life is evident to

importance. The fear of a malicious report, threats of the police, the dread of the court, the prejudice of the press, dissuade free discussion which often misleads one in forming correct opinion on delicate subjects. A press muzzled by political authorities is worse than useless. We can easily imagine the uneasiness, the torture, felt by the editors when not allowed to discuss subjects of political importance and the restless expectation of the public impatiently waiting to be adequately enlightened by the pages of newspapers. The press acts as an intermediary between the rulers and the ruled. But under these conditions, the relations between them do not and cannot stand on a firm basis. They are threatened with doubts and fears due to ignorance, lack of correct information, absence of channels for the expressions of natural feelings and sentiments.

Freedom of association is the most natural right of human beings. Man is essentially a social animal. When upset by defeats or intoxicated with success, he often resorts to a friend to make him a partner in his distress or joy. History too, discloses this trait of human psychology. From the earliest ages, human beings have ever sought the assistance of others in matters great or small. The highly complicated contemporary life makes the association of men for consultation all the more necessary, at every turn. "In civilized society," says Adam smith, "man stands at all times in need of the cooperation and assistance of great multitudes, while his whole life is scarcely sufficient to gain the friedship of a few friends." People holding different opinions but working for the same ends come to a natural understanding when they open their hearts to each others. The benefits of individual efforts are microscopic when

civilization, culture and political background. He should be acquainted with the form of government under which he lives, the constitution of the state by which he is governed. A citizen's loyalty to the state should be above personal, racial or communal interests. The people generally consider politics to be the birth-right of a few statesmen, capitalists and vested interests. They believe that it is meant only for a few. They have no interest even in matters of public importance, though their welfare is dependent on their amicable solution. Let alone the man in the street, even scholars, thinkers, eminent persons evince no interest in it. Once a philosopher was closeted in deep meditation, when a servant rushed into the room and cried "Oh Sir! The house is on fire!" The great man unmoved by the news, coldly replied, "Go and tell your mistress; you know I never interfere with these domestic matters." The story may be fictitious yet it throws a flood of light on the behaviour of the people towards some of the most important problems of human life. Pericles thought of such people as a burden and dead weight upon society. "We think of a man who takes no interest in public affairs," said he "not as harmless but as a useless character." Citizenship demands the keen attention and lively interest of the people in political problems of the country not only as a kind of preparation to face the dangers and difficulties of a turbulent life but also to skilfully steer the course of the nation through the bewildering sea of diplomacy.

The expression of political views requires freedom of speech. The politicians do dot speak properly or effectively on political questions with freedom, nor do the people have clear ideas on problems of public

OUR RIGHTS AND RESPONSIBILITIES.

Society is based upon a system of rights and responsibilities of the people. It involves the recognition of certain social, political and moral duties of the people and establishes their claim to certain definite rights in the Government. The conception of citizenship is based on the fact that it covers our life all its activities. But with all its amplitude and all-pervading character it implies certain limitations—the subordination of the individual will to the common weal. This restriction assumes greater proportion with the growth of society. But in modern times the conflicting interests of parties, groups, factions and individuals while encroaching on the duties of citizenship, clamour for the enjoyment of more of its rights. Citizenship does not confine its attention to the duties which a man owes to his family, locality or nationality. It transcends the bonds and acts as a unifying element over discordant sectional interests, aims and activities. But the ideal of citizenship is often lost sight of in the wilderness of personal ambitions and party strifes, and as a result of this, there is stagnation in the general advancement of society, in industries, commerce, arts and sciences. At this stage an anti-social tendency of self aggrandizement, selfishness and personal interest is developed in the most threatening manner. It is the gruesome tragedy of individualism gradually submerging in retrograde separatism.

The attitude of the people towards politics is anything but satisfactory. The first duty which a citizen owes to his country consists in knowing everything about the state in which he lives—its geography, history,

Ornaments were worn of several designs of different metals. Gold and silver were used by the rich for ornaments. Copper was used for making utensils and for armaments. Lead is also found in the excavations.

Stone was generally used for buildings. There were also precious stones which were used for ornaments.

Cloth is found but unstitched. It shows that the people used to wear plain cloth. Rich cloths such those made of wool and silk are also found. Besides these articles needle is nowhere found. Mirror has also not been discovered.

They used to worship several deities. God Shiva is noted among them. Goddess Mahamai was worshipped with great ceremonies evéry year. They used to worship the banian tree also, which is imitated from the Egyptian Culture. In short they were idol worshippers.

The above discoveries have enabled us to know how great the ancients were and how far they have contributed to the modern culture and civilisation of India. All the above discoveries show that the origin of the present Culture and Civilisation is due to our great Dravidian ancestors. Further discoveries may throw more light on the contribution of the ancient culture and civilisation to the modern civilisation of the world.

B. ANAND SWAMY,
B. A (Final),
ex-student,
Osmania University College.

and the standard of living. It seems Harappa was the centre of Culture and Civilisation of these days. The recent discoveries by Dr. Frankfort at Tell Asmar in Mesopotamia prove that the upper levels in Mohenjodaro were probably contemporary with certain buildings which Dr. Frankfort has excavated and on very good evidence has attributed to the Dynasty of Akkad *i. e.* two thousand five hundred B. C. The presence of the Indus Valley Seals in Summerian cities points to the trade connections between the two countries.

At Harappa several commodities of household life are found which resemble more or less the present day ones. Red bricks are abundantly obtained from the excavations. They are unique in their models, simpleness, beautiful finish and in durability. Buildings were made of bricks, mortar and earth. There are also found underground rooms, bath-rooms with good drains. The buildings are two storied with staircases. The city's sanitation was looked after by Muncipal authorities. Roads were also constructed with drains on either sides. Dustbins are also found on either side of the roads. Coal is found in bath rooms which show that the people of those days used to take hot water baths.

Agriculture was carried on a large scale. The fields were irrigated by canals and tanks. Wheat is found which resembles the present wheat of the Punjab. Besides this barley is also found which resembles the present day Egyptian variety. The inhabitants of those days were also meat eaters. Fish, meat, and the flesh of several other animals were also taken by them. They used to tame goats, sheep, horses, oxen, cows, camels and elephants, deer, mice, and mongose were also found in those days.

when we say there is nothing in the story, it has all the appearance of a childish episode, and in the words of Southey it is "a very Dutch attempt at German sublimity." Yet people have been reading it incessantly from ages.

However we find a wilderness of beauty and grace in this poem. Appreciate the easy and rapid flow of words, sweet and harmonions versification and the melody of its metre and rhythm.

The very word "ancient" takes you back direct to the past in bygone ages where 'Mystery' winds you up from all sides, but you are sure of the place where you stand as the geographical descriptions are amazingly true.

It is a ballad not for the masses but for the educated few. It was written to celebrate the complement of wordsworth's rebellion against Town Poetry and 'the Heroic Couplet.' Its hero is neither 'Robinhood' nor 'Johnnie' but "a man more sinned against than sinning."

MD. MAHMOOD HOSAIN,

M. A. (Osmania.)

---

when we say there is nothing in the story, it has all the appearance of a childish episode, and in the words of Southey it is "a very Dutch attempt at German sublimity." Yet people have been reading it incessantly from ages.

However we find a wilderness of beauty and grace in this poem. Appreciate the easy and rapid flow of words, sweet and harmonions versification and the melody of its metre and rhythm.

The very word "ancient" takes you back direct to the past in bygone ages where 'Mystery' winds you up from all sides, but you are sure of the place where you stand as the geographical descriptions are amazingly true.

It is a ballad not for the masses but for the educated few. It was written to celebrate the complement of wordsworth's rebellion against Town Poetry and 'the Heroic Couplet.' Its hero is neither 'Robinhood' nor Johnnie' but "a man more sinned against than sinning.

MD. MAHMOOD HOSAIN,

M. A. (Osmania.)

"He prayeth well, who loveth well
Both man and bird and beast
He prayeth best who loveth best
All things both great and small
For the dear God who loveth us
He made and loveth all."

So this preacher, and you know Coleridge was a preacher; Hazlitt tells us he was a good preacher, wanted to admonish that we should love all the creatures of God alike. Could he not say this very easily. Why so much labour—yes, but he had to work out his mission. Suppose a man comes to you and begs alms of you saying that he took a plunge from a precipice, thousand feet high and has broken only one of his fingers, he shows you his bandaged finger also. Will you trust him, will you give him anything? Will you sympathise with him? No. But here is a man, the Ancient Mariner who tells you things you cannot believe. He informs you of pains he had to undergo—they are strange, you are not convinced, but still you sympathise with the man, you listen to him attentively. The Ancient Mariner had an extraordinary eye with the power of which he compelled people to listen to his story. But what is it that makes you read this poem by Coleridge. Has he also any glittering eye? It is not a captivating story, there is no enthralling romance, no stunt, no adventure, nothing. Still we read it not for its historical value but for the very discrepancies and abnormalities which make the story extraodinary, and you know every extraordinary thing however uninteresting and unattractive it may appear at the first sight, will captivate your mind and soul. Thus this poem fulfils its purpose. It is a compliment to Coleridge

It is given that the Polar Spirit who loved the bird was perturbed, so he follows the ship till it reaches the Equator. Here he begins to take the revenge—why not in his own dominions, was the equatorial region under the sway of the Polar Spirit?—but who should answer these.—Well the revenge begins—the wind stops, the ship comes to a standstill, heat reaches its extremity. Everything is bruished; the sky, the sea all grow rotten, decks shrink, sails sere, eyes are glazed and throats are parched. Yet it is not enough, a skeleton ship comes with Death and Life-in-Death as its only crew. They cast dice; Life-in-Death wins the Ancient Mariner and Death his comrades. They die with a curse for him in their eyes. He lives, has to live a life he detests, which is worse than death for he is under the curse. For a long time, we do not know how long, he had to undergo,—I cannot dare describe it a second time. At last the spell breaks. How? He sees the water snakes writhing and glittering in the moonlight, a something he feels in his heart, lifts up his eyes and and prays and the spell breaks. Sleep slides into his soul, it rains everything gets drenched. The dead men rise again—strange even in a dream, but they are some angelic spirits that have slid into their bodies. They work the ropes, the ship sails smoothly, but without wind or motion of the sea. It comes to a sudden stop, again starts with an uneasy motion. The Ancient Mariner falls into a swoon and when he wakes up sees his own country, the same harbour, the same light-house and the same kile. The pilot and the hermit come in a boat, the angelic spirits flit away, the ship sinks down with the dead crew, but he is saved and now lives to tell others.

Perhaps you know the story. Just now I have told you I have found it dull and uninteresting. You do not seem to be convinced. I will tell you.

There lived an Ancient Mariner, this we are told and the main character is so abruptly introduced. He is tall, thin, lean and lank. He has a weather-beaten face with crow's feet on forehead, skinny-hands, grey hair and glittering eyes. His eyes we are told have a power which can hold people even in face of great temptations. This man, owing to some unknown reason, feels at certain times that he must relate his story. Somehow he knows to whom his story must be told, he calls him, the power in his eyes binds the man and he has but to listen to the old man. Thus one of the three wedding guests is held.

The Ancinent Mariner begins his story. He and his comrades, two hundred in number set forward on a voyage from a country in the north. The wind was in their favour and smoothly they sailed on. Where to, we are not told. They are caught by a sudden and furious storm and are driven to the south pole and reach the Antarctic regions, the land of mist and snow. The sea is frozen, the weather is biting cold and the mist blinding.

Then out of the hail comes the bird, Albatross, the ice melts, the icebergs give way, the mist is penetrable and the ship moves backward and clears off the cleavage of the icebergs. For seven days and nights the bird was with them. On the last day the Ancient Mariner shot the bird with his bow. Why did he do so? It is yet a mystery and will remain so for ever. We must remember it is a poem permeated with abnormalities.

contrast was there; my readers. I was stunned and could not sleep. The Ancient Mariner was under a dreadful curse. His ship was perched upon a silent sea under a copper sky. The bloody sun parched everything by day, and by night the sea burnt in many colours like the witch's oil. Why all this? The Polar Spirit was taking revenge upon the Ancient Mariner for the blood of the Albatross. Just imagine the ghastly pang the old man must have been undergoing. He is sick of his life, but cannot die. The Albatross is hanging on his neck, his comrades, two hundred in number lie lifeless on the deck with their eyes open and there is the curse for him alive and all the while tormenting. The blue and the deep all are rotten, his throat is parched, his eyes glazed, he can neither look up to heaven nor pray. Yet, still he has to live, to live a life worse than death for Life-in-Death has won him.

Could you sleep my reader. Nobody would have liked to read such a piece at that time. I assure you I too did not, but—but I had to.

Was I under the same menace, the same compulsion?

But here lies the difference, mine was voluntary whereas his was not. I had complied with the offer that brings such compulsions. I remember I had read the same poem sometime ago, not long indeed. But those days are gone, these, though they glitter, are dreary and dank; they were all sunshine. Can they return to me? Oh! it is childish to ask and futile to hope. The contrast banished my sleep and the sense of duty made me read it, and I read.

ON READING 'THE RIME OF THEANCIENT MARINER.

Perforce I had to read Coleridge's Rime of the Ancient Mariner. I read it regardless of the fact that Coleridge was one of the pioneers of the Romantic Revival and that he had written the poem with a mission before him to bring down the dwellers of the sky to roam amidst the inhabitants of the earth; to make the supernatural lose all its abnormal and extraordinary belongings and to give it the colour of an experience common to us all in our every-day lives. I read it regardless of the fact that the poem was reminiscent of the ballad literature, was pervaded with the imaginations of the Nature poet, was breathing in Pan's demesne and was intended to be published in the small book of lyrics and ballads, that clarion call which announced to the world that a new era had begun that the Popes were dethroned and that the town walls were demolished which had confined the fair maid, Poesy, for more than half a century. She was released and allowed to play in woods with the Lonely Reaper, to look at the Rain-Bow and to listen to the Cuckoo and the sky lark.

So notwithstanding all these I read it and found it to be a story dull and damping. The night was sultry when I began the poem. Slowly the Moon rose from behind yonder trees, the clouds dispersed, fair breeze began to blow with a sweet melody in the void. The trees nodded, the leaves clapped and the flowers laughed full-heartedly and filled the air with their narcotic scent. I mus have been lulled to sleep, bnt what a

stormed at him and abused him. Then all Purtab's old passions, his anger, his hatred burst out in a fit of uncontrollable fury. He swung his lathi (heavy stick) round and brought it down on Lala Jugal Kishore's head. With a scream of pain Lalaji fell to the ground and lay there weltering in blood. Aghast, Purtab stared at the body. Then he rushed out, demented, to the police station, and confessed his ghastly deed.

Back to the court he was sent. The judge delivered judgement: "This prisoner is a confirmed offender. He obviously nursed a grudge in prison and intended to murder the deceased. In such a case leniency is out of question. I thus feel authorised to give the capital penalty. The prisoner shall be hung by the neck," etc.

So, a few days later, in the cold grey morning, Purtab's soul sped to its Maker. But his works live, and one day, when justice is dealt, his blood shall cry for vengeance and receive it.

MAIMUNA SULTANA
3rd Year Science
OSMANIA UNIVERSITY
COLLEGE
for Women.

proceedings were brief; Purtab pleaded guilty and was sentenced by the learned judge to three years' rigorous imprisonment. The judge in the course of his judgement remarked, "The prisoner is a wilful and malicious fomenter of class hatred," and further said that he felt it his duty to give the prisoner a severe sentence as a deterrent to others.

The workers struck work but, handicapped by the lack of a leader, and faced by starvation, they had to give way, and went back to work, thoroughly chastened in spirit.

Meanwhile after three bitter years, his spirit broken by the iron hand of law, crushed by the wheels of the juggernaut called society, Purtab came out of prison. He found neither hearth nor home; his wife was absent, his friends estranged. In desperation he went back to Lala Jugal Kishore's house.

Admitted into the august presence of Lalaji, he begged to be taken back. With a contemptuous sneer Lalaji spoke, "So you have come back, you dog?"

In his three years of imprisonment Purtab had learnt to endure insults. So he only replied, "yes, Lalaji, I have come back. Give me a job, and I shall work faithfully."

Lalaji, enjoying to the full his revenge, said, "I shall give you what I give to curs who come here. Take this—and this!" and he kicked Purtab hard.

Even this he bore in silence. He abased himself and implored for a job. But all to no avail. Lalaji

This stirred Purtab and he spoke ironically now, with bitterness in his voice. It is not Kismat, it is our own stupidity, our blindness. If Jugal Kishore reduced your wages, would you say, It is Kismat, it is the will of Jugal Kishore, it is the will of God? Would you or would you not fight for your rights? I tell you, unless you fight, unless you open your eyes to the truth, the rich, the capitalists, will rule you. Strike now for better wages, that your children may live like men. Suffer yourself to help your children. Show the capitalists that you can fight, if need be, to the Death."

Then there was an answering roar from the workers' "We shall strike! We shall strike!"

Now fate took a hand; for at that very moment Jugal Kishore came in his car at a break-neck speed, violenlty blowing his motor horn. Purtab jumped up in rage. "This is the man who starves us, who ill-treats us; this is the man who killed my child; this is the monster who rejoices at our suffering." A frenzied mob of workers surrounded the car.

It needed only a spark to set off the explosion, and Jugal Kishore himself supplied it. He stepped out and bellowed. "Move away, you dogs!'

Enraged beyond measure, the workers fell on him in a body, and pummeled him until, all his dignity forgotten he blubbered and whined for mercy. By this time the police had came up, and they dispersed the workers. Purtab was arrested as the ringleader.

In course of time Purtab came before the Sessions judge, charged with assault and battery. The

in general. The immediate result of this was that Purtab organised the workers in the factory, made himself their leader, and allied them with the communist trade unions.

Then one day, sure of his hold on the workers, he called a meeting and proposed to demand an increase in wages, and in case of refusal, to strike. There was much discussion, and then Purtab stood up and spoke.

"Comrades!" he said "Fellow workers! We work, do we not? We labour, we sweat and for what? To line the pockets of men like Jugal Kishore. What do we get for our work—a paltry eight annas a day. We live in hovels, imprisoned like slaves, shut from the light, from the fresh air. We starve; we are clothed in rags; we die from disease. We die from cold; we die from the heat. And our children, our wives, they starve, too. What has the future for our children? This—that when we die they may take our places, and starve and toil, to swell Jugal Kishore's bank accounts." Purtab spoke passionately now, and with deep sincerity. "I had a child once, and he died because I was poor; because I could not feed him, because I could not give him warm clothing, because I lived in a damp, unhealthy place. And you," he spoke to his friends, "have not you all seen your wives, your children wasting away from diseases, and you powerless to help, impotent from want of money? And why have we not the money?"

There was an answering shout from the audience, but there were dissenting voices as the weak, the apathetic murmured, "It is Kismat, the will of God."

child, his only child, was in the grip of the dread disease consumption.

The child was admitted to the public ward in a hospital. Daily he grew weaker, one lung should be collapsed, said the doctor; but that needed money, Purtab was by this time sunk in utter despair, he had grown apathetic. He picked the child up in his arms and carried him home. No body objected, the hospital bed was needed for another patient.

Then came the end, Sundar's life flickering fitfully was extinguished one day by a violent haemorrhage.

Sundar died, and for a time Purtab was stunned completely. His brain seemed not to function at all. Then slowly he awakened to the realization of his loss, and with this realization came bitter thoughts. If he had the money he could have sent Sundar to a saniatorium; he could have fed and clothed him properly; he could have saved the life of his only, beloved son. Then fiercely insistently came the question. "And why should I not have had the money? Do I not work harder than Lala Jugal Kishore? More, much more! What work does Lalaji do at all?"

So, in his frenzy, he, Purtab the submissive, the resigned, cursed the God who had made him a poor man, cursed and blasphemed. Then even to his tortured brain it became clear that the society which exalted men like Jugal Kishore, which trod down millions of workers like himself, the society which had denied Sundar the right to live, this society was not created by God, but by men for their own ends. This engendered in him a fierce hatred for men like Jugal Kishore—indeed, for the rich

So that day, Purtab repaired to Lala Jugal Kishore's house. It was a spacious house and when Purtab entered the courtyard he saw some of Lalaji's children, well-fed and well-clothed with pull-overs and over-coats. For a moment envy flamed in Purtab's soul. But he was a philosophic man; it was kismat (fate), and perhaps in his next life he would be better off.

He was admitted into the presence of Lalaji's wife. With fitting humility he stated his request. A curt refusal was the answer. On his venturing to plead further Lalaji's wife burst into a torrent of imprecations. "You thieving beggars, you loiterers, can't you stay at home? Go away this instant." She spoke so because she had been visited already by a number of other men with the same request. And Purtab went home empty handed.

That night Sundar began to complain increasingly about the cold and began to cough slightly. All night his mother lay beside him, soothing and warming him by her presence. Day after day now Sundar tossed on his bed, his body burning with low fever. The cough, now grown to alarming proportions, racked his little frame. Gone was all his gaiety, his cheerfulness. If he spoke now it was in wheezing gasps, each accompanied by a spasm of coughing. Purtab and his wife stood helplessly by, suffering agony, as day by day Sundar wasted away. His face was now wax-like, his body a skeleton.

Winter passed away and people rejoiced; but Purtab knew no joy. Sundar was as ill as ever, and beginning to spit blood. Now at last Purtab knew the worst. His

cow-dung fires, as the poor of the land, numbered in countless millions, huddled together in their dwellings, cowering in terror at the bitterness of the cold. In the slums of Cawnpore, too, the winter held terrible sway. Throughout the city people crowded in their hovels, shivering, herding together to conserve the warmth of their bodies. Most pitiful of all to see were the children, under-nourished and clad in rags, lips blue with the cold, eyes dumb with misery.

And still the temperature fell. Ever and anon one of the little ones, too weak to resist, would succumb to the ravages of the winter, and sometimes the older ones would fall, too. All over the country rose the smoke from other fires, as the funeral processions came silently to the riverside. The people, absorbed in their own misery, forgot to mourn for the dead.

Purtab, also, was affected by the terrible cold. But he was relatively prosperous, having only one child to support, so that Sundar, his son, was better clothed and fed than any of the other children in the mohullah. Still Sundar complained of the cold. So one day Purtab's wife said to him "Husband, we must have some woollen clothing for Sundar, otherwise he will die of the cold."

"How am I to get it? The price of wool is going up every day."

"Go to Lalaji's house and beg him to give you some clothes. He has many children, and there are sure to be some lying about."

"All right, wife, I shall go today."

THE STRUGGLE (a story)

Cawnpore, the city of dust, of squalor, is begrimed with the smoke of a hundred factories, and yet people flocked to Cownpore as to heaven, crowding together in dismal slums. Whole families herd together like animals. Thousands are swept away by starvation, by disease, and thousands more starving in the villages, rush eagerly to Cawnpore to earn their sustenance, forsaking the healthy air of the countryside for the fetid, unhealthy atmosphere of the city. And the mill-owners batten on the toil of workers; they are cynical and can afford to be. "God is good, and labour is cheap in India" they say. Thus life, or death, continues its round as usual in the city.

Purtab was a fortunate man. He too worked in a factory. All day he toiled in dirt and soot, and in the evening received eight annas for his toil—eight annas to feed himself and his family, to clothe them and house them. But still, he was fortunate. He returned in the evening to the tiny garret he called his dwelling. Here he was greeted by a loving wife and son, his only child. The son was the light of his eyes, a bonny boy. Not only was the boy beloved of his father, he was the favourite of the whole Mohullah (neighbourhood). No man was too poor to offer him a crust of bread or precious sweetmeat, no woman was too busy to spare a few moments to caress him. The boy was fragile for lack of nourishment, but was ever cheerful in spirit.

Then one year there came a winter of unusual rigour. All over the north rose the smoke from the

All this data is given, as we said before, from the list of 1937. During these five years some progress must have been made.* Anyway the expectations which were entertained in the arzdasht of 13 Aug. 1917 are now being realised and within a quarter of a century, thanks to the strenuous labours of the Rt. Hon. Sir Akbar Hydari, and due mainly to the generosity and munificence of H. E. H. The Nizam Sultanul Ulum, the progress achieved is indeed remarkable.

A few suggestions before we close the subject.

In order to correct the vision of the students reading Indian History it is necessary that they should read not only the Hindu Period in detail but also Islamic History. This will give the proper perspective so much needed in India. For this purpose the Short History of the Saracens by Amir Ali and Bharatvarshka Itihas by Ramdev may be translated easily.

Secondly standard compilations from sister languages must be translated at an early date. This will save much expense and labour, and the models could be easily improved upon.

Thirdly the Bureau should encourage translations being made into other Indian languages of works published by them. This reciprocity will tend to promote the common use of technical terms and words of common derivations—this is particularly the case, at any rate, in Hindi and Marathi.

The achievements of the Bureau are indeed remarkable. It is hoped that even better results will be achieved in the future.

B. N. CHOBE, B.A., LL.B. *(Osmania.)*

---

* A supplement published in 1940 by the Bureau shows that 52 more books are published, making the total publications 288—Volumes.

Some of these institutions have done pioneer work, but not one of them attempted on a large scale to serve the Indian languages by means of translation, compilation, and reproduction of the achievements from other languages. In this respect the experiment started a quar ter of a century ago at Hyderabad is unique in itself. We are not here concerned with any of the private insstitutions doing excellent work in Marathi, Hindi, Bengali and Urdu. Nor are we concerned here with the vast work turned out by the graduates of the Osmania University, for it all depends mainly on personal enterprise.

According to the list of publications for the year 1937 it appears that in twenty years of its life the Bureau published 236 books or about one book per month was published. There were besides 62 books in the Press at the time 105 were under compilation and 119 were proposed thus making up a grand total of 522 books.

An analysis shows that 33 books were published on Indian History, 18 on Muslim History, 22 on Mathematics and 21 on Physics, 17 on Engineering, 10 on Law and 9 on Medicine. A Dictionary of Technical Terms was under preparation.

The range of subjects included Botany, Chemistry, Ecnomics, Engineering, English Constitution, Ethics, Geography, History (Indian, Muslim, English, European, Greek and Roman) Law, Logic, Mathematics, Medcine Metaphysics, Philosophy, Physics, Politics, Psychology, Sociology, Teaching and Zoology.

کا اصل اصول یہ ہونا چاہئے کہ اعلی تعلیم کا ذریعہ ہماری زبان اردو
قرار دیا جاے -

On the 13th August 1917 the following scheme was submitted:—

علوم و فنون کو اپنی زبان میں لانے اور ملک میں اشاعت علم
و ہنر کی یہ پہلی کوشش ہوگی جو بڑے پیمانے پر اس ملک میں
سرکار عالی کی جانب سے کی جائیگی اور اس کے فواید اور منافع نسلاً
بعد نسل زمانے دراز تک اہل ملک کو پہنچینگے اور بلحاظ افادہ و
اہمیت و ضرورت یہ کام علمی دنیا میں ایسا عظیم الشان ہوگا جسکی
نظیر تمام ہندوستان میں کہیں نہیں پائی جاتی -

The next day the scheme was sanctioned and the Bureau of Translation and Compilation was brought into being as part of the grand scheme of the Osmania University.

There are now a number of Universities functioning all over the land. The Punjab University caters for the N. W. F. P. and the Punjab, there is Jamia-Millia at Delhi, the largest number is to be found in the U. P. The Gurukul at Hardwar, the Gurukul at Jwalapur, the Rishikul at Hardwar, the Muslim University at Aligarh, Agra and Lucknow and Allahabad Universities and the Hindu University at Benares are doing their work each in its own way. Patna, Calcutta and Dacca Universities supply the growing demand for knowledge in the eastern provinces while for C. P. there is the Nagpur University. In Bombay there is the University in the Presidency town and also a Women's University. In the south there are the Andhra and the Madras Universities. Among the Indian states there are so far as we know three Universities at Hyderabad at Mysore, and in Travancore.

It was first the Pujab University which set the ball rolling by establishing an Oriental Faculty. Even this. was considered very revolutionary in those days. Next it was in 1902 Major B. D. Basu published his scheme in *the East and West* and in 1905 the National Council of Education was formed in Bengal. It was at about this time that the Guru Kul at Hardwar was established. The main feature of the institution was the emphasis on Brahmchari mode of life and Hindi was to be the medium of instruction, and it may be interesting to note that one of the earliest candidates to join from Hyderabad was Mr. Vinayk Rao the son of late Justice Mr. Kesho Rao.

None of the educational institutions so far possessed any machinery to enrich vernacular languages. from European and oriental classical language. Mr. Akbar Hydari, as he then was, Home Secretary to the Government of H.E.H. the Nizam of Hyderabad and Birar first conceived of the bold scheme, and put it into action. The sanction was accorded by the sovereign on the 26th of April 1917 to establish the Osmania University in Hyderabad in words which have become famous:—

مجھے بھی عرضداشت اور یادداشت کی مصرحہ رائے سے اتفاق ہے
کہ ممالک محروسہ کیلئے ایک ایسی یونیورسٹی قائم کی جائے جس مین
جدید و قدیم مشرقی و مغربی علوم و فنون کا امتزاج اس طور سے کیا
جائے کہ موجودہ نظام تعلیم کے نقائص دور ہوکر جسمی و دماغی و
روحانی تعلیم کے قدیم و جدید طریقون کی خوبیون سے پورا فائدہ حاصل
ہوسکے - اور جس مین علم پھیلانے کی کوشش کے ساتھہ ساتھہ ایک طرف
طلبہ کے اخلاق کی درستی کی نگرانی ہو اور دوسری طرف تمام علمی
شعبون مین اعلی درجہ کی تحقیق کا کام بھی جاری رہے اس یونیورسٹی

THE BUREAU OF TRANSLATION AND COMPILATION.

(NOTE:-The Hony. Managing Editor writes to tell me that I must write to the Osmania Magazine and write I must. It is one of the cherished privilage of an Editor which even the Principal of old and the P. V. C. in these days of contitulionalism cannot and do not enjoy. And so you have the article for what it is worth. If it serves any purpose you have to thank the Editor, and if it is in your opoinion an indifferent matter you may put the blame on his shoulders.)

In the days of the E. I. Company the first Indian reformer Raja Ram Mohan Roy, with all his reverence for Sanskrit and the Philosophy of the Upanishads some of which he translated into English, in his famous letter to Lord Amherst boldly expressed himself:—

"No Improvement can be expected from inducing young men to consume a dozen years of the most valuable period of their live in acquiring the niceties of Vyakarana or Sanskrit Grammar," and thought of establishing a college at Calcutta. What his scheme would have been in its entirety we know not. But it was Lord Macaulay who held the field in eductational policy of the E. I. Company, and for about three quarters of a centuary his scheme was carried out in India.

A generation after, when by the work mainly of Max Muller and other orientalists the Vedas were first printed and published and made easily accessible, Dayanand chalked out a programme in conformity with the old ideals of dividing life into four periods—that of a scholar, a house holder, a forest hermit and a Sanyasi. This scheme of his was not acted upon in his life time.

Science, History, Morals, Theology, and Human Progress. This work is Comte's masterpiece, and the result of twelve years of hard study.

In 1843, Comte published his "Elementary Treatise on analytic Geometry in two and three dimensions." He issued in July 1848, an abstract of his ideas entitled "Discourse on the totality of Positivism." Afterwards, he issued the "Positive Calendar," and then followed the "Positivist's library" and "Positive Politics or a Treatise on Sociology" instituting the religion of humanity. Another most remarkable work was issued entitled "Consideration on the Spiritual Power," the main object of which is to demonstrate the necessity of instituting a spiritual power.

In 1857, he had an attack of cancer, and died peacefully on the 5th of September of that year. Thus from that day, the domain of philosophy was deprived of "The Bacon of the nineteenth Century," and Benjamin Frnklin, the youth's idol at this moment began to say "I seek to imitate the modern Socrates."

M. MUSLEHUDDIN,

Senior Intermediate.

---

three stages are the Theological, the Metaphysical state and Positive.

Knowledge or a branch of knowledge is in the theological state when it supposes the Phenomena under consideration to be due to immediate volition, either in object or in some supernatural being. In the Metaphsical state, for volition is substituted abstract force residing in the object, the Phenomena are viewed as if apart from the bodies manifesting them. In the Positive state external volition and inherent force have both disappeared from men's minds. But it is to be noted that in the Theological and Metaphysical state, men seek a cause or an essence, in the Positive, they are content with a law.

Positivism is scarcely known in India, but it is a religion with many followers in South America. Its founder apart from that was a savant of the first rank.

We shall now briefly describe Comte's principal works. In 1822, St. Simon published his work on "The Social Contract" to which Comte supplied a section entitled "A scheme of the labours requiste for the reorganization of Society." At the close of 1827, he assumed his intellectual labours. In August 1828, he wrote a paper for the journal of Paris "An Examination of the treatise of M. Broussais upon irritation and madness." This exertion at once recalled to his mind the grand thought. Afterwards, he busied himself to rearrange his ideas, and recommended his course of lectures on the Positive Philosophy in his house. In 1830, after presenting a brief outline of his ideas on the progress of thought and the history of science in the "Atheneum," he began the composition of his great work "The Course of Positive Philosophy" which is in six volumes, containing

Simon who launched him. However, Comte began to fret under St. Simon's pretensions to be his director. But from 1818 to 1820, St. Simon's influence was highly strong upon him.

That first and dominating idea in all his work was that of humanity. To trace this in earlier thought throughout the ages, would be to give the intellectual geneology of Comte. His system was "Positivism" and method "Positive." A "Positive" fact is one which everyone would admit, if he had an equal opportunity of judging. A recent American writer Mr. E. L. Thorndike has stated the fundamental belief on which the "Positivism" rests. "We should regard nothing as outside the scope of Science, and every regularity or law that Science can discover the consequence of events is a step towards the only freedom that is of use to men and an aid to the good life. If values do not reside in the orderly world of nature, but depend on chance or caprice, it would be vain to try to increase them. The world needs not only the vision and valuation of great sages, and practical Psychology of men of affairs, but also scientific method to test the worth of the prophet's dreams and scientific humanist to inform and advise its men of affairs, not only about what is, but also about what is right and good."

In other words, the Positive Philosophy is the law of the three states. Each of our leading conceptions passsés successively through three different phases, in which the human mind explains Phenomena. Those

---

Comte, by F. S. Marvin. P. 196.

AUGUSTE COMTE

Auguste Comte was born on January 19th 1798, in the most violent phase of the French Revolution. His father was cashier at the tax-office in the department of Marault and lived at Montpellier. He was sent at the age of nine to the college at that town, where he revealed the determined character which distinguished him through life. After passing the public competitive examination, he entered the Polytechnic, at Paris, where he distinguished himself greatly in Mathematics, but unfortunatly the Polytechnic was broken up on account of a quarrel between some of the professors and their pupils. Afterwards, he made a livelihood by teaching Mathematics in Paris.

Towards 1818, Comte became associated as friend and disciple with Saint Simon, who was destined to exercise a very decisive influence upon the turn of his speculations. Saint Simon is described as the most estimable and lovable of men, and most delightful in his relations. He honestly admits that Saint Simon's influence has been of powerful service in his Philosophic education. He writes to his most intimate friend " I am certainly under great personal obligations to Saint Simon, that is to say he helped in a powerful degree to launch me in a Philosophical direction that I had not definitely marked out for myself, and that I shall follow without looking back for the rest of my life."*

Comte is not in the true sense a follower of Saint Simon, but in his own words it was undoubtedly Saint

* The Encyclopedia Britannica. Vol. 6. P. 815.

zest of an adventurer. But unfortunately for him, Metcalfe came to Hyderabad as Resident in 1820. Rumbold, however, tried to bribe the Resident into complicity by sending him baskets of fruits and inviting him to dinners. But Metcalfe was incorruptible. Instead of colluding with Rumbold, he reported against the Palmer Company to the Governor General. This affair however, involved him in a quarrel with the Governor General and Sir William Rumbold, but Metcalfe was ready to sacrifice their friendship for what he considered to be the prestige of the British Government.

Metcalfe's reports against the Palmer Company prompted the Court of Directors to issue orders revoking the license granted to the firm by the Government of India. The strictures passed by the Directors also led to Lord Hasting's resignation.

Thus the Nabobs in the Deccan, as in other parts of India, by their acts of depradation, left an exploited peasantry, an improverished treasury and helpless rulers.

SHAHID ALI KHAN
IIIrd. Year Arts.

---

polishing shoes. The following verses were composed about him by the satirists of the age. They depict a typical 'Nabob.'

> "When Mackreth served in Arthur's crew,
> He said to Rumbold, black my shoe;
> He humbly answered, 'Yea-Bob,'
> But when returned from India's land,
> And grown too proud to brook command,
> His stern reply was 'Na-bob.'"[8]

Our narrative would be incomplete without a glance at the conditions in Hyderabad, though of a slightly later date. Hyderabad was "a great congeries of diseases. Nothing seemed to flourish there except corruption .... the wretched people were dragooned into submission, and the required payments extracted from them at the bayonet's point or the sabre's edge."[9]

The Nizam's service, civil as well as military, was very highly paid. His finances were unable to allow this for long. To his help, therefore, came William Palmer and Co. They lent him £ 20,000 a month at the enormous rate of interest of 25%. One of its chief partners was Sir William Rumbold (not to be confused with Sir Thomas Rumbold, the Governor of Madras previously mentioned), who was a relation of the then Governor General Marquis of Hastings. Following the example of Benfield he glanced over the map of India, saw Oudh and the Carnatic over-supplied, Mysore was very close to the latter, and Delhi had the conscientious Metcalfe there. So he turned to Hyderabad with all the

8 James Holzman : 'The Nabobs in Eng.'

9 Kaye : Life of Metcalfe.

This was the direct result of the usurions dealings of the 'Nabobs' in the Carnatic. Yet Paul Benfield wielded such influence with the Directors and in Parliament, that being twice dismissed in 1770 and 1778, he managed to get reinstated. When Cornwallis assumed office in 1785, he investigated into the Arcot debt, and having deported Benfield, arranged for the debt to be paid in annual instalments. Thus this enormous debt whose interest alone amounted to £623,000 annually, was paid off. But no sooner was this done than another was secretly accumulated by the suicidal policy of Nawab Mohammhd Ali. However no settlement was reached till 1830.

Having now got a glimpse of the affairs in the Carnatic, we shall turn to Madras about which the historian Thornton wrote :—

"the moral atmosphere of Madras appears at this time to have been pestilential."[7]

We have already seen how Madras was greatly influenced by the 'Nabobs' at Arcot. Lord Pigot who had opposed them was imprisoned by his subordinates. He was succeeded by the notorious Sir Thomas Rumbold who invited the reluctant Nawab Mohammad Ali to a christening party and extorted from him as a price of the invitation no less then 15 lakhs of rupees.

In the haughty Sir Thomas Rumbold we have the typical 'Nabob.' When the 'Nabobs' were denounced in England and satirised by writers, a story was current that this man had begun life in a more honest way, by

[7] Thornton : Hist. of Br. Empire in India Vol. II. p. 247.

The Governor of Madras, Lord George Pigot, attempted to restrict the activities of the Benfield gang. He dismissed Sir John Macpherson, who was later to become Warren Hastings's Successor to the Governor-Generalship. This interference was not at all welcome, and the all-powerful money-lenders went so far as to seize the Governor himself, and imprisoned him in 1776. Lord Pigot died in prison a year later.

Thus the creditors did as they pleased. But the whole burden of this high finance fell on the peasantry who sank deeper into misery. The gloomy palace at Chepank caught the faint sound of their distant murmur but it was helpless. Driven from their lands, the peasants turned to dacoity, and plundered the whole country. Law and order was thus disturbed. The creditors of the Nawab got grants of land, and the peasantry there was skinned most thoroughly.

To add to this, the thoughtless Nawab, at the instigation of his unscrupulous creditors, attacked Tanjore, and went as far as the boundaries of Mysore. Haidar Ali, the ruler of Mysore, indignant at the Nawab's behaviour, attacked and laid waste the Carnatic with a thoroughness that is beyond words. Burke in his usual, though sometimes exaggerated, rhetorical outbursts says of this invasion :—

" Thus ensued a scene of woe, the like of which no eye had seen, no heart conceived, and which no tongue can adequately tell .... A storm of universal fire blasted every field, consumed every house, destroyed every temple."[6]

[6] Quoted by Thompson & Garrat p. 148.

Thus it was the age that produced the 'Nabobs'. They grew rich through presents and bribes, by rack-renting and tax-collecting, and above all by money-lending at usurious rates of interest.

In the Deccan, the Nawab of the Carnatic was their main target. They gathered round him as do flies round a honey-pot. The Walajah borrowed money from them. Day by day his debt increased and the creditors began haunting his palace at Chepauk. The master of the house, a tall and dignified figure, with "no mark of distinction but a truly majestic countenance, tempered with a great deal of pleasantness and good nature,"[3] sat watching the long, never ending procession of his creditors, through the faint spirals of a beautifully decorated hookah. Orme though fully conscious of the Nawab's weaknesses, wrote, "I pity no man on earth so sincerely as I do this Nawab." [4]

The money lent to the Nawab was at the rate of about 36% to 48% interest. Unable to repay the debt, he assigned grants of land to his creditors in lieu of cash. One of these creditors, the notorious Paul Benfield, an engineer[5] in the company's Service, had thus obtained extensive lands for himself in the Carnatic. He himself had lent the Nawab a sum of £230,000. In order to be able to recover the money soon, his creditors began encouraging the incompetent Nawab to seize the territories of his neighbours, and to attack Tanjore, which was a peaceful neighbour and also an ally of the Company.

[3] Dr. Ives : 'A Voyage to India'. pp. 73-71.

[4] Quoted by Spear. p. 131.

[5] Thompson and Garrat say in Rise & fulfilment of Br. Power in India (p. 188) that Benfield was jounior architect.

country they were ostracized by the people, decried by the Parliament and condemned by the Ministers of the Crown. They were also depicted in the satires of the age, and were denounced as the "plunderers of the East." The first play written about them was Foote's "The Nabob" in 1771.

In England the directors of the Company were harassed by young men eager to get a post in the Company's service as writers or clerks. Huge sums were offered to anyone who would give such a post. Holzman quotes an advertisement appearing in the 'Public Advertiser' in England :—

"WRITER'S PLACE TO BENGAL. WANTED a Writer's place to Bengal, for which one thousand guineas will be given. There is not a third person in the business and the money is ready to be paid down without any written negotiation."[2]

Those who came to India went back almost millionaires. The rising influence of the Company at the courts of Indian Princes, and their conquests, left them entire masters to handle the wealth of the country as they liked. Then again the corrupt age left few that were really unscathed, honest and above temptation. "Am I not worthy of praise," asks Clive while speaking in his own defence, "for the moderation which marked proceedings? Consider the situation in which the victory of Plassey had placed me! A great Prince was dependent on my pleasure; an opulent city lay at my mercy; its richest bankers bid against each other for my smiles; I walked through vaults which were open to me alone, piled on either side with gold and diamonds and jewels! Mr. Chairman, at this moment I stand astonished at my own moderation."

[2] James M. Holzman : 'The Nabobs in England.'

taking of bribes and presents easier for the Company's servants, most of whom were adventurers pure and simple, their chief aim being to enrich themselves. Mr. Spear writes, "during the Transition Period (1750-85) the servant with his connexion with politics and intercourse with the real Nawabs, quickly acquired the taste for being an Oriental Prince. He became a 'Nabob' in ideal, and commerce was the only method by which he obtained the necessary wealth."[1]

His aim was to live like an Indian Potentate, and the end justified the means. Moreover the salaries of the Company's servants were amazingly low. In Madras, the Governor, whose political status was that of a ruling Prince, received £300 per annum ; a member of his council got between £40 and £100 a year ; junior merchants received £30, factors £15. and writers only £5 annually.

The servants, especially the writers, could not be expected to live in a foreign country on so low an income ; neither could this meagre salary induce people to undertake the long, uncomfortable, and not always safe voyage to India, had it not been for the private trade which these servants were allowed to carry on under the monopoly of the Company.

This private trade and the bribe-taking at the courts of the Indian Princes, made these ordinary servants immensely rich in a short time, after which they returned to England to settle down as country gentlemen. Some of them also got elected as members of Parliament. But their extravagant behaviour, and the shocking sight of these upstarts returning with immense wealth to their mother country, earned for them the sarcastic title of 'Nabobs.' These 'Nabobs' were not an uncommon sight in England after the Battle of Plassey. In their own

[1] T. G. P. Spear ; 'The Nabobs.'

THE NABOBS AND THE DECCAN

The usual rhythm of Indian history which compelled the alternation of the two diametrically opposite forces, the centripetal and the centrifugal, caused the great centralisation under the Moghuls to degenerate into anarchy under their weak successors. All the forces of disintegration were let loose. The period of systematic administration was followed by one of confusion and chaos, of adventurers and 'Nabobs.'

Thus the eighteenth century India was marked by endless corruption. The Moghul power was broken by the Moghul Viceroys, the Viceroys gave way before the rising Marathas, and the Marathas suffered a shattering blow at the hands of the Afghans on the battlefield of Panipat. Thus each was struggling against the rest. National consciousness and patriotism were unknown, and the people had degenerated into a petty-minded lot. Hence the India of those days was an adventurer's paradise. The English soon took advantage of the confusion, ousted the French, and were well on the way to power in Bengal and the Carnatic by about the middle of the eighteenth century.

The growth of the East India Company's political power naturally gave an impetus to its trade. The Company's trade began to flourish and it drew greater attention in England. More and more people enlisted in the Company's service, and came to India to share its fabulous wealth.

In the Deccan the growing influence of the Company in the Carnatic, and later on in Hyderabad, led to a closer contact with Indian Princes. This made the

it into a *sublime* one by his clear insight and sanity He is a great literary artist. His style is polished, restrained, pure, and brilliant. He is sensitive but not sentimental. His short graceful sentences are logically knit together and his essays, as a whole, have unity of impression.

Now-a-days periodicals are abundant and every writer contributes something or other to them. They are serving as channels to the public through which they get the outpourings of the literary genius.

The contribution of the periodicals and newspapers to the English Language is indeed great. The papers contain an ephemeral kind of matter. The writers have to adopt a very simple and lucid style, so that the readers might follow them very easily. But the periodicals have also exerted a bad influence on the language. They generally adopt a coarse and colloquial style and have introduced many cant words.

S. M. TAQI HASHIMI, M. A. (ECON)
M. A. (Eng.)

He contributed his short storios to several other periodicals. His prose style is concise, vigorous, picturesque, and fast-moving.

G. K. Chesterton began as an art critic and collaborated in reviews. His essays are philosophical. His style is pleasant, unexpected, varied, piquant, paradoxical and at times obscure.

Belloc's essays, which appeared in several magazines, treat the commonplace in such a way as to make it fresh and novel. The author embroiders an unsubstantial matter with the most profuse arabesques, feels and reveals the beauty of the earth, "the unexpectedness of familiar prospects, the wealth of life." The result is that Belloc's essays simply amuse us; they do not instruct us. But the author's paradoxes are more careful than those of Chesterton; his manner is freer from tricks; while he has not the same vigour, he possesses a more varied and surer charm of expression.

G. B. Shaw began as a journalist. First he was an art critic and then dramatic critic of the "Saturday Review" (1895-98). His dramatic opinions aud essays were collected in 1906. His style is simple, humorous, saracastic witty, and ingenious.

Galsworthy too contributed some essays to several periodicals which were collected, later on, under the titles of "The Inn of Tranquillity" and "A sheaf." His style is simple, direct, colloquial, and straightforward.

Robert Lynd reminds one of Charles Lamb. His essays, especially those in his "Pleasures of Ignorance," are amusing, fanciful, graceful, lucid, and witty. The materials of his essays is the thinnest, but he transforms

one of the chief features and sources of profit of most periodicals. Periodicals of the "Tit-Bits" type, the cheap novelette, and cheap papers for women have enormous sales. Vast numbers of periodicals are issued weekly in Britain, chiefly by the Amalgamated Press, Ltd., established by Lords Northcliffe and Rothermere; George Newnes, Ltd, and C. Arthur Peason, Ltd., which are associated; and the Oldhams Press, Ltd., The periodical press of Britain is gathered together in the Periodical Trade Press and Weekly Newspaper Proprietor's Association Ltd.

The modern periodical essayists are Samuel Butler, James Thomson, William Ernest Henley, Kipling, Chesterton, Belloc, G. B. Shaw, Arnold Bennett, Galsworthy, and Robert Lynd.

Samuel Butler contributed several humorous essays to several magazines on Darwin's theory of Evolution. He was more an essayist, a moralist, a critic, and a philosopher than a novelist.

James Thomson published his polemic articles and essays in the "National Reformer." His style is sober, lucid and concise.

Henley directed the "Outlook" and "National Observer," and published in them his essays on literary and artistic criticism which were collected, later on, in two volumes of "Views and Reviews." As a journalist and critic, Henley was a fighter. His judgments were opinionated, often severe, and more brilliant than persuasive. His work and manner attracted young talents.

Kipling took up journalism in the early part of his literary career in India. He was first employed in the "Civil and Military Gazette" and later in the "Pioneer."

Charles Dickens edited fiction-periodicals, "Household Words" and "All the Year Round," in which he was assisted by Mrs. Gaskell. He published in them his novels and stories in serial form. Mrs. Gaskell contributed short stories and a novel of provincial life; "Cranford" (1853) to these periodicals. Other novelists who collaborated in or contributed articles and tales to periodicals were Thackeray, who edited the "Cornhill" and published critical articles, fantasies, short tales and novels in "Fraser's Magazine," "The New Monthly," etc., and George Eliot, who collaborated in "Westminister Review." Other periodical essayists were Froude, who collaborated in radical reviews and edited the "Fraser's Magazine" (1860-74); Thomas Hood, who was the sub-editor of the "London Magazine;" Dante Gabriel Rossetti, who collaborated in "The Oxford and Cambridge Magazine" (1856) to which William Morris contributed his poems and prose tales and Christina Rossetti, who collaborated in "The Germ" (1850).

George Meredith collaborated in several periodicals, among them the "Fortnightly Review," which he directed for sometime.' His style is unexpected, vigorous, compact, symbolical, Latinised, concrete, and strained to a degree which the average mind can not long bear.

In modern times the peridicals are innumerable. They have become part of our daily lives. In Britain the number of the periodicals is estimated at over 3000, while America claims nearly 5000. The total number in the world is estimated at 13000. Every interest in life is catered for by some periodical or periodicals—from dancing to mid-wifery—and the advertisement pages are

variety, yet lacking the absolute simplicity and naturalness which could relieve it from a suspicion of artifice, grandiloquence, or occasional lapses in good taste.

Carlyle contributed several critical essays which attracted attention in the reviews. His "Sartor Resartus" appeared in "Fraser's Magazine" (1833 - 1834). His *periodical essays* were especially on subjects connected with German literature. His style, with its enormous wealth of vocabulary, its strangely constructed sentences, its breaks, abrupt turns, apostrophes and exclamations, is unique and personal. Though it is at times uncouth and even chaotic, it reveals Carlyle as one of the greatest English literary artists. In his mastery of vivid and telling phraseology, he is unrivalled. His descriptive power and power of characterisation are alike remarkable. He employed sarcasm, irony, and invective with tremendous effect, while he was capable of rich and abundant humour.

Newman also wrote critical and historical essays which he contributed to various periodicals. His style is strong, elegant, supple, oratorical, eloquent. He knows how to use irony and excels in explaining the conflicts of the heart or the most subtle theological problems.

Ruskin contributed his essays on sociology and economics to several periodicals. His style calls for the highest praise; and alike in the rich ornate prose of his early and in the easy colloquialism of his later writing, she is in the front rank of the greatest masters of English prose. A special feature of his style is his marvellous power of word-painting.

society of Edinburgh, he collaborated in Scottish and London reviews. The 17 volumes of his collected works consist mainly of essays on a large variety of subjects. His criticism is creative. His writing is often marred by glaring defects; he had a habit of abusing his extraordinary learning and of sinking thereby into obscurity and pedantry; in argument, while wonderfully subtle, he was frequently captious and trivial; and he continually indulged in huge unwieldy digressions. His merits, however, are equally striking. His style, at its best, is marvellously rich and gorgeously rhetorical, and he remains one of the chief masters of romantic impassioned prose.

The chief periodical essayists during the Victorian age were Macaulay, Carlyle, Newman, Ruskin, Dickens, Thackeray, Meredith, and Stevenson.

Macaulay opened his career of extraordinary and varied success with an essay on Milton in the "Edinburgh Review," for which he wrote steadily afterwards. His critical and historical essays were collected in 1843. The essay gave him a freer scope than the history. "The substance of his 'Essays' is thinner, and in certain cases has been found to be inconsistent; they have their defects of injustice, of superficiality; but in compensation, when the theme suits the temperament of the author, then their merits are striking; and even when the reader's satisfaction is not unmixed, he derives a very great pleasure from their pages." Macaulay's style is brilliant, fluent. clear ,and yet enhanced by individual touches, skilful anitheses and sparkling epigrams; at one time periodical, at another condensed into short and pithy sentences; clever enough to display flexibility and

in which he upheld Radical ideas; he was imprisoned for two years (1813-15) for attacking the Regent. He edited afterwards the "Indicator" (1819-21). He sojourned in Italy (1822-25), where he launched with the help of Byron a periodical, the "Liberal," which proved a failure. He contributed many critical essays to the "Companion," the "Tatler," "Leigh Hunt's London Journal," the "Edinburgh Review," etc. "He freed the essay from a too strait-laced tradition, brought it closer to the realm of journalism, and made it an instrument of unlimited resources." But his style, though charming, witty, and fanciful is diffuse: its merits, verve and humour, suffer from his crushing comparisons. As a critic, though he ranks below Hazlitt and Lamb, he holds a distinctive place among the men of his time. He *inaugurated theatrical criticism*. His tendency was towards romanticism. His taste was correct and eclectic, and his sympathies were broad.

Hazlitt for a time devoted his whole attention to journalism. He collaborated in the "Morning Chronicle," the "Edinburgh Review," the "Examiner," etc., published several collections of essays ("The Round Table," 1817; "Characters of Shakespeare's Plays," 1817. "A review of the English Stage," 1818: "Political Essays," 1819). Though irascible, petulant, full of crotchets and intense personal prejudices, he was by far the best-equipped and the *most satisfactory critic of his day*. *His method of criticism was psycho-analytical*. The manner of his writings is some what discursive. His style is forcible, spontaneous and sincere, but it is marked by repetition and prolixity.

DeQuincey devoted himself largely to essay-writing and occasional compositions. Mingling with the literary

The first and foremost place, among the periodical essayists of the 19th century, should be given to Charles Lamb. His essays are a land-mark in the history of English essay-writing. With him the egotistical element comes in and becomes a permanent feature of the modern essay. Like Montaigne, he draws the substance of what he writes from himself, his experiences, reminiscences, likes, dislikes, whims, and prejudices. But his subjectivism has no fanatical egoism about it; one discerns in it the shrewd detachment of a critical mind. Johnson's essays were impersonal and moral, the essays in 'The Spectator' were subjective and objective combined or they were not frankly personal; but Lamb's essays are obviously autobiographical. So far about his general essays. *His critical essays* reveal him as a strong supporter of Romanticism and especially the Romanticism of the retrospective character. He had an enthusiastic admiration for the old-time authors of the Renaissance and the 17th century, particularly the Elizabathan dramatists. His essays, in general, are full of fancy and wit. His style though peculiarly his own, is flavoured by constant contact with his favourite writers, Burton, Fuller, and Sir Thomas Browne. It is humorous, paradoxical, ingenious, touching, poetic, pathetic, and eloquent. Lamb is a supreme artist. His style is varied; it ranges from the pun to the loftiest eloquence or suggestion. He shows artistic restraint in a degree which makes his mode of expression marked by classicism and romanticism alike. He contributed his essays to different reviews, but the series of essays signed "Elia" appeared in the "London Magazine" from 1820 onwards which were collected afterwards in a volume (1st. series, 1823; 2nd. 1833).

Leigh Hunt was a regular periodical writer. He founded with his brother, John, a review, the "Examier,"

owed their success in no small degree to competitions in which large money prizes were offered. As time passed these competitions have become increasingly popular. They now form an outstanding feature of periodical journalism, and have been adopted by periodicals and newspapers in all parts of the world. To Sir George Newnes belongs the credit of being the founder of this type of circulation raiser. Fiction periodicals have long held a leading position in the periodical world The "Family Herald" (1843) and the "London Journal" (1845) had large sales at a time when big circulations were few and far between. Charles Dickens established "All the Year Round" in 1859, and in this periodical appeared many of his stories in serial form. The "Cornhill" was started about 1860 under Thackeray's editorship. It marked a new epoch in high-class periodical literature. In 1891 Sir George Newnes published the first modern illustrated magazine, "The Strand," which has been copied in all parts of the world. For years past much of the best fiction has first appeared in serial form in various magazines. This has led to developments greatly to the advantage of authors.

Many of the prose-writers of the 19th century were regular periodical writers, and some of them gave the whole of their time and energy to this form of literature.

The periodical writers of the 18th century wrote in the classical style-the style characterised by lucidity, grace, and charm. But the periodical writers of the 19th century, particularly those who lived in the Romantic age, wrote in quite a different style—the style marked by variety, warmth, colour, strength of passion, and depth of feeling.

counter-blast. William Gifford was its first editor, and on his retirement in 1824 he was succeeded by Scott's son-in-law, Lockhart. These were followed by two important magazines the range and interest of which were intended to be broader and more varied than was the case with the regular review—"Blackwood's Edinburgh Magazine," a Tory monthly launched in 1817 by Wilson, Lockhart and Hogg: and shortly afterwards, as its rival, "The London Magazine," which included among its early contributors Lamb, Hazlitt, DeQuincey (who was also a "Blackwood's" man), Tom Hood, Allan Cunningham and Carlyle. The "Westminister Review" (1824), directed by Bowring and James Mill, and Cobbet's "Weekly Political Register" (1802) were the organs of the philosophical Radicals and the popular Radicals respectively.

Other well-known periodicals were "Fraser's" (1830), the "Nineteenth Century and After" (1877), the "Contemporay" (1866), and the "Fortnightly" (1867). All these periodicals were devoted to critical comment on public events and literature. Again, there were numerous periodicals of a more or less educational character, such as the "Mechanic's Magazine," "Chamber's Journal," the "Penny Magazine," and "Cassell's Popular Educator." In 1881, the periodical world was revolutionised by the appearance of "Tit-Bits," designed and edited by Sir George Newnes. The chief features of this publication were the pith, brevity, and human interest of its paragraphs, and the introduction of new features such as "Answers to Correspondents." "Tit-Bits" was followed in 1888 by "Answers" established by Lord North Cliffe (then Mr. Harmsworth), and in 1890 by "Pearson's Weekly," established by the late Sir Arthur Pearson (then Mr. Pearson). These publications

in personal abuse. It was the type not the individual that he assailed. In his hands, the essay assumed literary character. He formed English prose. He found out a style which was best suited for the essay. "The Spectator" is one of the fore-runners of the modern English novel, for it contains brilliant character-sketches and themes best suited for the novel.

The next important periodicals are the "Rambler" and the "Idler" started by Dr. Johnson, which try to carry on the tradition of the "Spectator." The periodical essays of Johnson are moral and philosophical. The style is ample, imposing, oratorical, cast in a uniform mould. But we miss that grace, the lightness of touch, and that genial humour which we find in "The Spectator" and which is the essence of the periodical essay. Johnson's moral philosophy interests the specialist, but Addison's entertains the common people.

Thus, the 18th century gave birth to the modern periodical. We have examined "The Tatler," "The Spectator," "The Rambler," and "The Idler." There was a host of other papers which, for practical purposes, are not significant, except the "Gentleman's Magazine," issued in 1731, which first established the British type of magazine.

The marvellous progress of various sciences and arts, the diffusion of education and culture among the masses, and the facilities of communication, during the 19th century, gave a fillip to journalism with all its varieties. First came the "Edinburgh Review," established in 1802 by Jeffrey, Brougham, Sidney Smith, and other prominent men of letters of the Whig party. Seven years later (in 1809) the "Quarterly" was started as a Tory

philosophy, serious or humourous reflection. As Bickerstaff represented Steele in "The Tatler," so Mr. Spectator represents Addison in "the spectator." The Coverly papers, the critical essays, and the essays on social philosophy constitute the paper.

In view of the professed object of "The Spectator"—to bring "Philosophy out of closets and libraries, schools and colleges, to dwell in clubs and assemblies, at tea tables and in coffee houses"—the last constituent is the most important of all. The object of the paper was to combat ignorance and affectation and folly and impurity, Addison and Steele "discuss the art of living together, the duties of family life, the rules of true gallantry, the status and part of women in society, the laws governing the toilet, amusements and reading." They ridicule duelling and extravagant head-dresses and foibles of the age. In short, the paper possesses an historical value as the best of all side-lights on the London of Queen Anne. Here we have a series of individual sketches. Like "The Tatler," the paper shows us a club of original figures; but in this case the types are developed. Sir Roger deCoverley, Will Honeycomb and Sir Andrew Freeport are very famous characters, the first having taken its place among the best known creations in literature. Addison's religion is humanised Paganism as Steele's in "The Tatler" was humanised Puritanism. Both the authors teach the repression of self-love; in this ideal "The best essence of stoicism is mixed up with the principles of Christianity." Addison's style is urbane, elegent, polished, direct and graceful. His humour is tender and charming. His irony is gentle; he uses the device of feigning sympathy when he attacks folly. His urbanity and fine taste do not allow him to indulge

women in the 18th century. The portrait of Lady Elizabeth Hastings is very famous, for the Lady is represented as having so high and graceful passion that "to love her is a liberal education." Besides this, its object is moral reform. Like the "Spectator," it aims at "a compromise between the aristocratic temper of moral freedom, which the Restoration had carried to a licentious excess, and the Puritan spirit, which the excesses of the Commonwealth had brought into disrepute." It expounds, to some extent, the doctrine of Rousseau-the tender sentiments, the family affections, the homely manners, the simple joys of the heart, the healthy sadness of regret and of memory, and conjugal love. The heroine of its domestic sketches is Jenny Staff, who is Bickerstaff's half-sister. Steele was on the eve of the discovery of the domestic novel. His was a fertile mind. His humour was tender and persuasive. He was careful in sustaning the interest of his readers. But he was wanting in care and self-con- His essays, though spontaneous, are of a rather loose pattern. The satire, and the portraits, are a little sketchy and superficial.

It was Addison who removed the deficiencies of Steele and brought the periodical essay to its perfection in his "Spectator." The paper was started in 1711 and ended in 1714, though it did not appear for 18 months during this period. Now Addison was its chief editor and Steele his joint editor. The paper, in its complete form, contains 635 essays. Of these Addison wrote 274 and Steele 240, the remaining 121 being the work of various friends. This periodical neglects the happenings of every day, save now and then, by an odd allusion; it gives itself entirely to a daily essay on morality, literature,

cause of religious toleration and social uplift. At first his "Review" appeared twice a week, and later thrice a week It was written wholly by himself. The Review was a very important thing in the coffee houses of that time. Through the coffee house it exerted a great influence on the public. Defoe's "Review" is a splended document of the social history of the period, 1704 to 1713.

Swift was also a periodical essayist. He had been a contributor to the "Athenian Gazette." He was for a time the editor of the "Examiner" which Bolingbroke had started. He is famous for his political, religious, and literary pamphlets. His style was plain and unornamented, clear and straightforward, it is always saved from being monotonous by the presence of irony.

It is Steele's "Tatler" which may be regarded as the first modern periodical. In 1707, Steele was made editor of the "London Gazette," but in 1709 he founded "The Tatler" which ran for two years, ending in 1711. Addison cooperated with Steele in this paper. It appea thrice a week. It was an improvement upon Defoe's "Review" and the "Athenian Gazette." It was divided into four heads—gallantry, poetry, learning, politics, and the editorial. Steele speaks through a character, Bickerstaff, who is a detective and probes into the secrets of others. Its chief aim is the reform of manners and to bring, in a series of imaginary portraits which conceal real originals, to the notice of the public and of the guilty people themselves—"the errors of vanity, egoism, and extravagance which disturb the pleasant and decorous order of social intercourse." This work is analogous to that which the "Salons" and circles of the "preciesus" had accomplished in France during the 17th century, It matured and consolidated the position of

people of England." It was the minister Harley who made use of him when Queen Anne ascended the throne. Defoe, being tradesman, had travelled much and had probably visited Spain, Germany, and the South of France. He seems to have taken some part in Monmouth's rebellion. He issued many tracts in favour of King's William III's policy towards France. He was opposed to the high-handed Tories. He stood for the introduction of a parliament uncontrolled by money lenders and businessmen. He was the vanguard, as it were, of the labour party. In short, he took part in many political movements. He was a past master in making use of a psychological moment. In 1703, he was arrested and pilloried. The populace hailed him as a hero. He was high minded in his attitude towards public matters. In the latter part of his life, he was dependent upon the bounty of Harley and stood before the public as a mercenary journalist. Some of his admirers say that he was a social reformer, but it is uncertain. It is his "Review" which may be regarded as a land-mark in the history of the periodical. It began with the connivance of Harley. The paper was thought to be the organ of the commercial middle class. Although Defoe's satirical discussions on current topics may have given hints to Steele and Addison, his chief contribution to journalism was the abolition of the dialogue form and also a tone of partisanship. What he did was to adopt a straightforward style, and aimed at correctness and moderation. His aim was to persuade his readers rather than to stir their prejudices. He changed sides with the change of parties. He was an advocate of the war of the Spanish Succession. He helped to bring about the union of Scotland and England. He was the champion of the

uncensored, for the benefit of the upper classes, to supply the defects of the official prints. They had attained public esteem more than ever. The liberty, of the press was beginning and the modern periodical was born. L'Estrange was Defoe's prototype, since he was an indefatigable pamphleteer and man of letters. He was a Royalist. He attacked scurrilously Milton and assailed the Earl of Shaftesbury. Later he found himself involved in the controversy of the Popish Plot. His important political paper was the "Observator," in the form of questions and answers or in the dialogue form. The paper defeated its own end by abusing Dissenters, Whigs and Titus Oates. It is interesting to remark that Defoe was probably in London during a large part of the "Observator's" life, and learned a good lesson. Watching it he had determined that if he were ever to edit any paper, he would avoid the dialogue form and extravagance. However L'Estrange's reputation is not due to journalism but to the work of his later years when he was reduced by misfortune to become a bookseller's hack. During this time he translated many books, important among these is "Aesop's Fables." L'Estrange's circle consisted of Bellingsgate, Jeremy Collier, Thomas Brown, and John Dunton. He is famous for introducing colloquialism into writing.

John Dunton edited a small paper, "The Athenian Mercury," consisting of essays on philosophical and recondite matters.

In 1702, Defoe's famous pamphlet "The Shortest Way with the Dissenters" appeared. The date marks the beginning of Defoe's career as a tractarian. Others of his tracts are "New Nest of Church of England's Loyalty" and "The Original Power of the Collective Body of the

which the press was going to derive from it. In 1641, the Parliament encroached upon the rights of the monarch and ordered the writers of the 'diurnals' to publish their proceedings under the guidance of a parliamentary clerk. This caused the ruin of the duirnals. It is stated that within a week fifteen diurnals indistinguishable save by their contents appeared every Monday. Samuel Peeke, a professional scrivener, saved himself from ruin by adapting himself to new conditions. He was rather illiterate. Of literary ability was Sir John Berkenhead who started duirnal at Oxford in 1643. Other journalists were John Dillingham, George Smith, Daniel Border, Henry Walker, Morchamont Nedham, etc.

Now we come to a very important name in the history of the periodical, Henry Muddiman, the most famous of the 17th century journalists. His periodical, paper, the "London Gazette" lasts even to day. The important privilege of free postage was given to him. Any one could write to him without using a stamp. This paper was much valued at Oxford and Cambridge. It is the first printed paper the original pamphlet which was in the shape of book, thus giving place to the paper.

Sir Roger L'Estrange supplanted Muddiman for two years until he took the surveyship of the press. He started two periodicals, the "Intelligencer" and "the News" which ran from 31st October 1630 to 26th January 1666. They were only half the size of his predecessors' publications. Muddiman came back in 1665 with the "London Gazette" and L'Estrange was pensioned off. The "London Gazette" continued as a permanent institution and is a net asset of Charle's reign. During this period news-letters were permitted unfettered and

regular postal services. Long before this, statesmen had found it necessary to have a constant supply of news. One of the famous noblemen of Queen Elizabeth's reign, Earl of Essex, had established a staff of clerks in order to provide himself with news. Some time elapsed before English Journalism could call the printing press to its aid. The royal prerogative in the circulation of news, and the regulations of the Star Chamber, the intense religious strife in the country, and other causes combined to prevent the publication of any periodical until 1620 and all journals of domestic news until 1641, when the great rebellion was about to begin.

The "broad-side" ballads, about the battles and the tragical events of the day, which came out of the printing press, mark another stage in the development of English Journalism.

Periodical pamphlets had, however, sprung upon the Continent at this time. These were mostly known as 'Corantos,' a Spanish term meaning 'currents' or 'news.' They were the subject of much ridicule especially in the time of Ben Jonson. These 'corantos' dealt exclusively with foreign news down to 1641. None of them appeared during the years 1632 to 1638 owing to the regulations of the Star Chamber. Then the privilege was given to two persons, Butter and Bourn, for printing foreign news, in return for which they had to pay £ 10 for the repair of St. Paul's. The difficulty of the licences soon followed; 'Corantos' were suppressed, reappeared, and, finally, vanished in the years, 1641-1645.

The News-books or' 'diurnal' of domestic news succeeded the 'Corantos'. The long Parliament of 1641 abolished the Star Chamber, but it never dreamed of the advantage

ENGLISH PERIODICAL JOURNALISM

"The history of Essay-writing," says Henry Morley, "in modern literature begins with Montaigne and then passes to Bacon. Each used the word 'Essay' in its true sense, as an essay or analysis of some subject of thought. Bacon's essay was of life, generally in many forms, with full attention to its outward circumstances. Montaigne's essay was of the inner life of man as it was to be found in the one man's life that he knew." The Essay proper, or Literary Essay, is not merely a short analysis of a subject, not a mere epitome, but rather a picture of the writer's mind as affected for the moment by the subject with which he is dealing. Its most distinctive feature is the egotistical element. The great literary essayists after Bacon are Cowley, Temple, Dryden, Defoe Swift, Johnson, Addison, Steele, Cowper, Lamb, Hazlitt, De Quincey, Leigh Hunt, Matthew Arnold, Stevenson, Chesterton, Augustine Birrell, E. V. Lucas, Max Beerbohm and Robert Lynd.

The important species of the literary essay is the periodical essay. A periodical is a publication issued at regular intervals, but the term does not include newspapers. It is one of the branches of journalism, the other branches being the newspaper and reporting.

The periodical dates back to the seventeenth century. Its origin does not, as we might easily believe, lie in the printing press, but it has to be found in the circular letters sent round after Agincourt and other medieval battles. The profession of a writer of "letters of news" or of "intelligence" dates from the establishment of

dignity, and dissolved the meeting with the same effect as a fire-eating magician accomplishes his feat. Why, were we ever robbed of this pleasure? There must be some mistake. Hoping against hope we enquired about the reality, and finding the news too true, crept back to our rooms like beaten curs.

Sometimes 'Truth is stranger than fiction.'

FEROZE METHA, L.L.B. final.
(Osmania.)

Great Godfery! What was that? Looking at another part of the hall I beheld a truly heart-rending sight. There a poor chap pushed and pulled by two parties of students, to the accompaniment of laughter and mocking cheers from the rest of the house. They were playing with him as a cat plays with mouse or as the not so very old maxim goes; Dictatorship plsys with Democracy. They raged and ranted and a perfect European crisis was born, with Hitlers and Mussolinis taking an alternate bite at the poor victim. But what about the rest of the House. Like the pre-war perfect messengers of peace— Chamberlain and Daladier, they applauded the doings of their companions and joyfully continued singing extempore songs in praise of the culprits.

Soon a dead silence ensued, the calm before the storm, as the P. V. C., the speaker and the ministry elbowed their way through the crowd. It was interesting to note that they more or less followed the same tactics as we did and by their expressions found the exercise not a little strenuous and undignified. As I have said, it was a calm before the storm, and soon a devil of noise was put up as the house was in no humour to hear the doing of Chamberlian and his horde, popular heroes of the time, who might as well boil their heads and burn Democracy for all they cared. The 'proposer' in pain croaked and gesticulated and at last in despair took his seat. There was chaos and disorder everywhere and it seemed as if I were suddenly transported to a zoo, for the noises I heard were so diverse and 'animal like,' ranging from the squeak of a mouse to the roar of a lion; with the presupposed result that the vice-president was forced to resort to the only means at hand, and he did this with much promptitude and

hour, with perspiring bodies on a cold December evening, and cursing the day on which they were born. I saw all this as in a dream, blessing my stars I was still alive and outside the mob, (for they were no better than a mob)—a silent spectator. In despair I half-turned to go, but something stopped me, and after inhaling a large draught of air I blindly rushed in like a battering ram, and for a moment knew not what was happening. A push, a pull, an occasional kick or a well-fetched box were the orders of the day. Being well versed in these games, I wriggled my way, butting here, knocking there, stretched my hand for the door, missed, fell to the ground, was all but trampled, rose and with a final push and a powerful 'heave ho'—found myself on the threshold, let us say of success, 'Master of all I survey', congratulating myself on my good luck and blessing my Guardian, Angel as I had come off with only a bruised finger. Phew! what was a bruise? Fingers did not count at that moment but seats did. I must get a seat, if possible a comfortable one, for I did not much relish the idea of standing, God knows for how many hours, listering to the perorations of the young generation. Somehow I contrived to get one, and after comfortably settling down, surveyed the hall in which I found myself.

There was a restless activity in the hall. "From the moment when the hall began to fill till the moment when it began to empty, the enthusiasts did not cease to plough their way to and fro, as far as the space could allow, in a manner equally reminiscent of a hawk sweeping on chickens and an earnest collegian bucking the line. Consequently these gentlemen were perpetually forming new ententes and combinations."

to bear. We drifted on with sullen dejected demeanour and with little grace and less humour resigned ourselves to the inevitable. The spice of life is motion, variety; in nature nothing is stagnant, then no wonder that in the ocean of ever moving and always shifting phenomenon a fixed speck is rather a sad sight. Alas! it is the tragedy of Youth.

It is darkest before dawn. One day when we were particularly susceptible to the depressing feeling, it was announced that within a fortnight the All India Debate would be held that year at Aligarh. It was a veritable bolt from the blue. It was hailed as a pleasant divergence from the dry atmosphere of the class-rooms. No wonder most of us waited a little impatiently for the 'big' day and hoped to make amends for the past inertia by making most of the present opportunity and living every moment of the period a veritable Saturnalia. Indeed it seemed to be a green oasis amidst the inhospitable desert of 'Inertia'. But life is a curious enigma: mirages in deserts are not uncommon and this might as well turn out to be a cruel mockery of the fate—of course on a miniature scale.

At last the momentous day dawned. As I had nothing particular to do that evening and as I had also been feeling a little change necessary, I with others drifted to the Union Hall after taking a cold refreshing bath as I knew too well that in a short time I would be a little too hot for my comfort. There I found our little Union Hall more closely packed than sardines with the surplus of unacommodated gentlemen gazing ruefully at their lucky brethern from closed windows. But theirs was not an enviable lot, packed as they were for an

effect on his sophisticated master, who attributes his roars to the fact that the former king of jungle is either loath to insult the inside of his tummy by keeping it empty or otherwise engaged in the harmless occupation of vocal exercise. With a knowing smile that gentleman throws a few morsels of flesh to be soon lost in the bowels-of His ex-Majesty. But the roars continue as before.

Fortunately or unfortunately man is endowed with intellect and imagination of a'superior order to that of the lion. Consequently man may soar to the highest height or sink to the lowest depths. I did the latter on a particular day in the month of December in the year of Grace 1938.

At that time I was a resident-student of Aligarh University. Life at Aligarh is usually a crowded affair. Ever and anon something unusual crops up giving a little innocent pleasure to the student-community, ranging from a mild political scuffle to an outright strike against the authorities. This has the desired effect of keeping these hot-blooded gentlemen from indulging in mischief of a more serious nature. As if this were not serious enough!

But the month of December was a particularly dry one. Nothing ever happened to relieve the dull monotony; imbuing even the sunniest spirit through and through with a sable tinge and stealing the pith and availability out of whatever enterprise he might dream of undertaking. Every day succeeded its predecessor with such clock like regularity and resembled its successor so strikingly that it was a little hard for most of us

A PEEP IN THE PAST

I wonder how many of my readers have seen the inside of a gaol. Of course I do not mean it as a compliment; by my surprising query I do not for a moment expect my readers to be actual gaol-birds, certainly not; but what I do want to know is whether any one of them ever had that depressing, helpless feeling which is the peculiar lot of the poor sinner who has a difference of opinion with the arm of Law. Consequently he finds himself an unwilling guest of the Government which provide him with a mansion specially constructed to welcome gentlemen of his calibre.

Without entering into the painful details of the pros and cons of these legal restrictions let us dispassionately inquire into the feelings of this social outcaste, in the admirable manner of a scientist dealing with a particularly ugly specimen of nature's handicraft. He, the sinner and not the scientist, may be penitent or revengeful. But neither remorse nor sweet dreams of vengeance will make him actually happy. If my learned reader is versed in carnivorous dialect he will find a like sentiment expressed by a caged lion. He seldom bothers to gloss over or conceal his resentment about the restrictions imposed on his movements by the grim looking spikes of the cage. He gives vent to his inner feeling in the charecteristically lionesque way. He lets out his awe-inspiring roar-a battle-cry which had struck fear in the hearts of the denizens of his past domain in the 'pre-conquest' days. But this has not even a pin-prick

world once again with peace and hope as hot and fervoured as the spirit of youth itself and would stand unmoved on the rock of faith acclaiming all life as one grand and basic principle.

M. A. QAYYUM KHAN BAQI, M. A.
Research Scholar.

The hope of Emerson was founded on the only element of which, in the last analys is, we know anything at all ; that personality, that soul (it matters little what we call it), that individuality through which alone we can approach the universal soul ; for it is not true to say that we, who are part of reality, can only know fleeting appearences of the world. We have our own private wicket-gates in ourselves through which we can pass at will into the eternal world.

We cannot transcend our limited spheres of action in the flesh. We are like travellers on a ship who have freedom to walk east, west, north or south on its deck, while the ship pursues her own course, bearing us to an end of which we know nothing except that the ship is being steered by great laws. Occasionally we overhear the orders that are being made around us, even if we do not understand them we hear commands given in the night. And this we do know—that if the meaning goes out of everything, if the good, the true, the beautiful become a mocking by our abandonment of our belief in their eternal significance, or by the assumption that the voyage has no aim, and the ship no steersman, then it is the duty of our own souls, and the part of our human reason, to make the opposite assumption (act of faith though it may be) and to say to our fellow travellers : Hope. For a meaning is the one thing needful the one thing that even our limited reason cannot forgo : We cannot accept the reason revolts from accepting the suggestion that the universe is a gigantic game of bubbles blown by an imbecile and unwitting power. It is the failure of our own vision of the Universe that makes such a suggestion possible—though again and again in modern leterature a *literature moving along narrow lines of specialized thought*, this suggestion is logically implied. Even in the depths of our agrosticism, and God knows they are deep enough there are certain things that we ourselves do know. We know a little of human love. We know that it is a better thing than the dust, and that by every law of thought, the greatcan never be originated from the less or subjected to it."

The value of such a hope and love is undeniable. Would it be that our young conception of life be redeemed from its chaotic and material bondage and inspire the

How is it that our vision of cosmic unity is blurred? We have forgotten Nature as a law, and discarded life as a basic principle which never changes.

Most of our young men, poets, politicians, scientists and philosophers talk of their own principles. Some justify Socialism, and define it as a balance of the inequality of life. They say men are poor and men are rich. They denounce the Capitalist, they rage against the Mill-owner, and they pat the rugged shoulders of the Husbandman and the Labourer. Some acclaim War and all its devastations. Some fragments of our political idiosyncrasies contain loud slogans of Liberty and franchisement. Other parts of scientific or literary activities expound high sounding theories of atheism and distrust. It seems we have transformed ourselves again into Protestants or political fanatics. Most of us debate against Democracy and Dictatorship. Let it be so. Let modernism be a protest-but let it not be a negation of the basic principle-a denial of one eternal force. Let progress be a substantial change but not a life-long displacement. Let us analyse the features of life, but let us not operate upon the oneness of life.

To our young friends I would like to ask one more question. Be it all as they like, but with what hope do they inspire us? Like Emerson, have they got anything to contribute towards longing of peace, trust and faith. *Are they able to keep open the gates of knowledge within our souls?*

While presenting to us that hope which the great American writer inspired through his work, Alfred Noyes writes few words of wisdom. Let us read him—Says he—

"We are all engaged in a war of not-truths but half-truths," our vision of human existence splits up into huge masses of intellectual, moral and religious idealism. Our language-which in its essence is but a representation, a symbol of ideas and feelings, breakes up into a tumult of phrase and terminology. God, Life, Death, the Universe and Man-all of them are interpreted in terms of speech and fashion. We have become pro-pessimists, and are averting the realities and causes of our present afflictions in different but superficial ways. Our abiding word is not hope but despair. I know, we cannot help it. But what of Nature as one unconquerable force-as a law, a principle and an eternal unity? It is a vast ocean indeed, and our thought, though as vast as Science or Philosophy, is but a drop of that vast ocean-a dark spot over the entire light of eternity.

Let us pause here for a while and think. Then ask a question-Despite all our wealth and enlightenment of modern knowledge, do we enjoy a unity of vision? Do we start from a central point, and end our journey at a certain and definite goal? Do we consider life as one complete whole, " round and perfect as a star?" Do we acknowledge it as one principle, one guiding force? To me, the answer unfortunately comes as a big No. Then what of our academic claims, institutional obligations, and political encroachments? Are they all but acrobatic tricks? What of our Wars and Revolutions. Are they aimless and de-centralized. We have used the pinhole camera to visualize the material side of things, but have we caught the glimpse of golden light beyond the horizon? We have chased truth like children chasing butterflies, but it seems we have lost ourselves in the wilderness. To us life is a revolution instead of an evolution.

"LIFE AS A BASIC PRINCIPLE"

Our uneasy world comments upon life in her own way. Any of our so called "moderns" are accustomed to define and criticize life in terms of Industrialism, Socialism, Communism and Capitalism. Others have Psuedo-religious or spiritual basis of thought; when they speak of modern life, they speak of it as a loss—a deprecation in balance of thought and feeling. Our researches in Science strengthen our mundane vision day by day—they materialise our dreams. When Science raises her eyes covered with convex or concave lenses of insight and experminent, and remarks upon the most subtle or evanescent phase of human life, she tinges it with some shade of matter, and throws upon it some particle of dust.

I pondered over our modern vision of life in my calmest moments, and I found that all our deliberations and conceptions of life, lack in one central idea, one basic principle.. To me that idea, that principle is but an eternal faith. We are not apt to have a glimpse of.

> "That Light whose smile kindles the Universe
> That Beauty in which all things work and move"

which to Shelly was a rapier of fire, a girdle of faith and trust round all heaven and earth.

Our guiding forces of today are Science, Literature, Politics and War. Each contributes its own idea, each imparts its own inspiration, each entertains its own definition. The result is that, as Alfred Noyes puts it—

philosophers to teach, to examine and to think over the problem of Man. Nature is the Prime Teacher: the best Guide and Guardian.

Man has at last solved the problem of Progress and Himself and the Progress no more remains a curse: it is a blessing serving the needs of what is best and noble in Man and God.

SYED NURUL HASSAN JAFFARI,
B. Sc. (Osmania) H. C. S.

---

fields rich and vast, has not ceased. The life goes on with a stronger pulse. A hunt for natural wealth is the delight of man. The old life of towns and cities has ended, A nomadic life has begun. The mountains in good old days the sole custodians of desolated, unmolested realms fall from their majesty of the unapproachable. They are crossed and recrossed by the joyous hordes of hilarious youths. The deserts are no more barren. The white tents and camps of samite and silk, speak of a caravan that will be on the move again, following joy and pleasure, knowledge and light like a sinking star, going beyond the utmost bounds of human thought. The call of the forest, up to the last century unheard and unheeded, has a new power in it. There the people crowd to hear the Elemental Spirit speak, through woods and copse, through brooks and streamlets. In summer the fields are hunted and high mountains scaled. And when the summer is gone they turn to the fields for the harvest and the plough, "far from the madding crowds ignoble strife," they flee away their time carelessly as they did in the golden world.

Disease and ill-health, with them the hospitals with all their nurses and doctors have disappeared for good. A worldwide sanitation has purified the earth. The race conflict and the conflict of class and class are a things of the past. All unions and Soviets, all parties and associations have vanished. Science is no more used for the subduing of men by men, and for the levelling of cities majestic and grand. There is no hoarding of wealth, no exploitation of labour, no unemployment, no police, no law. The beauties of nature and the wealths of the earth are shared and divided equally among all. There are no teachers, no professors, no

But lo! the darkness fades, the shades of night flee, the glimmers of a new day dazzle the eyes, and we see an ideal world rising against the ruins of an earth still fuming in the smoke and fire of the past ages.

There are of course a few mercenary soldiers, but Dictators and Emperors, Goerings and Goebelles there are none. The loud hectorings of Feuhrers and Duces heard no more. The triple choice 'be a gangster, trickster or yield' is no more a reality. There is a new world state of righteousness and of love of uninterrupted joy and of unrivalled hope. The enormous waste and mutual annoyance of nation and nation, the slaughter and conquest of race and race no more defile the sacred vision, splendid in its own way which the man of the dark scientific ages perceived dying away and fading into the light of common day. There is the setting free of a wild human capacity which enters into the dark unfathomed caves of oceans, searching the gems that lay hidden in the muddied depth, the flowers that blushed unseen, the blossoms that wasted their sweetness on the desert air, in days of yore, bloom with a beauty, that sets the heart of men dance giving him a sense of rapturous pleasure ecstacy and joy. And these are the soothing balms which have not a slight or trivial influence on the best portions of a good man's life: His little nameless unremembered acts of kindness and of love.

Man is now no more a slave of machines. He has ceased to be stunted in hovels dark and dreary, in the Lives' underground, the earth trembling overhead with the blast of mines in the neighbouring fields. But the absence of these, the most precise ways of mass-murder, has not sapped at all the energies that glow in each adventurous soul. The progress of man, the traversing of

THE IDEAL WORLD

"Peace! Peace!! Peace!!!" has been the call of succeeding ages, since the dawn of the civilization, to a world lost in chaos and decay. But the ignorant armies of Men clashed always by night sending wrenching convulsions into the very heart of the planet. chosen by the Great Architect for the seat of one who to Him was and is next to none. The great beauties of nature—The image of the Eternal—the mighty sounds of the sea, the cold solitary sublime grandeur of the mountain peaks, the green fields and meadows with bubbling brooks, their water trembling like silver sheets, the blithe spirited linnet, floating over the evening air, the nightingale pouring out the best charms of her melodies, the sky lark ethereal spirit and divine sending its messages, songs and notes in vain to the abode of Man, to be drowned, drowned in the thunder of canons and guns. The fighting legions thunder-strike the walls, bidding nations quake in their rock-built cities; the monarchs tremble in their capitals at the thought of the Oak Leviathans, the dread vassals of their clay creators, and humanity sinks into the deep depths of ocean, like a drop of rain with desperate groans, without a grave unknelled, uncoffined and unknown.

The Ghosts of Men, in stature dark and awful walk over the world, the canons roar, the Dictators rave, Premiers speak, Presidents encourage the men fighting over the frontiers of freedom, the earth trembles to see the blood of men poured like venom into her veins against her will; the wise look before and after and pine for what is not!

And all these adventures are quite impossible without a lot of time at your disposal—time which you can fleet carelessly' and mischievously, as 'they did in the golden world'. In other words you must have freedom—freedom from the necessity of attending lectures, taking down notes, writing tutorial essays, and committing to memory stuff which you know to be entirely superfluous.

As for myself, I am happy that the inexorable trial has passed; and I am enjoying the quiet consolation of a summer afternoon*. To those who are not content with this 'annual' approach of the period of freedom, I can only recommend what a twentieth-century Wordsworth would have written :—

"Great God! I'd rather be
A truant running from my lecture-room
So might I, standing on the Abid Road,
Have glimpses that would make me less forlorn
Have sight of beauties peeping from their cars,
Or hear old K.C. Dey's enraptured song."

M. NAIMUDDIN SIDDIQI, M. A.
(Osmania.)

*This essay was 'scribbled' last year after the termination of the exam

question is, how to fall in love? Let me tell you that it is very easy to do so, if only you have a smart face, a voluble tongue, and an excellent ear. You must know all the haunts of the celebrated beauties. When they are out a-walking, you must give them a lift; when they are a-sporting, you must join them; when they are frowning you must smile; and when they are smiling you must laugh. But I am sure many of you know all these details better than such a theoretical observer as I am.

If you are fond of travelling during the vacations, remember that you must always be in the 'uniform'. You must never fail to complain that the Indian railway carriages are the most uncomfortable ones in the world; that it was for the first time that you were travelling in a third-class compartment; and that last summer you had been to Simla for a holiday. You must always have on such occasions some bulky English-novel or some English newspaper with you (a dictionary also may serve your purpose, provided your fellow-travellers are ignorant enough). You must talk on no subject less important than civilians, socialism, film stars and Shakespeare.

If you are a letter-writer, your achievements will be no less dramatic. You can write letters to great men, dating them from such fanciful places as 'The Garden of Eden', 'The Emerald Bowers', etc., although you may really live in a garret. You can write anonymous letters to Miss so-and-so, admiring her irresistible charm and professing your ungovernable passion for her. You can puzzle your friend by attributing to him a letter which has been really written by yourself, and in which some terrifying revelations are made about his private life.

FREEDOM

Do you know what it is to be free? To be free means to do and think according to your will, to go to the theatre when you like, to fall in love whenever you are in a humour for it, to write a letter to your favourite film actress and receive her photo with an autograph whenever you have a desire to do so. In a word, it is a relief from the obsession of responsibility—a relief from the nightmare of examinations. Have you not felt a thrill of joy, a sense of infinite satisfaction, when you have just finished your examination? And to pass triumphantly through this ordeal—why, it is an enviable achievement even for the greatest climber of the Himalayas.

Like everything else in this world, our freedom has its seasons. It usually begins with April, and terminates with the last weeks of June. Freedom out of season is almost inconceivable. A 'french leave' is not a legitimate achievement of freedom. It is a rebellion against the conventional code of academic morality.

But how to utilize this freedom? If you are a lover of books, I have nothing to tell you; for your period of captivity and period of freedom are quite indistinguishable. But if you are a lover of sports, of travel, of love-making, of letter-writing and of gossip-mongering, then your period of freedom will be a record of adventures.

All of us are not capable of becoming great sportsmen or letter-writers or gossip-mongers. But all of us are capable of becoming great lovers. Now the important

doors. Without communal hormony and a strong sense of give and take, India will not advance on the path of progress, and the incessant attempts to obtain Dominion Status or complete independence, will end in utter defeat and failure. Destructive policy of force, terrorism and looting should be given up once for all. Panic and confusion are injurious to the Peoples of India.

Our Thanks:—

In the end, we express our thankfulness to Professor Krishnan who, despite his literary engagements, has done what was in his power. We are also indebted to Mr. Muzharulla whose long experience in the Registrar's office is of much value. The co-operation of Dr. Zoar and Professor Wahidur Rahman has been of utmost importance throughout the year.

Before concluding our thoughts, we wish to thank our Pro-Vice-Chancellor whose guidance and sincere helpfulness gave us every opportunity to overcome unforeseen difficulties, and, it is only due to his personal interest that we could get over them.

SYED ALI MOHAMED MOOSAVI
Managing Editor and Editor English Section.

Law Graduates:—

We desire to call the attention of our authorities towards the invidious status of our law graduates who are not authorised to practise in the Provinces of British India. Much might be said in support of this statement which has become a matter of perpetual humiliation for the university. Therefore, we request our authorities to remove this hardship from the law graduates of the Osmania, who have proved themselves worthy, fit, and suitable for any place.

An appeal:—

It is our most sincere advice to the young builders of the nation to keep aloof from the political atmosphere of Hyderabad. Completion of education should be their paramount consideration. It is a heinous offence to take part in political agitation, We expect a courageous response from the young intelligentsia. To err is human, but repentence is heavenly, indeed.

Political Situation:—

The present political chaos is the direct result of the most brutal and menacing powers that ever appeared since the Reformation. It is un-doubtedly heartening to witness the Russian resistance, unique in war history. The Germans may occupy teritories and achieve fleeting territorial conquest but the Russian morale will be ever invincible giving indomitable spirit to the subdued nations which are being trampled by the Totalitarian States.

India with all her immense resources should Participate in the world war. Religion knows no frontier. Tolerance and complete unity among the Indians is most urgently needed while the enemy has come to our very

training were rejected in the interview for giving temporary commission. It is obvious that the U. T. C. training is no more than a fashionable affectation and an ornamental luxury. The Military College, on the other hand, would be for more efficient and useful, and so we suggest that the U. T. C. should be amalgamated with the Military College and further, that the students of the Osmania Military College alone will be selected in the future for Military Commissions. We throw out a suggestion, and we are sanguine of its acceptance.

Hyderabad Civil Service:—

This year two out of the four candidates successful are Osmanians. Mr. Rasheed Abbas who stood first and Mr. Munzoor Mustafa. We offer them our congratulations,

The late Dr. Mackenzie did his best to absorb university students in every department of the State, and, to some extent succeeded in his attempts. Here it is essential to suggest that preference should be given to the Osmanians so that the prestige and honour of the Osmania University may be established. It is very astonishing to find the tendency of some officers who deny privileges to the Osmanians,but in the same breath profess themselves as ardent lovers of the university. We request Nawab Mehdi Yar Jung Bahadur, our beloved and respected Vice-Chancellor, to take this case in hand. As a man of high distinction and himself an Honorary Degree holder of our university he has done yeoman service; but the more we get, the more we demand from him.

of the Board for three years, an honour as much for the University as for him. We trust he will try his best to make every University in India follow the example of the Osmania University by the adoption of Urdu as the medium of instruction.

Medical College:—

We regret to see some doctors taking M.B.B.S. degree from our University, and not adding "Osman" after their degree. Whatever the reason for this may be we suggest to our brethren that this amounts to an insult to their Alma Mater.

University Dispensary:—

Dr. Syed Qasim Ali who passed his M. B. B. S. from the Osmania Medical College with distinction is discharging his duties as Labour Camp Doctor with promptness, dependability and responsibility. His services in the Dispensary and on foot-ball ground are valuable. To get his full cooperation, this young sportsman - doctor may be brought over to the University dispensary.

Military College:—

The trend of contemporary international development has manifested beyond the possibility of a doubt the vital necessity of adequate military training for the rising generation to safe-guard against the out rages of any foreign aggression. We take this opportunity of suggesting that it is high time that the Osmania University should have a military college of its own. An objection may be raised that the present U. T. C. will suffice for this purpose. But we feel convinced about the utter insufficiency of the U. T. C. The other day, some members who had already undergone the U.T.C.

of girl students who in the Hitlerite State would have had to devote themselves to domestic affairs.

Mr. Naeemuddin Siddiqi has by obtaining first class in M.A., brought to the student community fame and reputation. His articles are short but sweet, providing an appeal to various tastes. Articles The Ideal World, Nabobs and the Deccan, Auguste Comte, Iran, Tagore, Saljuks and Social Evils in India, are truly commendable and worth reading. The essay of Mr. Baqi who deserves the vacant post in the department of Urdu, and whose contributions to other standard journals of India are well-known, is of great consequence. Messrs. B. N. Chobe M. B. Omar, and Mahmood Hussain have dealt with literary and civic aspects of life. The contribution of of the Zenana College is commendable, indeed. We advise our sisters, in all humility, to keep up this contribution in the coming years which would add to the Magazine's dignity and value.

We regret that a few articles could not be published in this issue on account of the limitation of space.

Hyderi Number:—

The personality of the late Sir Akbar Hyderi was one of international reputation, and it is hardly necessary here to dilate upon his immense fame. He took the deepest interest in the University and was largely responsible for its foundation. To keep his memory fresh we have decided to publish a Special Number. Request is made to every student to send his article in good time.

Inter University Board:

Professor Haroon Khan Shewani, who is well-known among students all over India, has been elected Secretary

This year some drastic changes are introduced in its constitution. We expect much from Professor Ziauddin Ansari whose responsibilities are great as Senior Proctor.

The Proctorial Board consists of:—

Professor Ziauddin Ansari	Senior Proctor
Mr. Syed Abdul Majeed Siddiqi	Proctor
,, Mir Asad Ali	Pro-Proctor
,, Mehandar Raj Sakseena	....
,, Syed Ali Mohamed Moosavi	President Board of the Proctorial Monitors
,, Kulkarni	Vice-President
,, Khaja Gulam Mohamed	Secretary

The present condition of the Board is somewhat uncertain, but the sincere efforts of Professor Ansari will make it, we are confident, authöritative and strong.

Our only regret is that the monitors are directed to control the students without correspondingly adequate rights. The Proctorial system of the sister University, Aligarh places in the hands of the monitors some fundamental rights, and our monitors are like kings with out a crown. If this defect is not rectified, the Board would be more or less ornamental.

Articles:—

This year we publish all the articles of our brethren, Obstacles and hindrances were met with in securing them. yet we are thankful to our contributors for prompt response which they gave to our appeals made in the daily newspapers from time after time.

The present Editor is more fortunate than his predecessors to declare with pride the valuable contribution

traditions of Hyderabad. It has degenerated into a rendezvous of students, who wander about in streets without caps, participating in political meetings, deceiving innocent minds by their false professions and thus involving the University in a state of confusion and panic. We request our Pro-Vice Chancellor to put a stop to such destructive tendency. It is inimical and hostile to stutents' life.

What we urge upon our young friends is not to part with the religio-politico-ethical system which presents a vivid picture of the vistas of Eastern civilization. The spirit of youth is the spirit of efficiency, labour and industry. Will you not carry the torch of learning? Will you not look forward to a happy and glorious period? This is our dream, and it will be materialized ere long.

Obituary:—

We record with deep regret the untimely death of Professor Jamilur Rahman, a profound scholar and an authority on Islamic History. The Department of History has lost a learned savant, students a great professor and his children a loving father.

We also lament the premature deaths of Mr. Abdus Samad Ph. D. (2nd year), Mr. Aga Mohamad Hussain B.A. and Mr. Raza Ali B.Sc., all of them being inheritors of unfulfilled renown. It is a consolation for us to realise that they are "Far from the madding crowd's ignoble strife."

Board of the Proctorial Monitors:—

The University Proctorial system has been working with little appreciable effect for the last three years.

Magazine was brought into existence. This aim is, we trust, being achieved. Moreover, it stands for the support of the students, and advocates their considered views.

The students are definitely un-aware of the difficulties cropping up in the way of the Editor. We are, as usual, late. But, to make amends, we have put forth an out standing success, unique in itself. The delay in the publication of this issue is, partly due as well-known to all, to the scarcity of paper, and partly due to some unforeseen difficulties. As the Managing Editor, we have made unstinted efforts to overcome the situation. Thank God, we have succeeded in our sincere attempts.

At this juncture we are not in a position to predict the future of this Magazine as the editors will not be under the popular control of the Students' Union. I would suggest that the ultimate control of the Magazine should rest with the Students' Union.

Now we must be excused if we venture to draw the attention of readers to certain problems which appear often before students. They are too well known to need mention here. There complaints are legion. But, we may be allowed to say this much that juvenile minds are not to be treated like dumb driven cattle.

Hostels:—

Let us state unequivocally our hostels have become centres of educated Falstaffs. In one of the hostels famous for happy atmosphere and nationlistic sentiments, life does not keep pace with the enviable

THE EDITOR ADVOCATES

Unique Messages of our August Ruler:—

WE get the honour and privilege to print in every issue the sublime messages of Our Soverign Master, His Exalted Highness the Nizam of Hyderabad and Berar. The boast of heraldry, the pride of Jamshid and the greatness of Akbar—all these merits are vested in the historic and sacred personality of our Magnanimous Ruler. His Exalted Highness was pleased to declare in his auspicious and memorable Silver Jubilee, "the University is dear to me." The words of Jalalat-ul-Malik will ever shine in this epoch making age like the Pole Star, guiding the students in the storm of passions, and helping them to achieve the highest that life can offer.

Title Page:-

It is a matter of extreme gratification to us to offer our brethern the 15th issue of the Osmania Magazine which comprises volumes 1 & 2. We venture to suggest that this issue has surpassed its predecessors not only in its contents, but in the choice of an inspiring, fascinating and attractive Title Page which is purely the out-come of our personal instructions, and which, we believe, symbolises an academic institution of this Islamic State.

The Osmania Magazine as enumerated at the auspicious moment of its commencement, "professes to be an organ of the students. We hope that it will create and diffuse among them a literary taste. They will contribute to it and thus have the chance of devoloping their literary capacity." This was the policy with which the

*

CONTENTS

Annual Subscription.

		Rs.
1.	Present Students, Osmania University	4
2.	Old boys, Members of the Teaching Staff	5
3.	General Subscribers	6
4.	Single Copy	2

Note—Registration and V. P. Charges Extra.

Can be had of:

OSMANIA MAGAZINE OFFICE

OSMANIA UNIVERSITY

HYDERABAD-DECCAN.

The Osmania Magazine

Vol. XV. Nos. 1 & 2.

THE OSMANIA MAGAZINE

BEING

THE JOURNAL OF THE STUDENTS

OF

The Osmania University

HYDERABAD-DECCAN

MANAGING EDITOR, & EDITOR, ENGLISH SECTION:

SYED ALI MOHAMED MOOSAVI, M. A. (Final)

ASST. EDITOR:

MIR HAMID ALI, B.Sc., (Osman).

Vol. XV. 1942 Nos. 1 & 2.

PRINTED AT

THE AZAM STEAM PRESS

GOVERNMENT EDUCATIONAL PRINTERS

HYDERABAD-Dn.